

موسیٰ کو دیکھ کر وہ موقع کی نزاکت بھانپ لیں اور ہمارے پیچھے سے پہلے گاڑی چھوڑ دیں۔

ہم اسٹریٹ لائسنس اور بڑے بڑے روشن اشتہاروں کے تیز انکاس سے گزر کر قدرے تاریکی میں داخل ہوئے تو موسیٰ بولے بغیر نہ رہ سکا ”تمہاری گاڑی کتنی دور کھڑی ہوئی ہے؟“
 ”بس،“ وہ نظر آ رہی! ”میں نے تیزی کے ساتھ دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ اس وقت تک میں نے دیکھ لیا تھا کہ دیرا سلطان شاہ نے گاڑی نہیں چھوڑی تھی۔

وہ خاصی نازک پوزیشن تھی۔ سلطان شاہ اور ویرا کے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ میں نے اپنے حریف کو کس طرح شیشے میں اتارا ہو گا۔ اسی وجہ سے وہ اطمینان سے اپنی جگہوں پر برائمان تھے۔

میں نے دھیرے سے موسیٰ کو ٹوکا ”ہر بات کا یقین کر لینے کے باوجود تمہارا داہنا ہاتھ جیب میں موجود کسی ہتھیار پر بتا ہوا ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”اپنی ضرورت کو میں زیادہ بستر سمجھتا ہوں۔ تم گاڑی چلاؤ گے تو میں ہاتھ نکال لوں گا۔“

اس کے جواب کے ایک ایک لفظ سے خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ آخری لمحات تک محتاط رہنے کا پختہ عزم کر چکا تھا اور یہ فرض کر چکا تھا کہ گاڑی میں میرے اور اس کے سوا کوئی تیسرا فرد نہیں ہو گا۔

میں نے انگوٹھے کی مدد سے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی میں موجود ربر کیپول والے انگلی کے رخ تبدیل کی طرف سمجھانا شروع کر دیا۔ اس کی ہنگامی ضرورت کسی بھی لمبے پیش آنکشی تھی۔
 ”تم کہاں لیے جارہے ہو مجھے؟ تمہاری گاڑی کہاں ہے...؟“ مزید کچھ آگے بڑھ جانے کے بعد موسیٰ نے ہنر کے ہوئے اور اشتباہ آمیز لمبے میں سوال کیا۔

اس وقت تک ہم خاصی تاریکی میں آ چکے تھے اور گاڑی اتنے قریب تھی کہ میں ویرا کے چہرے پر گہری دلچسپی کی علامات بخوبی دیکھ رہا تھا۔

”بب... بس.... یہی گاڑی ہے میری۔“ موسیٰ کی جھپٹی ہوئی مستنفرانہ نظروں کے جواب میں مجھے کساتا ہوا۔

بلکی کی سی سرعت سے موسیٰ کا داہنا ہاتھ جیب سے برآمد ہوا اور پھر فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے میب ریلوایو کی ایک جھلک دیکھی اور اگلے ہی لمحے فضا ایک ہولناک بارودی دھماکے سے لرز اٹھی۔

”میں مار دوں گا تم سب کو۔“ موسیٰ کے حلق سے ایک وحشیانہ غراہٹ آزاو ہوئی پھر اس کا فضا میں اٹھا ہوا داہنا بازو بدن سے دور فضا میں نیچے آنے لگا۔

میری رگوں میں لمبو منجد سا ہونے لگا۔ اس نے گاڑی میں دو

خاموشی کے بعد بولا ”مجھے اپنے بڑے کی طرف سے کوئی حکم نہیں ملا۔ میں تمہارے کہنے سے اپنا پروگرام نہیں بدلوں گا۔“
 ”تم نے مجھے پہچان لیا ہو گا“ میں نے پُر امید لمبے میں کہا ”مجھے دو بجے تک دبیرا پہنچ کر تم سے ملنا تھا۔“

رفتہ رفتہ اس کا اعتماد بحال ہو چلا تھا۔ اس نے نخوت بھری آواز میں کہا ”میں خواب میں دیکھے ہوئے چہرے بھی برسوں نہیں بھولتا۔ تم زندہ انسان ہو۔ تمہارا نام کرٹل جمال دستی ہے۔“

میرے دوڑ کر اس تک پہنچنے کی وجہ سے قرب و جوار میں موجود کوئی افراد اور راہ گیروں کی توجہ ہماری طرف مبذول ہوئی تھی مگر ہمارے درمیان کوئی تصادم ہونے کے بجائے، پرسکون مذاکرات کے آغاز پر سب نے ہمیں نظر انداز کر دیا تھا۔ اس وقت کوئی بھی خاص طور سے ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔

”گھٹ!“ میں نے اس کی یادداشت کی تعریف کی اور اسے مرعوب کرنے کے لیے اس کے بڑے کا نام لیتے ہوئے کہا ”میرے پاس نے رستم دادا سے بات کر کے چند منٹ پہلے مجھے پروگرام کی تبدیلی سے آگاہ کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ رستم کا فون آنے تک تم اپنا ہوٹل چھوڑ چکے ہو۔ چاہو تو میں اپنے موبائل فون پر رستم سے تمہاری بات کر سکتا ہوں۔ صرف جگہ کی تبدیلی پر تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے کہ دبیرا پہنچ کر بھی تمہیں مجھ سے ملنا تھا۔ اس وقت میں خود تمہارے روبرو موجود ہوں۔“

”کیا تم باہر رک کر میرے ہوٹل کی نگرانی کر رہے تھے؟“ اس نے پچھتے ہوئے لمبے میں پوچھا۔

”وقت پر آگیا ہوتا تو ہوٹل ہی میں تم سے مل لیتا۔ بس ابھی ابھی پہنچا ہوں۔ گاڑی سے اترتے ہی تم پر نگاہ پڑی تو میں نے پوچھا کہ روڑو لگاؤ۔“

میرے برجستہ جواب نے اسے مطمئن کر دیا ”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“

”اُدھر۔“ میں نے ہاتھ سے موہم سا اشارہ کیا۔ گاڑی کی نشان دہی میں خطہ تھا کہ وہ ویرا اور سلطان شاہ کی موجودگی کا اندازہ لگاتے ہی بھڑک جاتا۔ کیونکہ اسے صرف مجھ سے ملنا تھا۔ میرے ساتھ کسی کی موجودگی بنیادی پروگرام سے میل نہیں کھاتی تھی۔

”تمہارے پاس کا کیا نام ہے؟“ اس نے میری بتائی ہوئی سمت میں قدم بڑھاتے بڑھاتے اچانک رک کر سوال کیا۔

”پاس صرف پاس ہوتا ہے۔“ میں نے بائیں آنکھ دبا کر کہا ”تم نے اپنے بڑے کا نام نہیں لیا تھا میں اپنے پاس کا نام لینے سے قاصر ہوں۔“

وہ ایک جھٹکے سے میرے ساتھ چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ خاصی تاریکی میں کھڑی ہوئی گاڑی میں سے وہ دونوں ہمارا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ میں دلی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ میرے ساتھ

ملٹری پولیس کسی بھی لمحے وہاں پہنچ کر ہمیں گھیر سکتی تھی۔
میں وقت ضائع کیے بغیر پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہوا
اور اسٹیشن میں موجود چالانی کی مدد سے انجن اسٹارٹ کر دیا۔
”فوراً نکل چلو۔“ عقبی دروازہ بند ہونے کی ہر شور آواز کے
درمیان ویرانے تیزی سے کما اور میں نے اسی لمحے گاڑی آگے
بڑھا دی۔ بجلی میں شاید وہ دونوں ہی موسیٰ سمیت پچھلی سیٹ اور
اس کے پائیدان میں سنا گئے تھے۔ میں نے ویرانہ کی ہدایت کے بعد
گاڑی میں سلطان شاہ کی موجودگی کی تصدیق کرنے کی ضرورت
محسوس نہیں کی تھی۔ ویرانہ اس کے بغیر وہاں سے روانہ کی گئی
نہیں کر سکتی تھی۔

ہماری گاڑی تقریباً نصف دائرے میں گھوم کر سڑک پر نکلی
تھی کہ فضا میں کہیں پولیس سائرن کا شور گونجنے لگا۔ خواہش اور
اضطراری کیفیت کے باوجود میں نے گاڑی کی رفتار بڑھانے کی
حفاظت نہیں کی۔ ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ سامنے سے نیول
پولیس کی ایک تیز رفتار جیپ نمودار ہوئی۔ سائرن بند تھا مگر اس کی
چست پر سرخ روشنی تیزی سے گردش کر رہی تھی۔
”گاڑی کی رفتار بڑھا کر جلد از جلد اس علاقے سے نکلنے کی
کوشش کرو۔“ جیپ کے گزر جانے کے بعد پیچھے سے سلطان شاہ کی
سرسراہی ہوئی آواز ابھری۔

”نہیں!“ ویرانے سختی سے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ ”اسی
نارمل رفتار سے چلتے رہو۔ دیکھو! سامنے سے ایک اور گاڑی
ایمرجنسی لائٹس جلاتی ہوئی آ رہی ہے۔“
مجھے بولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں صرف یہ سوچ رہا
تھا کہ ہم نے جس کام کو بہت آسان سمجھ کر اسٹیشن فورس سفر کا
آغاز کیا تھا، وہ آخری مراحل پر یکایک بہت کٹھن ہو گیا تھا۔ ٹھہرے
چوک یہ ہوئی تھی کہ میں نے موسیٰ کی پھرتی کا اندازہ لگانے میں مار
کھائی تھی اور اسے میرے وار سے پہلے ایک ہوائی فائر کر کے
معاملات بگاڑنے کا موقع مل گیا تھا۔

کاشف سینئر اور مہران ہوٹل کے درمیان سے شارپ فیصل پر
مڑنے تک ہمیں مزید دو سرکاری گاڑیاں نظر آئیں جو تیزی سے
کینٹ اسٹیشن کی طرف جارہی تھیں۔ شارپ فیصل پر ٹریفک کے
دھارے میں شامل ہونے کے بعد میں نے اطمینان کا پلاگمرا
سائس لیا۔ اس سڑک پر نکل آنے کے بعد ہم خطرے کی حدود سے
خاصی دور نکل آئے تھے۔

ایک لمبے تعطل کے بعد ہم تینوں ایک ساتھ کسی کارروائی میں
شریک ہوئے تھے اس لیے موسیٰ کے اغوا کے اس واقعے میں
خاصی سنسنی محسوس ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک تینوں ہی خاموشی سے
اپنے اپنے خیالات میں کھوئے رہے پھر ویرانے جود ٹوڑنے میں
پہل کی۔

”اگر ہم دونوں گاڑی سے اتر کر الگ کھڑے ہو گئے ہوتے تو

اجنبی چروں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ میں اس کو کوئی فریب دے رہا
تھا۔ اس نے پہلا ہوائی فائر شاید اضطراری حالت میں کیا تھا اور
اگلا فائر نشانہ لے کر ان میں سے کسی پر کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔
واقعات میں یکایک بہت تیزی آئی۔ سلطان شاہ غوطہ مار کر
عقبی پائیدان میں دبک گیا۔ ویرانہ دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر کود
گئی۔ ہم لوگ اندھیرے میں تھے اس لیے کسی کو اصل واقعے کا علم
نہیں ہو سکا تھا مگر دھماکے کی وجہ سے پیدا ہونے والے ہراس اور
بھگدڑ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔
موسیٰ کے تپتے ہوئے بازو کے سرے پر موجود ریوالتور کی نال
آسان سے گاڑی کی سمت آ رہی تھی کہ میں نے اچھل کر موسیٰ پر
حملہ کر دیا۔

تنگینے کی صورت کا در کیپول میری ہتھیلی کے رخ پر موجود
تھا۔ میرے دایبہ ہاتھ کا بھرپور ٹھنڈا شور آواز کے ساتھ موسیٰ کی
گردن پر پڑا۔ ٹھنڈے دباؤ سے کیپول میں موجود سرلیج الاثر
مخلول باریک سوئی کے ذریعے موسیٰ کی گردن میں منتقل ہوا اور اس
کا دایبہ ہاتھ اچانک ہی بے جان ہو کر اس کے پیلو میں جھول گیا۔
وہ لمحہ بھر کے لیے کسی بے جان مجسمے کی طرح اسی غیر فطری سی
حالت میں اپنے قدموں پر کھڑا رہا پھر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح
گونج وادھماکے سے زمین پر گر گیا۔

ان چند ثانیوں میں میری پوری توجہ موسیٰ پر مرکوز رہی تھی
اس لیے مجھے یہ علم نہیں ہو سکا کہ سلطان شاہ کب گاڑی سے نکل
کر دیوانہ وار ہماری طرف لپکا تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ موسیٰ کے
زمین پر گرتے ہی اس نے میرے بے ہوش شکار کی دونوں ٹانگیں
پکڑ کر اسے کسی مردہ چوپائے کی طرح گاڑی کی طرف گھسیٹنا شروع
کر دیا۔ اگلے ہی لمحے میں ویرانہ ابھی اس کا ہاتھ بنانے پہنچ گئی۔

میں نے زمین پر سے موسیٰ کا ریوالتور اٹھایا تو اس کی نال
قدرے گرم تھی۔ ریوالتور جیب میں ڈال کر میں آگے بڑھا تو وہ
دونوں موسیٰ کے بے حس و حرکت وجود کو پچھلے دروازے سے
پائیدان میں ڈال رہے تھے۔

وہ دونوں اپنا کام سمارت اور خوبی سے سرانجام دے رہے
تھے۔ انہیں میری کسی مدد کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت
زیادہ ضروری اور اہم ترین بات یہ تھی کہ جائے واردات سے
فوری طور پر فرار کی راہ اختیار کی جائے ورنہ دوسرے مسائل اس
کا سیلاب کو خاک میں ملا سکتے تھے۔

وہ شکر کے قلب سے بہت نزدیک ایک حساس علاقہ تھا۔ رات
زیادہ ڈھل جانے کی وجہ سے اسٹیشن جانے اور وہاں سے آنے
والے راستوں پر ٹریفک اور مسافروں کی غیر معمولی بھیڑ بھاڑ دم توڑ
چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شور کی کمی کی وجہ سے فائر کا شور دور تک
سنا گیا ہو گا۔ پولیس کو اس طرف متوجہ ہونے میں دیر لگتی تو قرب
وجواریں واقع فوجی دفاتر یا مسکری اپارٹمنٹس کے آس پاس مامور

فاز اور بد مزگی کی نوبت نہ آتی۔“

”تمہیں بروقت یہ خیال اگیا ہوتا تو کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلتا کہ وہاں کیا ہوا ہے۔ تم دونوں کو دیکھتے ہی اسے خطرے کا احساس ہوا تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ اس بھیا تک تجربے سے گزرنے کے بعد کا خیال ہے۔“
دیرانے اگلے دل سے اعتراف کیا ”اس وقت میرے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم نے اسے کیسے رام کیا ہوگا۔“

”وہ مجھے بچاتا تھا۔ یہ بات میرے لیے سوندھ بھی ہو سکتی تھی اور خطرناک بھی۔ میں اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ کسی مجبوری کی وجہ سے مجوزہ ملاقات کا مقام تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس عذر میں تم دونوں کی موجودگی کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوا تھا۔“
”یہ حکمت عملی پہلے سے طے ہو جانی چاہیے تھی۔“ سلطان شاہ نے زبان کھلی ”بیشتہ یہی ہوتا ہے کہ ہم اندھا دھند کوئی قدم اٹھالیتے ہیں اور پھر عین وقت پر فیصلے ہوتے ہیں۔“

”اس میں میری غلطی تھی۔“ دیرانے جھٹ ڈے داری قبول کر لی ”میرا خیال تھا کہ میں آسانی سے ان دونوں کو ان کے ہوٹل سے نکال لاؤں گی۔“

”ہم دونوں کو اٹھانے کے چکر میں تھے مگر اب ایک پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔“ سلطان شاہ کی آواز ابھری ”چتا نہیں یہ ان دونوں میں سے کون ہے۔“

اس نے براہ راست سوال کرنے کے بجائے خوب صورت انداز اختیار کیا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا ”فکر مت کرو۔ میں پہچان کر صحیح آدمی کو لایا ہوں۔ یہ موٹھوں والا موٹی ہے۔“
”ٹانگ پھر بھی رہ گیا۔“ اس نے ہلکے سے تاتف کے ساتھ تبصرہ کیا۔

”ایک بھی کافی ہونا چاہیے۔“ دیرانے فوراً بول پڑی ”یہ دونوں ایک تھیلی کے پٹے بنے ہیں۔“ بلکہ موٹی زیادہ اہم ہے کیونکہ رستم نے اسے اپنے گھر بلایا تھا۔“

”مجھے اس لڑائی کا رخ اب مگر بخشی سے رستم کی طرف ہوتا نظر آ رہا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ بھول کر بھی نہ سوچتا۔“ میں نے اس کی جھجکی ”ہم رستم کے ذریعے اور اس کا پتہ صاف کرنا چاہ رہے ہیں۔ جب تک یہ کام نہیں ہو جاتا ہم اس سے کوئی خاصیت مول نہیں لیں گے۔“

”خاصیت کی بنیاد تو پڑی گئی ہے۔“ دیرانے بولی ”رستم اس آدمی ہے۔ وہ مقررہ وقت تک بے سارا نہ پہنچا تو وہ غصے کے عالم میں چھان بین کی ابتدا کرے گا اور صبح نمودار ہونے سے پہلے اسے یہ علم ہو جائے گا کہ موٹی کو ہوٹل سے نکلنے کے بعد اٹھایا جا چکا ہے۔“

”یہ قبل از وقت قیاس آرائی ہے۔ وہاں ایک گولی ضرور چلی تھی مگر اندھیرے کی وجہ سے لوگوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہو سکا ہوگا کہ فاز کے بعد کسی کو بے ہوش کر کے اغوا کیا گیا ہے۔“

اپنی سوچ بچار کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے کہا۔ کسی طرح اسے اغوا کا علم ہو بھی جائے تو یہ کسی طرح پتا نہیں چل سکے گا کہ اغوا کرنے والے کون لوگ تھے۔“

”تمہارا آخری نکتہ بہت دور رس ہے۔“ دیرانے کی پر جوش آواز ابھری ”یہ کام ہم لوگوں نے بہت خاموشی سے سرانجام دیا ہے اور فوجی وغیرہ فوجی پارٹیاں معمول کے مطابق جائے واردات پر پہنچ کر پوری سرگرمی سے فاز کے واقعات کی تفتیش کر رہی ہوں گی اس لیے کوئی بھول کر بھی یہ نہیں سوچ سکے گا کہ اس واقعے میں اسٹیج ٹانک فورس والوں کا ہاتھ ہے۔“

”ماروں ٹھٹھا چھوئے آٹکھ.... تمہاری ان دونوں باتوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔“ سلطان شاہ کو دیرانے کی بات پر اعتراض کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

”ذہن پر ذرا سا زور دو تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے گھٹنے سے نہیں، کتے سے آٹکھ چھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات ہمارے موجودہ حریف جانتے ہیں کہ ایس بی ایف والوں کو اپنی کسی کارروائی کے لیے چوروں کی طرح قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ سادہ کپڑوں میں آتے ہیں اور اپنا کام کر گزرتے ہیں۔ پولیس یا کوئی ایجنسی ان کی راہ نہیں روکتی۔ وہ موٹی کو اس کے ہوٹل بلکہ کمرے سے لے جاسکتے تھے۔“

”شاید تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تم نے اول خان کو موٹی کے اغوا سے الگ تھلک رکھ کر کسی عقل مند کی کار تکاب کیا ہے۔“
پکڑے جانے کا خوف دور ہونے کے ساتھ سلطان شاہ کالب دلچسپہ بدلنے لگا تھا۔

”دیرانے سوچنے میں حق بجانب ہے۔“ تنکرا روکنے کے لیے میں نے زبان کھولی۔

اسٹیشن فور تک کا سفر ایسی ہی ہلکی پھلکی نوک جھونک اور نکتہ آخری میں گزر گیا۔

اول خان اپنے کپ کی پہلی چیک پوسٹ پر ہماری واپسی کا خطرہ تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا طاقت ور نارنج کی روشنی میں بے ہوش شکار کا جائزہ لیا اور پھر اسے گاڑی سمیت اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے ہمیں اپنی جیب میں لے کر کمرلوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

”تم نے قیدی کے بارے میں اپنے آدمیوں کو کوئی ہدایت نہیں دی۔“ مختصر سے سفر کے اختتام پر دیرانے کمرے میں جاتے ہوئے اول خان سے پوچھا۔

اول خان نے ٹھکرا کر بردباری سے جواب دیا ”میرے آدمی یہاں لائے جانے والے قیدیوں کے بارے میں اپنی ذمے داریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ کسی شریف مجرم کی زبان چل پڑے تو اس کا بیان ریکارڈ کر لیتے ہیں ورنہ دماغ کے ٹیڑھے جھاڑنے کے لیے

”اس کا مطلب ہے کہ دن طلوع ہونے تک وہ ہماری باز پرس کے قابل ہو سکے گا۔“

”اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انگوٹھی کے کیپول سے مخلوق کی کتنی مقدار اس کے بدن میں منتقل ہوئی تھی۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد پتا چلے گا کہ وہ کتنے مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔“

غزالہ ہمارے مشن کی کامیابی پر بہت خوش تھی کیونکہ ہم نے کافی دنوں بعد اسپیشل فورس والوں کی مدد کے بغیر کوئی مقابلہ نمٹایا تھا۔

”ہم ایس ٹی ایف پر اتنا زیادہ انحصار نہیں کر رہے۔“ سلطان شاہ نے غزالہ کی باتوں کے جواب میں کہا ”ابھی چند ہی دنوں میں ڈینی نے بہت کچھ کام کیے ہیں۔ کل ہم دونوں کی بیرونی مدد کے بغیر رستم ایرانی کی پکچار میں جا گئے تھے۔ اسے ہم پر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو ہم وہاں سے زندہ نہیں نکل سکتے تھے۔“

”فورس کیس کیس مدد ضرور کرتی ہے مگر بڑی کامیابیوں کا سارا کریڈٹ تم لوگوں کو جاتا ہے۔“ اول خان نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا ”جوڑ توڑ اور منصوبہ بندی کے لیے ہم ہر وقت ڈینی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔“

”نام کسی کا بھی لیا جائے، کامیابیاں ٹیم ورک کے نتیجے میں ملتی ہیں۔“ ویرا نے خوش دلی سے کہا ”ہم میدان میں نہ اترنے کے باوجود اپنی بساط کے مطابق بہترین مشورے دیتے رہے ہیں۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ سلطان شاہ نے منہ بنا کر کہا ”شیخ چلی کے گراں بہا مشورے آج بھی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بے چارہ اپنے مشوروں پر خود کبھی عمل نہ کر سکا۔“

غزالہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ویرا سلطان شاہ کو جیکھی نظروں سے گھور رہی تھی۔

”تمہیں فون پر میجر بخشی سے تو بات کرنی چاہیے۔ دو بجتے والے ہیں۔ وہ بے جتنی سے تمہاری اور موسیٰ کی ملاقات کے نتیجے کا انتظار کر رہا ہو گا۔“ اول خان نے اپنی رسد و اوج پر نظر ڈال کر کہا۔

”اب اسے نہ چھیڑنا۔“ ویرا اپنی رہی کو بھول کر بے ساختہ بول پڑی ”رات کو تم اس سے بات ختم کر چکے ہو۔ تمہارے فون سے اس کے ذہن میں نئے سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

اس وقت میں دل ہی دل میں ویرا کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے بے ساختہ بہت دور کی بات سوچی تھی۔ میں فون کرتا تو بخشی یہ ضرور جاننا چاہتا کہ دو بجے کے قریب میں بیرا میں موجود ہونے کے بجائے اسٹیشن فور میں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ موسیٰ بیرا پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں گیس غائب ہو گیا تو وہ میرے ہرذر کو مسترد کر کے یہی نتیجہ اخذ کرنا کہ میں نے اس سے

پروگرام طے کرنے کے بعد موسیٰ پر ہاتھ ڈالا ہو گا۔

اس کے ذہن میں نت نئے خیالات پیدا کرنے سے بہتر تھا کہ میں خاموشی بیٹھا رہوں اور وہ یہ فرض کرنے پر مجبور ہو جائے کہ میں ایس ٹی ایف کی طرف سے اپنی کڑی نگرانی کی وجہ سے مقررہ وقت پر بیرا تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس طرح وہ میری وعدہ خلائی اور موسیٰ کے غیاب کی درمیانی کڑیاں نہیں ملا سکتا تھا۔

کافی دیر بعد ہم اپنے کمرے میں چلے گئے تاکہ دونوں عورتیں بے فکر سے آرام کر سکیں۔

صبح دس بجے اطلاع ملی کہ موسیٰ ہماری توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا۔ فورس کے سادہ پوش افراد کی شناخت ممکن نہیں تھی اس لیے پوچھ گچھ کی ابتدا میں وہ یہ سمجھتا رہا کہ وہ اپنے نامعلوم دشمنوں کی قید میں پھنس گیا ہے جن کا کرٹل تھال دستی سے کوئی نہ کوئی کمر لٹکے۔

شاید کلب سے میرے اغوا کی کوشش کے موقع پر میجر بخشی نے موسیٰ کو میرے مفروضہ نام کے ساتھ یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں فوج سے رٹائرڈ ہو چکا تھا اس لیے وہ میرے بارے میں انتہائی غلیظ زبان استعمال کر کے دھمکیاں دیتا رہا کہ اسے فوری طور پر آزاد نہ کیا گیا تو اس کے آدمی تھال دستی کے ٹکڑے اڑا دیں گے۔

اس کے جارحانہ تیروں کو کچلنے کے لیے اس پر تشدد شروع کرنا پڑا مگر وہ بری حالت میں پہنچنے کے باوجود اپنی زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس کا اصرار تھا کہ اس سے جو کچھ پوچھا گیا اس نے بتا دیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ اطلاعات میرے لیے اہم تھیں۔

مار کھا کھا کر موسیٰ اس حال کو پہنچا ہوا تھا کہ رسی جل گئی تھی مگر اس کے بل نہیں گئے تھے۔ وہ سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ تھا۔ از خود کچھ اگلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اول خان کے آدمیوں کو اس کے پورے پس منظر اور رابطوں سے واقفیت نہیں تھی اس وجہ سے وہ متنی خیز سوالات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ان کی لاعلمی سے فائدہ اٹھا کر موسیٰ ہٹ دھرمی پر تلا ہوا تھا۔

اول خان کے دل میں غیر ملکی ایجنٹوں کے لیے ہر وقت ایک موبوم سا نرم گوشہ موجود رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ انہیں دشمن ملکوں کی طرف سے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ اپنے ملک و قوم سے وفاداری کا تقاضا تھا کہ وہ ان فرائض کی بجا آوری کے لیے اپنی جان لڑا دیں۔ وہ اپنی دانست میں پاکستان کے خلاف کام کر کے اپنے ملک اور قوم کا حق نمک ادا کرتے تھے مگر مقاصد کے براہ راست تصادم کی وجہ سے ہمارے مجرم قرار پاتے تھے ایسے پیشہ ور اور بغیر وردی والے ایجنٹ دشمن کے ہاتھ لگ جائیں تو عبرت ناک انجام سے دو چار ہوتے ہیں، مشن میں کامیاب ہو کر اپنے ملک لوٹنے میں کامیاب ہو جائیں تو عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ یہی طرح انھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

اس کا نام بتایا گیا تھا۔

”پھر تمہیں میرا نام کس نے بتایا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری اس بکواس پر یقین کر لوں گا۔“

”خدا رسول کی قسم میں سچ بتا رہا ہوں۔“ اس نے چیخ کر کہا ”مجھے اس کا حلیہ بتا کر یہ کیا گیا تھا کہ کرل جمال دستی تانی ایک مہمان اس سے ملنے آئے گا۔ ہمیں یہ دیکھنا تھا کہ تم ہر قیمت پر اس کے ساتھ جاؤ۔ بے بی کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے ہمیں اس آدمی کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔“

”یہ بے بی کون ہے؟“ میں نے چونک کر تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔

”موہنی پنڈت!“ اس کا جواب مزید چونکانے والا تھا ”اسے گھر میں سب بے بی کہتے ہیں۔“

”اسے تم کیسے جانتے ہو؟“ مجھے اس سے کوئی سرا ملنے کی امید ہونے لگی۔

”میں دو سال تک اس کا گارڈ تھا۔ اسے اٹھالے جانے کی دھمکیاں دینے والوں میں سے کوئی اس کے قریب آنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا تھا۔“ اس نے چیخ کر کویا اعلان کیا۔ ہاتھ بیروں کو حرکت دینے کی وجہ سے اس کی آنٹی ہتھکڑیاں اور بیڑی کی کڑیاں جھنجھنارہی تھیں۔

اس کا جواب ادھورا اور غیر واضح تھا مگر میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ کچھ لوگوں کی طرف سے اغوا وغیرہ کی دھمکیوں کے بعد موسیٰ کو دو سال تک موہنی پنڈت کے محافظ کے فرائض انجام دینے پڑے تھے۔ میرے لیے وہ تفصیلات غیر اہم تھیں۔ ان سے زیادہ ضروری سوال یہ تھا کہ اس رات موسیٰ کو کلب میں بلانے والا کون تھا۔

”تمہیں موہنی پنڈت نے میرے اغوا کے لیے کلب بلایا تھا؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔ وہ بچی ہے۔۔۔ ہمیں اس کے باپ نے بھیجا تھا۔ کلب میں ہم اس کے مہمان بن کر داخل ہوئے تھے۔ بتایا ہوا حلیہ پہچان کر ہم اپنی ڈیوٹی پر جم گئے۔ بعد میں بے بی بھی وہاں آ پہنچی اور پھر تم آ گئے۔“

میری دھمکی اور حکمت عملی کام دکھارہی تھی۔ میرے سوالوں کے جواب میں وہ مشتفی انداز میں کام کی باتیں اگلتا جا رہا تھا جو میرے لیے حیران کن ہونے کے ساتھ ہی پیچیدہ بھی تھیں۔

”میں نے سنا ہے کہ تم رستم ایرانی کے لیے کام کرتے ہو پھر یہ پنڈت منوہر لال کہاں سے درمیان میں آ گیا؟“

”پنڈت میرا پانا باس ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ اس نے مجھے دو سال تک بے بی کا گارڈ رکھا تھا۔ خطرہ ٹل گیا تو اسی کی سفارش پر میں رستم کے پاس چلا گیا۔ رستم ایرانی اس کا بہت لحاظ کرتا ہے۔“

”میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں کلب میں رستم نے بھیجا تھا یا

اس کے برعکس وہ ایسے ایجنٹوں کے لیے کام کرنے اور دانستہ ان کا آلہ کار بننے والے مقامیوں کے لبو کا پیا سا تھا۔ اپنے ملک کی زمین اور رزق و روزی سے غداری کرنے والوں کی سزا عبرت ناک موت سے کم نہیں ہونی چاہیے تھی۔ موسیٰ کے بارے میں خبریں ملنے ہی اس نے طیش کے عالم میں ارادہ کر لیا کہ اس کی موت کی پرواہ کیے بغیر اس پر بھیانک ترین تشدد کیا جائے تو وہ موت کی دہشت سے بلبا کر زبان کھولنے پر مجبور ہو جائے گا۔

میں نے دھمکے لہجے میں اسے سمجھایا، اپنی نئی تلی رائے سے آگاہ کیا تو رستم رنڈہ اس کا اشتعال ٹھنڈا ہو گیا اور اس نے مجھے موسیٰ پر آخری کوشش کرنے کی اجازت دے دی۔

میں ان چاروں میں سے کسی کو ساتھ لیے بغیر گاڑ روم میں پہنچ گیا جہاں موسیٰ قید تھا۔

میری صورت دیکھتے ہی اس کے منہ سے مغالطہ کا ایک طوفان ابل پڑا۔ میں نے اس پر تحقیر آمیز نظریں ڈالیں اور سگریٹ سٹاک کر کرے میں پڑی ہوئی اکٹوئی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

اس کا چہرہ نوٹ پھوٹ سے عاری اور بالکل صبح سلامت تھا مگر اس کی قدرے متورم آنکھوں سے وحشت ناک کبیدی برس رہی تھی۔ وہ بھڈیا نی انداز میں میرے اوپر گرجتا برستا رہا۔

اس وقت تک موسیٰ کو زندہ رکھنے یا ٹھکانے لگانے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا اس لیے اس پر تشدد میں قدرے احتیاط برتی گئی تھی۔ چہرہ بگاڑنے کے بجائے جسم کے حساس حصوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا جو نظروں سے اوجھل تھے مگر ان کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

اس کی گالیوں پر میرے ساتھ آیا ہو گا گاڑ مشتعل ہو کر ایک بار اس کی طرف لپکا تھا مگر میں نے سختی سے اسے روک دیا اور جب موسیٰ حلق کے بل چیختے چیختے تھک کر خاموشی سے ہانپنے لگا تو میں نے کرسی چھوڑ دی۔

”تم جو چاہو، کرلو۔ یہاں سے میری مرضی کے بغیر نہیں نکل سکتے۔ ابھی تم نے چند گھنٹوں میں معمولی سی مصوبتیں جھیلیں ہیں۔ تم نے زبان نہ کھولی تو میں ایک ایک کر کے تمہاری دونوں آنکھیں ضائع کر دوں گا۔“ میں نے اسے ٹھہرتے ہوئے سرد اور سفاکانہ لہجے میں کہا۔

”تم خون خنجر بھڑیے ہو۔ میں نے کلب میں ہی دیکھ لیا تھا کہ تمہارے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے۔ تم نے مجھے بے قصور پکڑا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ دہوانہ وار پہنچا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ اس رات تم کلب میں کس کا ساتھ دینے آئے تھے؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے چند ثانیوں تک مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا پھر اپنے سر کو نئی میں زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا ”نہیں، نہیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اس سے میری بات تک نہیں ہوئی، نہ مجھے

”دشمنی.... تم نے مجر بخشی کے ساتھ مل کر مجھے بھانسا تھا۔ بخشی سے میں وقت آنے پر نمٹ لوں گا۔ تم میرے قبضے میں آچکے ہو۔ یہ حساب یہیں برابر ہوگا۔ اب یہ بتاؤ کہ آج رات تمہیں کس نے بیرا میں بلایا تھا۔“

”رستم نے!“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر احتیاط سے جواب دیا۔

”اور کام کیا تھا؟“ میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اگلا سوال کیا۔
 ”یہ تم کو کبھی معلوم ہو گا کہ کیا کام تھا۔ رستم نے دو روز سے مجھے ڈینی کی تلاش پر لگایا ہوا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”تمہیں ڈینی کے بارے میں کچھ اہم باتیں بتانی تھیں اور یہ ملاقات دوبارے سے پہلے بیرا میں ہونی تھی۔“

”رستم کو یہ کام کس نے سونپا تھا؟“
 ”یہ اس کے اپنے معاملات ہیں۔ وہ اپنے آدمیوں کو یہ سب نہیں بتاتا۔“

”ڈینی ایک مانوس نام ہے۔ اس کے بارے میں تم پہلے سے کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہو گے۔“

وہ چونک بڑا اور بولا ”تمہارے کہنے سے دھیان آ رہا ہے کہ شاید ڈینی والا کام رستم کے اپنے ذہن کی پیداوار ہو۔ ڈینی کی گرفتاری میں مدد دینے والے کے لیے کچھ عرصے پہلے امریکا والوں نے بڑے انعام کا اعلان کیا تھا۔ یہ ضرور کوئی بہت بڑا پیکر ہے۔“

”مار کھانے کے باوجود تمہارا دماغ صحیح کام کر رہا ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ تم بے خبری میں کیسے خطرناک بھنور میں پھنس چکے ہو؟“

”مجر بخشی تمہارا دشمن ہے۔ رستم تمہیں اپنا دوست سمجھ رہا ہے اسی لیے اس نے اپنے گھر پر میری اور تمہاری ملاقات کا بندوبست کیا تھا۔ تم ڈینی کے بارے میں اہم باتیں جانتے ہو اور کسی کے دوست نہیں ہو۔“ وہ خود کلائی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا

”تم رستم سے بھی نہیں ڈرتے اسی لیے تم نے مجھے راستے سے اٹھالیا۔ بخشی تمہیں اٹھالے گا تبھی مگر تم آزاد ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ بخشی کی بازی بھی الٹ گئی تھی۔“ اس مرحلے پر اس کی آواز اونچی ہوئی ”مجھے تم ہی سب سے زیادہ خطرناک نظر آ رہے ہو اور شاید ڈینی والا انعام لینے کے پیکر میں ہو۔ میں سچ بتا رہا ہوں کہ میں تمہارے منہ کی روٹی نہیں چھیننی چاہتا۔ میں رستم کا تنخواہ دار آدمی ہوں۔ انہی اور رستم کی لڑائی میں مجھے بلا وجہ نہ رگیدو۔“

”مالک سے پہلے اس کے تنخواہ دار مارے جاتے ہیں۔“ میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”اور تمہارے کئی مالک ہیں ایک سابق، دوسرا موجودہ اور تیسرا وہ جو رستم کے ذریعے ڈینی کو پکڑنے کی فکر میں ہے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں، تمہارے سامنے ناک رگڑنے پر آمادہ

پنڈت منوہر لال نے۔“
 ”رستم نے مجھ سے کہا تھا کہ پنڈت جی کو مجھ سے کوئی ذاتی کام ہے۔ میں اس سے مل لوں اور وہ جو کچھ کہے، اس پر عمل کر گزروں۔ مجھے پورا کام پنڈت جی نے خود سمجھایا تھا۔ بعد میں، میں نے رستم کو رپورٹ دے دی تھی۔“

”رستم اور پنڈت میں یہ گھج جو رُکب سے ہے؟“ میں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”بتا نہیں.... میں بس یہ جانتا ہوں کہ پنڈت جی نے مجھے رستم کے پاس کام پر لگوا دیا تھا۔“

”وہ دونوں آپس میں ملنے بھی رہتے ہیں؟“ میں نے سوچتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

”معلوم نہیں۔ میں آج تک اپنے بڑے کے گھر نہیں گیا۔ وہ ہم لوگوں سے بس فون پر رابطہ رکھتا ہے۔ کسی کو گھر بلاتا ہے نہ کہیں اور ملتا ہے۔“

موٹی میری توقع سے کہیں زیادہ کار آمد ثابت ہوا تھا۔ موہنی پنڈت ایک دلکش اور آزاد خیال ماڈل گرل کے روپ میں یوں میرے سامنے آئی تھی کہ میں نے اسے بے ضرر سمجھ کر بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اس پر توجہ دی جاتی تو وہ رستم سے اپنے باپ کے مراسم پر زیادہ روشنی ڈال سکتی تھی گریات وہی تھی کہ موٹی سے پوچھ گچھ کرنے سے پہلے مجھے موہنی یا اس کے باپ کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

”تم نے بعد میں یہ جاننے کی کوشش تو کی ہوگی کہ کلب میں نظر آنے والا شخص کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔

ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہمارے کچھ کیے بغیر وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں رستم کو رپورٹ دینے کے بعد اسے بھول بھال گیا تھا۔ دیکھو! میں تمہاری ہر بات کا جواب دے رہا ہوں۔ خدا کے لیے میرے ہاتھ کھلوا دو اور مجھے کچھ دے دو۔ میں رات سے بھوکا پیاسا ہوں۔“

”تمہاری بھوک پیاس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ پہلے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس روز بھارتی قونصل خانے کے میجر بخشی نے تمہیں استعمال کیا تھا۔“ میں نے ذمہ داری لے لی کہ میں میرے الفاظ پر اس کی وحشت زدہ آنکھیں مزید پھیل گئیں ”نہیں.... تم مجھ پر بھارتیوں کے لیے جاسوسی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔“

”ہم سرکاری آدمی نہیں ہیں جو کسی پر الزام لگائیں اور پھر اسے ثابت کرتے پھریں۔“ اس کی حاضر مدافعتی پر میں نے فوراً ہی پیئیرا بدل دیا ”ہم جس بات پر....“

اس نے میری بات درمیان سے ہی اچکی ”پھر تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“

کلب میں بے بی کو اس سے ملے دیکھا تو حیران رہ گیا تھا کہ دنیا اتنی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔“

”وہاں کوئی دھن راج بھی آتا تھا؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دونوں طرف سے ہاتھ رنگتا تھا۔ کیا تم اس بے غیرت لونڈے کو کبھی جانتے ہو؟“ میری زبان سے دھن راج کا نام سن کر وہ حیران رہ گیا تھا۔

”میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ سوال کرنے کے بجائے یہ بتاؤ کہ اس کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے۔“

”وہ پنڈت کی رنگین محفلوں میں آتا تھا اور دوسری طرف بے بی کو بھی اس نے اپنی لونڈی بنایا ہوا تھا۔ وہ بیٹھے میں ایک دورا تیں اس کے ہوش میں گزارتی تھی۔ دھن راج کے ملنے چلنے والوں میں سے کسی بے بی کے گھر کے چکر بھی لگاتے رہتے تھے۔ یہ سارا گند میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا تھا۔“

”یہ پنڈت اور دھن راج کی نجی زندگی کی بے عزتیاں ہیں۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایسے لوگ اپنی حرکتوں کو خیرہ بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی وقت پڑ جائے تو انہیں اپنی آزاد روی کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ میں مہوئی سے اپنا بدلہ ضرور لوں گا مگر پنڈت تمہارا متبادل ہرگز نہیں ہے۔“

”کیسے نہیں ہے؟“ وہ بے بسی سے مغلوب لمبے میں بولا ”وہ بھارتی یا یہودی نہیں، میری طرح پاکستانی ہے لیکن جس ملک کا کھاتا ہے“ اسی کی جڑیں کاٹتا ہے۔“

”پتھر لوگوں کے آوارہ ہونے سے ملک کی جڑوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“ میں نے اس کی بات کو دانستہ بے وزن کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ان لیا کہ آوارگی اس کا ذاتی دھندا ہے مگر میں اس کی غداری کی بات کر رہا ہوں۔ اس کی دعوتوں میں یہودی بھی آتے تھے اور پاکستان کے خلاف باتیں ہوتی تھیں۔“ اس نے جوش سے دعوئی کیا۔

”اول تو میں کوئی سرکاری فوج دار نہیں ہوں۔ دوم یہ کہ تمہارے یہ الزام بے بنیاد بھی ہو سکتے ہیں۔ پاکستان میں رہنے والے ہزاروں یہودی میری طرح محبت وطن ہو سکتے ہیں۔“

”مسلمان غلبہ، نجی، افریقی اور ایشیائی ہو سکتا ہے مگر یہودیوں میں ایک بڑی خرابی یہی ہے کہ یہ قوم دنیا میں کیس بھی رہتی ہو، اس کے دل میں اسرائیل کا گھمہ ہوتا ہے۔“

”اس کے یہاں آنے والے یہودی کہاں سے تعلق رکھتے تھے؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مجھے معلوم ہے کوئی اسرائیلی پاکستان نہیں آ سکتا۔“ وہ اس موضوع میں میری ظاہری عدم دلچسپی پر ہل کر بولا ”وہ اسرائیلی یا یورپی ہے کہ وہ نیا افسر ہو اور پتھلے ہو۔“

ہوں کہ نوکری چھوڑ دوں گا اور ان پکروں سے بالکل نکل جاؤں گا۔ مجھے معاف کر دو۔“

”معافی کی ایک ہی صورت ہے کہ اپنے تین مالکوں میں سے کسی کی گردن میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں اس سے اپنا حساب برابر کروں گا۔ تم بچ جاؤ گے۔“

”تمہارے بتائے ہوئے تیسرے مالک کو میں نہیں جانتا۔ پتا نہیں اس کا کوئی وجود بھی ہے یا یہ تمہارا خیال ہے۔ رستم اپنے گھر سے بہت کم باہر نکلتا ہے اور اس کے گھر میں گھسنا ناممکن ہے۔ تم پنڈت جی کو پھیلو۔ اگر میں نے تمہارے خلاف مہجر بخشی کا ساتھ دیا تھا تو پنڈت جی کی بیٹی بھی اس کی شریک تھی۔ تمہیں لے جاتے ہوئے گاڑی وہی چلا رہی تھی۔ مجھ سے پہلے تم کو بے بی یا اس کے باپ کو مارنا چاہیے۔“

”ابھی میں نے کسی کو مارنے کا فیصلہ نہیں کیا۔“ میں نے اس کی حالت سے معظوظ ہوتے ہوئے کہا ”آکھ چوکی ہو رہی ہے۔ آخر میں جس کی گردن ہاتھ میں آئے گی اسی کے بارے میں سوچا جائے گا۔“

”مگر میری گردن چھوڑ دو۔ میں چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے روزی کمانے والا مزدور ہوں۔ میری اور تمہاری کوئی ٹکری نہیں ہے۔ تمہیں سب معلوم ہے تو تمہیں سب سے پہلے بخشی کی گردن پانی چاہیے۔“

”مزدور!“ میں نے اسے قہر پار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا ”رستم بھاری معاوضے لے کر قتل، ڈکیتی، چوری اور اغوا کی وارداتیں کراتا ہے۔ تم اس خونی درندے کے لیے کام کرتے ہو اور خود کو مزدور کہتے ہو۔“

”میں نے بھی یہ سب سنا ہے مگر میں حلیہ کتا ہوں کہ میں آٹھ مہینے سے اس کے پاس ہوں۔ اس دوران میں میں نے کوئی قتل نہیں کیا، کسی کا خون نہیں بہایا۔“ وہ گڑگڑاتا لگا۔

”رستم اپنے آدمیوں سے دور بلکہ الگ تھلگ رہتا ہے۔ تم اس کے دوست کے گھر میں دو برس رہے ہو۔ پنڈت کے کڑواؤں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو گے۔“ میں نے اسے راہ دی۔

”پنڈت پر لے در رہے کا حرامی ہے۔“ ممبر کا بیٹا نہ لیر ہونے پر وہ پھٹ پڑا ”ابنی لڑکی کو رنگ لیاں منانے کے لیے آزاد چھوڑا ہوا ہے اور خود گھر میں رنگ لیاں مناتا رہتا ہے۔ وہ ڈپوک آدمی ہے۔ میری طرح اسے مارو گے تو ذرا دیر میں خودی اپنی ساری رام کا بیانی سانی شروع کر دے گا۔“

”تم نے مہجر بخشی کو اس کے گھر بھی نہیں دیکھا تھا؟“ میں نے چپچپے ہوئے لمبے میں پوچھا۔

”کبھی نہیں.... پنڈت کی پاریوں میں بھارت سمیت کئی ملکوں کے بڑے افسر آتے تھے مگر بخشی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نیا افسر ہو اور پتھلے ہو۔“

اور پروا کرنے کی کوششوں میں بے نقاب ہو کر سامنے آئے اور ہم پوری یکسوئی سے اس کی سرکوبی کر گئیں۔

”اصلی طور پر میں تم تینوں کا ہم نوا ہوں۔“ ان کے دلائل خاموشی سے سننے کے بعد میں نے پورے سکون سے کہا ”لیکن یہ وقت ایسے کسی قدم کے لیے موزوں نہیں ہے۔“

”کیا اس لیے کہ یہ میری خواہش ہے؟“ ویرا نے ترش لبہ میں سوال کیا۔

”تم سے مجھے کوئی پر خاش نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ رستم والا کامیاب نہیں رہ کر نشتایا جائے۔ اس کے بعد ہم شرمیں اپنا ٹھکانا جمائیں گے۔“

”رستم کا معاملہ لمبا چلے گا۔ وہ دو چار روز میں زہر ہونے والی آسانی نہیں ہے۔“ سلطان شاہ نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا ”کیا اس وقت تک ہم ہمیں بڑے رہیں گے؟“

”تم خود بتا چکے ہو کہ وہ گھر سے بہت کم باہر نکلتا ہے اور اس کے گھر میں گھنٹا جان جو کھوں کا کام ہے۔“ ویرا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”تم لوگ ایک دم بہت دور چلے جاتے ہو۔“ میں نے اکتا کر کہا ”میں رستم سے حماز آرائی کی نہیں اس کے ذریعے ادب کو ٹھکانے لگانے کی بات کر رہا تھا۔“

”ان دونوں کے پھولے ہوئے غباروں سے ہوا نکل گئی اور غزالہ مسکرانے لگی۔

”آج رات اس سے بات ہوگی۔“ قدرے توقف کے بعد سلطان شاہ نے بات پھر شروع کی ”ایک دو روز میں اس کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ اس۔۔۔۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ادب رائن والے کام سے سرے سے انکار کر دے۔“ ویرا نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے لقمہ دیا ”اس کے انتظار میں ہم بلاوجہ وقت برباد کر رہے ہیں۔“

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ وقت برباد کرو۔ تم دونوں نکل جاؤ اور کسی گھر کا بندوبست کر لو۔ ہم یہاں سے اٹھ کر وہاں چل دیں گے۔ میں ذرا آرام کرنے کے موڈ میں ہوں۔“ میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

ویرا کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ عود کر آئی اور اس نے کہا ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم میرے بخشی کے خوف کی وجہ سے باہر نہیں جانا چاہتے۔ اس کے لیے تم اومان چاہتے ہو۔ وہ تمہیں شرمیں دیکھ لے گا تو تمہارے لیے سنگین مسائل کھڑے کر دے گا۔“

میری کھوپڑی بھنا کر رہ گئی ”تم میری ہر بات میں خفی پیلو تلاش کرنے میں لگی رہتی ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟“

”میرے ساتھ چلو اور نیا گھر تلاش کرو۔“ اس نے ڈھٹائی سے مطالبہ کیا۔

اور کیسٹ وغیرہ لیتے ہوئے دیکھا۔ ایسے کام بہت رازداری سے کیے جاتے تھے۔“

”تمہارا خیال ہے کہ پنڈت یودیوں کے لیے جاسوسی کرتا ہے؟“ میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم یقین نہیں کرو گے۔ رستم سب کچھ کرتا ہے۔ بہت سے قتل اس سے منسوب ہیں مگر وہ جاسوسی اور منشیات کے دھندوں سے میلوں دور رہتا ہے۔“

اسے لاجواب کرنے کے لیے مجھے خیال آیا کہ اس سے پوچھوں کہ رستم ڈینی کی تلاش میں کیوں ہے؟ میں لاکھ ڈالرز کے لالچ میں وہ اسے پیچھے کے درپے کیوں ہے؟ مگر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہ مفروضہ موسیٰ کا تھا کہ رستم پیسے کے لالچ میں ڈینی کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے یخچر بخشی نے خود بتایا تھا کہ اس نے وہ کام ایک مقررہ معاوضے پر رستم کو سونپا تھا۔ شاید رستم کو علم ہی نہ ہو کہ پاکستان اور پاکستانیوں کی ایک باخبر اقلیت کس طرح میری ذات کے دفاع میں مصروف تھی۔

میں روکھے چپکے انداز میں تجاہل عارفانہ سے کام لیتا رہا۔ موسیٰ جوش و خروش سے پنڈت منوہر لال اور اس کی اکلوی بیٹی کے خلاف زہر لگتا رہا اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ موسیٰ نے باتوں کو دہرانا شروع کر دیا ہے تو میں تیزی کے ساتھ گاڑ روم سے نکل گیا۔

میری اچانک روانگی پر موسیٰ نے چیخ کر نجات کے لیے دہائی دینی شروع کر دی۔ میں نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا مگر جاتے ہوئے محافظ کو ہدایت دے دی کہ وہ قیدی کے ہاتھ کھول کر اس کی شکم چھری کا بندوبست کر دے۔

موسیٰ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں مجھے پیش قدمی کی ایک نئی راہ نظر آ رہی تھی۔ وہ دشمنوں کا ایک ایسا حماز تھا جو اس وقت تک ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا۔

○●○

اول خان کے چلے جانے کے بعد ان تینوں نے سنجیدگی سے مجھے گھیر لیا۔

اسٹیشن فور میں ہمارا قیام طویل ہو جانے کی وجہ سے وہ سب ہی اکتائے ہوئے تھے۔ میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ اسٹیشن ٹاسک فورس کے بڑھتے ہوئے کردار کی وجہ سے ہمارے دشمنوں کے حوصلے اتنے پست ہو گئے تھے کہ وہ زیر زمین چلے گئے تھے۔

ظاہری طور پر ہر طرف سکون اور عافیت کا دور دورہ تھا مگر مجھے اندیشہ تھا کہ اس سکوت کی تہ میں کسی بڑے طوفان کی سازشیں پروان چڑھ رہی ہوں گی۔ میرے ان اندیشوں کی تصدیق موسیٰ نے اپنے بعض فقروں سے کی تھی۔ ان کے سبب اب کی بہترین صورت یہی تھی کہ پہلے کی طرح ایس کی ایف مکمل طور پر پس منظر میں چلی جائے اور ہم دوبارہ شرمیں کیس اپنا ٹھکانا بنائیں تاکہ دشمن ہمارے

”یہ معمولی سا کام تم سلطان شاہ کے ساتھ مل کر بھی کر سکتی ہو۔“ میں نے جل کر کہا۔

”سلطان شاہ گاؤں میں ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں پھر کوئی نادار مل جائے اور ہمارا کام آسان ہو جائے۔“ ویرا اس وقت مجھے چرانے پر تلی ہوئی تھی۔

”تمہیں ہر طرف خالی مکانوں کا ایک جنگل بکھرا ہوا ہے۔ جاؤ اور بات طے کرلو۔“

”اس بار ہمیں کلفٹن اور شہر کے مرکزی علاقوں سے دور نکل جانا چاہیے۔“ غزالہ نے بڑھتی ہوئی تلخی کے پیش نظر گفتگو میں حصہ لیتا شروع کر دیا ”ہمارے بیشتر دشمن کلفٹن، ڈیفنس اور سوسائٹیز کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہم بھی ان ہی اطراف میں رہتے آئے ہیں۔“

غصے کے باوجود میں غزالہ کی دور اندیشی کو سراہے بغیر نہ رہ سکا ”میں تم سے سوئی صد متفق ہوں۔ علاقے کی تبدیلی اب ناگزیر ہو گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ گلشن اقبال کا علاقہ موزوں رہے گا۔“ میری تائید پر سلطان شاہ بولا۔

ویرا نے اپنی زہر افشانی سے جو تلخی پیدا کی تھی وہ ذرا سی دیر میں تحلیل ہو گئی اور غزالہ کی تجویز کے مختلف پہلوؤں پر بحث آتے چلے گئے۔

میں خود بھی مکان کی تلاش کی مہم میں شریک ہو کر کوئی مناسب جگہ منتخب کرنے کا خواہاں تھا مگر ویرا کی ضد میں میں نے شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ ماحول بہتر ہوا تو میں ان تینوں کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

گلشن اقبال کراچی کی ایک بارونٹی اور متوسط آبادی ہے جہاں شہری سہولتوں کے احوال معمول علاقوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہیں ہیں۔ مجھے فکر صرف یہ تھی کہ وہاں کوئی مکمل آراستہ مکان کرائے پر مل سکے تاکہ ہم غیر ضروری خریداریوں سے بچ سکیں۔

اس سے پہلے بھی ہمارے پاس نادارہ کا ساجا سبایا اور کشادہ فلیٹ تھا جہاں ہم خانہ بدوشوں کی طرح صرف اپنا راشن لے کر بیٹھ گئے تھے اور آڑے وقت میں مکان کو منتقل کر کے وہاں سے نکل بھاگے تھے۔ یہ ذمہ داری اول خان کی تھی کہ ہمارا چھوڑا ہوا فلیٹ کسی کے ناجائز تصرف میں آئے بغیر نادارہ کی تحویل میں چلا جائے جو ان دنوں ہمارے رابطے میں نہیں تھی۔

ہم ڈرگ روڈ اسٹیشن سے داہنی طرف مڑ کر ذرا سی دیر میں راشن منہاس روڈ پر آ گئے۔ وہ گلشن اقبال تک رسائی کا سب سے بہتر اور مختصر راستہ ہے۔

”اگر ہمیں آج ہی کوئی مناسب مکان مل گیا تو کیا ہو گا؟“

راستے میں سلطان شاہ نے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے؟ رات کو رستم کو فون کرنے کے بعد سب کچھ

گئے۔“ ویرا کے پاس جواب تیار تھا۔

پہلی اسٹیٹ ایجنسی پر میں عورتوں کو گاڑی میں چھوڑ کر سلطان شاہ کے ساتھ اندر گیا تو گھرے دفتر میں متعدد میزوں کے پیچھے نمائندے موجود تھے۔ دو میزوں پر خریداریاں کرائے دار منتقل اور کاغذات میں الجھے ہوئے تھے۔ پہلی میز پر پتاک استقبال کے بعد ہمیں اندرونی حصے میں ایک نوجوان کی میز تک پہنچا دیا گیا۔

وہ نوجوان مہذب اور خوش اخلاق ہونے کے ساتھ چرب زبان بھی تھا۔ ہماری ضروریات کے بارے میں چند اہم سوال کرنے کے بعد اس نے ایک ضخیم رجسٹر کھولا اور اس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔

دفتر اڑکنڈیشنڈ تھا۔ میں نے تمباکو نوشی کی ممانعت کا کوئی اسٹیکر دیکھنے کے لیے سر اٹھایا تو کئی افراد سگریٹ نوشی میں مصروف نظر آئے اور میں نے بھی بے تکلفی سے سگریٹ سلاگلی۔

رجسٹر کی ورق گردانی میں مصروف نوجوان نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اپنی میز کی دروازے سے الٹش ٹرے نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ورق پلٹتے وقت وہ کہیں کہیں رک کر مایوسانہ انداز میں سر ہلاتا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے انہماک کا دورانیہ طویل ہونے لگا تو میں نے اسے ٹوک دیا۔

”اگر فی الحال کوئی مکان دستیاب نہیں تو میں بعد میں فون کر لوں گا۔ میری فیملی باہر موجود ہے۔“

”اوہ!“ وہ خوشامدانہ انداز میں ہنسا ”باہر گری ہے۔ فیملی کو بھی اندر بلا لیں۔ دراصل فلیٹ اور مکان تو بہت سے ہیں۔ میں آپ کے معیار کا کوئی عمدہ سٹیکل یونٹ دیکھ رہا ہوں۔“

میں دل ہی دل میں اس کی چرب زبانی پر ہنسا۔ میں نے کسی معیار کا مطالعہ کئے بغیر اس سے تین کمروں کے کسی فرشتہ مکان کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں نے کہا ”میرے پاس وقت کم ہے۔۔۔۔۔“

”یہ لیجئے!“ اس نے رجسٹر اپنی گود سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا ”اتفاق سے یہ دو مکان مل گئے۔“

اس نے رجسٹر میں لکھی ہوئی تفصیل پڑھ کر دہرائی شروع کر دی۔

میری توجہ سہولتوں سے زیادہ علاقے پر مرکوز تھی۔ ہمیں سر چھپانے کے لیے ایک ایسی جگہ درکار تھی جو محفوظ اور پرسکون علاقے میں واقع ہو۔ وہاں سونے کے لیے چند بستر اور روزمرہ ضرورتوں کے لیے چند بنیادی اشیاء موجود ہوں۔

میں پہلے بھی مکان کی تلاش کے صبر آزما مراحل سے گزر چکا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ زیادہ جھان بین کی صورت میں وقت کی بربادی اور زحمت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو تا۔ کہیں کرائے دار کو مکان پسند نہیں آتا اسے مکان پسند آتا ہے تو مالک مکان کو کرائے دار پسند نہیں آتا۔

اس انجینی میں بھی اچھی بات یہ تھی کہ اس لڑکے نے صرف

لبی مدت کے لیے دو ہزار روپے ماہانہ کا خاخر اٹھاتا رہا۔ اس وقت تک ہمیں ایک خطرناک وسیلہ میسر تھا جو گن بوت کی فروخت کے نتیجے میں ہمیں ہاتھ لگا تھا۔ اس رقم کا ایک برا حصہ ڈالروں کی صورت میں سسلی کے پاس بطور امانت محفوظ تھا۔ یہ ہماری خوش نصیبی اور ہمارے ملک کی بد نصیبی تھی کہ روپے کی قدر میں کمی کے ساتھ ہمارے ذاتی خزانے کی مالیت میں کمی بار اضافہ ہو چکا تھا۔

آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو ایک روز قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ میں نے جب سے یہ ضرب المثل سنی تھی، اس شعوری طور پر اخراجات کے سلسلے میں تجوڑا سا خنٹا ہو گیا تھا۔ اس پس منظر میں دو ہزار ماہانہ کی بچت کے لیے ویرا کی کو شش مجھے پسند آتی تھی۔

وہ مینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ لڑکے نے ہمیں اگلے مینے کے آغاز سے کرائے داری کے معاہدے کے آغاز کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لیا۔ اسے اگلے روز کاغذات کی تیار کی ہدایت دے کر میں نے ویس پانچ ہزار روپے نقد تھمائے، اس کے برٹس کارڈ کی پشت پر اس سے رسید لکھوائی اور ہم وہیں سے واپس روانہ ہو گئے۔

”بس اتنی سی بات تھی جس کے لیے تم نے تکرار شروع کی تھی۔“ واپسی کے سفر میں ویرا نے کہا۔

کو شش نہیں کی تھی۔ اسٹیٹ ایجنٹ کو معاوضے کے طور پر ایک ماہ کا کرایہ دینے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ مالک مکان کے بہت سے ناپسندیدہ سوالات کو ایجنٹ خود سنبھال لیتا ہے۔ کرائے دار کو اپنے پیسے، مکان کی تبدیلی کے اسباب اور ایسے دوسرے نکات کی وضاحت نہیں کرنی پڑتی۔

ان میں سے تین خواب گاہوں کا ایک مکان نیشنل اسٹیڈیم کے عقب میں واقع تھا۔ وہ صاف ستھرا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں نے دوسرے مکان کو مسترد کر کے اس پر انگلی رکھ دی۔

نوجوان ایجنٹ نے موٹر سائیکل پر ہماری رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیا۔ تھوڑی دیر کے سفر کے بعد ہم مطلوبہ مکان کے سامنے موجود تھے۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی سب نے میری پسند کی توثیق کر دی۔

مکان میں موجود قالین، پرے، صوفے اور مسیماں وغیرہ نئی نہیں تھیں مگر بہت بوسیدہ بھی نہیں تھیں۔ ہماری پسندیدگی بھانپ کر ایجنٹ کھلا رہا تھا اور اس مکان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔

اس نے مروجہ شرائط کے ساتھ مکان کا کرایہ بتایا۔ ویرا کو گلشن ٹوکیا کرچی کے کسی بھی علاقے کے کرایوں کا اندازہ نہیں تھا مگر وہ ایک عورت تھی۔ مول تول کرنا اس کا بیدار کن شی تھا۔ اس نے ہم سے انگریزی میں باتیں کرتے کرتے ششہ اردو میں کرایہ زیادہ ہونے کی شکایت کی تو ایجنٹ بھونچا رہ گیا۔

اس نے گرامر کی ہر پابندی سے آزاد، ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ایک مرتبہ پھر مکان کی تعریفیں کیں۔ ویرا نے لاہور سے انداز میں سر ہلا کر ”ٹوٹی“ کے دو لفظ کہے اور ایجنٹ کا دل فوراً پھینچ گیا۔

اس نے علاقے میں اوسچے کرایوں کا رواج بتاتے ہوئے خاص ویرا کے لیے ایک نخت کرائے میں دو ہزار کی کمی کر دی۔ میں حیرت سے ویرا کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

بعد میں پتا چلا کہ چھ سو گز کے رقبے پر بنا ہوا ”لاکھوں کی مالیت کا وہ مکان“ اسلام آباد میں متعین سولہویں گریڈ کے ایک نان گریڈڈ افسر کی ملکیت تھا۔ کرائے داری کے جملہ اختیارات کے ساتھ اس نے مکان کی چابیاں اسٹیٹ ایجنسی کے مالک کو سونپی ہوئی تھیں جو اس کا کمرہ دوست تھا۔

اس لڑکے نے اپنے مالک کے سامنے کارکردگی دکھانے کے لیے شاید مقررہ کرائے میں دو ہزار کا اضافہ کر دیا تھا جو ویرا کے اکلوتے اعتراض پر واپس لے کر اس نے ہم پر احسان کیا تھا۔

سودا مکان کی خریداری کا ہوا کرائے داری کا، درمیانی آدمی جہاں بھی موجود ہوتا ہے دونوں فریقوں کو متعدد ذمتوں سے بچانے کے ساتھ ساتھ سودے کی مالیت میں بھرپور اضافے کے لیے کوشاں رہتا ہے تاکہ اس کے کمیشن میں کچھ اضافہ ہو سکے۔ ہمارے معاملے میں اس لڑکے یا اس کے مالک کو ہم سے صرف دو ہزار روپے زیادہ ملنے لیکن اس

زندگی بدلنے والی



خواتین اور مردوں کو ہمیشہ فٹ اور اسمارٹ رکھنے والی، نگہ بیلو ورزش سی مشینیں، موٹو بائیکس، والی جاگنگ سائیکل، جیٹ ازیم مشینیں، بیج، بائبل، ویٹ بار، ٹیبل ٹینس، بیئر پی وی، رکھائے جانے والے تمام فٹنس ایٹم مفت ٹریننگ وڈیو اور بعد از فروخت کا زخی کیسا تھا

بلال برادر س

119-A سنہی مسلم سوسائٹی نزد طارق روڈ - کراچی

فون: 4531961-62

تھے کہ اول خان آپہنچا۔

”تم لوگ بتائے بغیر کہاں نکل گئے تھے؟“ اس نے آتے ہی خشک لہجے میں پوچھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر کئی بل پڑے ہوئے تھے۔

”جھانڈنی کی ڈرائیو پر نکلے تھے مگر باتوں ہی باتوں میں آگے نکلتے چلے گئے۔“ ویرا نے سب کی ترمیمی کا فرض اپنے ذمے لے کر جواب دیا ”گلشن اقبال ہو کر آئے ہیں۔“

”جانے سے پہلے انٹر کام پر مجھے اطلاع تو دے سکتی تھیں۔ اتنی دیر ہو جانے کی وجہ سے میں فکر مند ہونے لگا تھا۔“ اس نے ناگواری سے کہا ”آج کل کے حالات میں تمہیں اور ڈینی کو تو شہر کا رخ ہی نہیں کرنا چاہیے۔“

”سواری! مجھ سے غلطی ہوئی مگر یہ ذمہ داری ڈینی کی تھی۔“

اسے ہم نے اپنا برا بھلا ہوا ہے تو اسے تم کو اطلاع دے دینی چاہیے تھی یا پھر اتنی لمبی ڈرائیو پر نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”میں ہی نہیں، میرا اضافہ بھی پریشان تھا۔ مجھے گیٹ سے چیک پوسٹ والوں نے ڈیڑھ گھنٹے بعد بتایا کہ تم سب باہر نکلے ہوئے ہو اور واپس نہیں آئے۔“

”میری معذرت کے بعد یہ ذکر ختم ہو جانا چاہیے۔“ ویرا نے اسے مغربی دیتھ یاد دلایا۔

میں نے محسوس کیا کہ ویرا اسے باتوں میں الجھا کر مکان کی تلاش کا قصہ گول کرنے کے چکر میں تھی۔ اول خان کو بعد میں اس واقعے کا علم ہوا تو وہ ہم سب سے ناراض ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی ہم لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ میں نے لگا صاف کر کے دھیرے سے کہا ”دراصل ایک بحث شروع ہو گئی تھی۔“

”نہیں ڈینی! یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ تم بہت ذمہ دار آدمی ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“

”دونوں عورتوں کا خیال تھا کہ کرائے کا مکان ملنا بہت آسان ہے۔ میں انہیں دکھانا چاہتا تھا کہ مطلب کا گھر ڈھونڈنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔۔۔“

”اور اس بحث میں تمہیں واپسی کا خیال نہیں رہا۔“ اول خان نے خفگی سے میری بات کاٹ دی ”میں مانتا ہوں کہ عورتیں یہاں کی سخت زندگی سے بے زار ہیں۔ انہیں چارپائیوں پر سوتا پڑ رہا ہے۔ ہاتھ روم کمرے سے دور ہیں۔ شب و روز میں آکٹا ہٹ کی حد تک کیسانیت ہے۔ یہ دونوں ایسی بے کیف اور روکھی پھکی زندگی کی عادی نہیں ہیں مگر تمہاری عقل کو کیا ہو گیا تھا؟“

اول خان کے آخری سوال پر ویرا کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ بے ساختہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ غزالہ نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی روکی ہوئی تھی۔

”کیا۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اول خان نے فضا میں اپنے دونوں

”تم خوش قسمت ہو کہ یوں لاوارث مکان مل گیا۔ کرائے پر گھر لینا آسان نہیں ہے۔ دھکے کھا کھا کر طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔“ سلطان شاہ نے بتایا۔

”یہ قدموں کی برکت بھی ہوتی ہے۔ تم اکیلے آئے ہو تو شاید وہی ہوتا جو تم کہہ رہے ہو۔“

”مجھے یہ پُر نضا اور شور و غل سے محفوظ علاقہ پسند آیا ہے۔“ غزالہ نے مسرت سے کہا ”کیا ہم یہ مکان خرید نہیں سکتے؟“

”دس دفعہ خرید سکتے ہیں مگر یہ ہمارے گلے پڑ جائے گا۔“ میں نے موڑ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں؟“ میری بات غزالہ کی سمجھ میں نہیں آسکی ”کراچی میں جائیداد سے بہتر سرمایہ کاری شاید کوئی اور نہیں ہے۔ اس کے دام بڑھتے ہی رہتے ہیں۔“

”تمہاری بات درست ہے مگر ہمارے حالات ابھی ایسی سرمایہ کاری کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ یہ گھر کمیشن دشمن کی نظروں میں آگیا تو کیا ہو گا۔۔۔ گھر کرائے کا ہو تو ہر وقت ٹھکانا بدلنے کی آزادی میسر رہتی ہے ورنہ آدمی ایک کھونٹے سے بندھ کر رہ جاتا ہے۔“

”ڈینی کا معنی خیز شور مچ رہا ہے؟“ ویرا نے سلطان شاہ کا شانہ ہلا کے پوچھا ”یہ بات گھر کے ساتھ عورت پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ آدمی شادی کر لے تو زندگی بھر کے لیے اسی کھونٹے سے بندھا رہ جاتا ہے۔ شادی سے پہلے یہ گھر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوتا ہے۔“

”مجھے تمہاری آزادی پر حیرت ہوتی ہے۔“ سلطان شاہ نے اس کی بات اسی پر لوٹا دی ”ہمارے یہاں مرد اتنے آزاد نہیں ہوتے جتنی تم ہو۔ اب تمہیں اپنا گھر بسایا لینا چاہیے۔“

ویرا کب چوکنے والی تھی۔ فوراً ہی بول پڑی ”تم راضی ہو جاؤ تو یہ کام ابھی راستے میں کیے لیتے ہیں۔“

سلطان شاہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے مضبوطی سے اپنے ہونٹ پیچھ کر سر جھکا لیا۔ ویرا کی بے باکی اسے یوں ہی چپ کر دیتی تھی۔ غزالہ اس مذاق پر دل کھول کر ہنسی تھی۔

راستے میں محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک مشہور فاسٹ فوڈ ریسٹوران سے لچکرتے ہوئے ہم اسٹیشن فور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں مجھے بھول کر بھی یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوا تھا کہ کوئی مجھے پہچان لے گا اور شاید ویرا ابھی ایسی ہر تشویش سے آزاد تھی۔

حالات خواہ کیسے ہی ہوں، انسان ان کا اثر اپنے موڈ اور مزاج کے مطابق لیتا ہے۔ خوف اور قنوطیت طاری ہو تو ذرا سا خطرہ بھی ملک محسوس ہونے لگتا ہے۔ لاابالی پن اور خوشی کا موزہ تو انسان جان کے حقیقی خطرے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

شاید اول خان نے کیپ کی چپک پوسٹ کو ہمارے بارے میں ہدایات دی ہوئی تھیں۔ ہم گاڑی سے اتر کر اندر بیٹھے۔ بھی نہ پائے

نظام الاوقات

انواج کے تمام شعبوں میں بھرتی ہو رہی تھی۔ گراؤنڈ میں کھٹنا گھر کے سامنے امیدوار جمع تھے۔ کمانڈنٹ آفیسر کہنے لگا ”میں تم لوگوں کو چند بنیادی باتیں بتانا چاہتا ہوں لیکن کسی گروپ کا دوسرے گروپ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ جو نوجوان آری کے خواہش مند ہیں انہیں دو گھنٹے میں فارغ کر دوں گا۔ انر فورس میں جانے والوں کو چودہ بجے نیوی سوئی پارہ پر ہوگی اور میرمن کے خواہش مندوں کو ٹھیک اس وقت جب گھڑیال دوبار گھٹنا بجائے گا۔“

حلیہ جو بیوں پر متعجب رہ گیا۔ اس بارے میں کوئی بات نہ ہونے کے باوجود مجھے ہر وقت خاصے مضبوط ہمانے سوچ رہے تھے۔ ”تمہیں ہمیشہ یہاں نہیں رہنا تھا۔ ایک نہ ایک دن جانا ہی تھا۔ اچھا ہوا کہ تم سب نے اپنی پسند کا گھر ڈھونڈ لیا۔ بس مجھے عمر بھر یہ قلق رہے گا کہ اس انتخاب میں میں تمہارے ساتھ شامل نہیں تھا۔“ پوری صورت حال واضح ہونے کے ساتھ ساتھ اول خان کی اداسی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ”تم بھرے وقت کی بات کر رہے ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بندوبست مذاق مذاق میں ہوا ہے۔ ویسے بھی کلکشن والا فلیٹ میں نے خود ڈھونڈا تھا۔ اس وقت تمہیں یہ بات بری نہیں لگی تھی۔“ میں نے اس کے سر پر سوار ہو کر کلامت کی۔ ”اس وقت تم میرے مہمان نہیں تھے۔ آج تم میرے مہمان تھے۔“ اس کی اداسی دور نہ ہو سکی۔

”ٹھیک ہے۔ ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ ابھی ہم نے صرف پانچ ہزار دیے ہیں۔ ہم عمر بھر بیس رہیں گے۔ ہم مر جائیں تو تم اسی میدان میں ہماری قبریں بنا کر ان کے مجاور بن جانا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تمہاری خوشی ہمیں اپنے ہر آرام بلکہ جانوں سے زیادہ عزیز ہے۔“

وہ جذباتی آدمی تھا۔ میرے اس جذباتی وار کو نہ سہہ سکا۔ ڈیڈ پائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اچانک کرسی سے اٹھا اور والدانہ انداز میں مجھے اپنے سینے سے پٹنایا۔

”اللہ تمہیں لمبی عمر دے اور مجھے تمہارے کندھے نصیب کرے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں دعا گو تھا ”میں تمہارا بد نماہ نہیں ہوں۔ تم جب چاہو گے میں خود تمہیں سننے کہ میں پٹنایا کر گا۔“

ہاتھ گھما کے غصے سے کہا ”کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا تھا جو دیر ایوں بستی ہوئی بھاگی ہے۔“

”آرام سے بیٹھو!“ میں نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا ”غصے سے اس وقت تمہارا چہرہ چقدر ہو رہا ہے۔ آئینہ دیکھ لو تو تم خود قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔“

وہ بازو پھڑپھڑانے کی کوشش کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا ”تم ضرور کوئی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔ سچ بتاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

”میں وہی بتا رہا تھا لیکن تم مجھے بولنے کا موقع نہیں دے رہے۔ ہماری بحث....“

”مجھے بحث میں الجھانے کی کوشش مت کرو۔ سیدھی طرح اصل بات بتاؤ!“

”یہ اصل بات ہی ہے۔ ہمیں کرائے کا مکان مل گیا۔“ کوئی تمہید باندھنے کے بجائے میں نے اس کی بار بار کی قطع کالی پر جھلا کر بات نہایت مختصر کر دی۔

”ہائیں.... مکان مل گیا؟“ حیرت سے اس کا منہ کھلا اور پھر کھلا رہ گیا۔

”ہاں!“ میں نے تیزی سے کہا ”میں ان کا دماغ درست کرنے کے لیے ایک اسٹنٹ انجینیئر پر لے گیا اور اتفاق سے پہلا مکان ہی سب کو پسند آگیا۔ ہم ایڈوانس دے آئے ہیں۔“

”اوہ! تو تم اتنی دیر سے یہ بات بتانی چاہ رہے تھے۔“ اس کے اعصاب ایک دم نرم پڑ گئے۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ ہماری آواز میں بولا ”کوئی ایم سو ری؟“ ”میرا خیال تھا کہ تم چاروں کو یہاں روکے رکھ کر میں تمہارے ساتھ بھلائی کر رہا ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں نے تم سب کو بے زاری کی ایسی سرحدوں پر پہنچا دیا ہے کہ تم مجھ سے چوری چوری مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہو گے۔“

اس کا غصہ اداسی میں ڈھلتے ہی میرا دل شیر ہو گیا اور میں نے بے خوفی سے کہا ”تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ مکان کے بندوبست کا نغفلہ تمہارے سامنے بھی اٹھ چکا ہے۔“

”باتیں ہوتی تھیں۔“ اس نے مجروح اور مضطرب لہجے میں اقرار کیا ”مگر میں نے کبھی بھی مسئلے کی شدت کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ تم سب نے یہاں واقعی بہت کراؤ وقت گزارا ہے۔“

”اب احقانہ باتیں مت کرو۔“ میں نے شفقت سے اسے ڈانٹا ”ہماری دشواریاں اتنی نہیں تھیں۔ سب کو یہ احساس تھا کہ ہماری وجہ سے تم کھن چکر بن کر رہ گئے ہو۔ ہماری فکر میں تمہارے کام کا ہرج ہوتا ہے، تمہارے بیوی بچے پشاور میں پڑے ہوئے ہیں اور تم ہماری وجہ سے زبردستی کی تنہائی پھیل رہے ہو۔ تمہاری غیر حاضری میں ہم یہ باتیں کرتے رہتے تھے۔“

غزالہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور میں خود بھی اپنی

سے آئے تھے۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔
”ان حالات میں تم موئی کو کب تک اپنی قید میں رکھ سکے گے؟“

”وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی پوری ہسٹری شیٹ میرے سامنے ہے۔ وہ کم از کم تین مردوں اور ایک عورت کا قاتل ہے۔ اگر قانون اسے سزا نہیں دے سکا تو ہمیں کچھ سوچنا ہوگا۔ اسے زندہ چھوڑا گیا تو کرل بتال دستی کا نام ایک مرتبہ پھر ہراسہ فری کی توجہ کا مرکز بن جائے گا۔“

”کرل بے چارہ تو اس وقت اومان کے کسی ہوٹل میں نوکری پر چڑھ چکا ہوگا“ میں نے ہنس کر کہا۔
”ہر ایک کو یہی باور کرایا جانا چاہیے تاکہ یہاں تمہاری تلاش کی مہم زیادہ زور نہ پکڑ سکے“ اس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

موئی کے لیے بدترین بات یہی تھی کہ وہ کرل بتال دستی کے نام سے ہی واقف نہیں تھا بلکہ تین مرتبہ مجھے دیکھ بھی چکا تھا۔ اس سے میرا پسلا سامنا کلب کے لان پر ہوا تھا۔ دوبارہ میں نے اس کے سامنے آکر اسے بے را جانے سے روکا اور تیسری بار اسٹیشن فور کے گاڑڈ روم میں اس سے پوچھ گچھ کے لیے مجھے اس کے سامنے جانا پڑا۔ وہ اپنی جان بخشی کے لیے ہم سے جتن بھی وعدے کر لیتا۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

رستم ایرانی ایک خطرناک سفید پوش بد معاش تھا۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا کوئی آدمی اس کے حکم سے سر تابی کرے۔ جب تک موئی ہماری خفیہ تحویل میں تھا، رستم کو پوری شد و مد سے اس کی تلاش تھی۔ ایک مرتبہ وہ آزاد ہو جاتا تو رستم ہر قیمت پر یہ جاننا چاہتا کہ موئی نے مقررہ وقت پر بمبرانہ پہنچ کر اس کی حکم عدولی کیوں کی۔

موئی کے لیے اپنے باس کا باؤ ناقابل برداشت ثابت ہوتا اور وہ ہم سے کئے ہوئے ہر وعدے کو فراموش کر کے پوری کمائی اس کے سامنے اگل دیتا۔ رستم کے ذریعے وہ قصہ مجرب بخشی تک پہنچتا تو اس کا یہ شبہ یقین میں بدل جاتا کہ کرل بتال دستی ڈینی ہی کا دوسرا روپ ہے۔

وہ میرے لیے خطرناک موڑ ہو تا کیونکہ اورائن ڈی ہنٹ نے کرل بتال دستی کے روپ میں میرے فنگر پر ٹپس حاصل کئے ہوئے تھے جو امریکی ریکارڈ کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ میرے اصل روپ اور بہو پ کا ابہام یقین میں بدلتے ہی میرے لیے خطرات اور اندیشوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو سکتا تھا جس سے بچنے کے لیے موئی جیسے ہسٹری شیٹر اور قاتل کی ہینٹ دینے میں کوئی قناعت نہیں تھی۔

اس بارے میں میری تائید حاصل کرنے کے بعد اول خان

وہ بہت کٹھن اور نازک مرحلہ تھا جو اپنی تمام تر جذباتیت کے باوجود میری دانست میں آرام سے گزر گیا۔ میں نے اس کی پشت پر چند زوردار ہتھکیاں دیں اور طبیعت کا اہال ختم ہونے پر وہ چند لمحوں بعد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں بھیگی چکی تھیں۔ غزالہ جو ذرا سی دیر پہلے اس کی باتوں پر اپنی ہنسی روک رہی تھی، اس منظر کی تاب نہ لا سکی اور دوپٹے میں منہ چھپا کر خاموشی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

”آئندہ اپنے مرنے کی بات منہ سے نہ نکالنا“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے روٹھے روٹھے انداز میں بولا ”میرا بھیدہ جھل جاتا ہے۔ یہ تمہارے دشمنوں کی بددعا میں ہیں، انہیں اپنی آرزو مت بنایا کرو۔“

”تم بھی اکھڑی اکھڑی باتیں نہ کیا کرو۔ دنیا سے کٹ کر ہم چند ہی تو ایک دوسرے کے ہمدرد رہ گئے ہیں۔ ہم نے آپس میں ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا تو ہمیں کون پناہ دے گا۔ باہر کی دنیا میں ہر طرف ہمارے دشمن ہی دشمن پھیلے ہوئے ہیں جن کی ایک نشانی تمہارے گاڑڈ روم میں بند ہے۔“

میری زبان سے موئی کا حوالہ سنتے ہی وہ جیسے ہڑوا کر ہوش میں آتے ہوئے بولا ”رستم بہت بیچ والا آدمی ہے۔ پولیس نے بہت اعلیٰ سطح پر یہ چھان بین شروع کر دی ہے کہ پچھلی رات کینٹ اسٹیشن کے قریب کس انجینی نے کارروائی کی تھی۔ میں نے انہیں گورا جواب دے دیا ہے۔“

”پولیس والے اتنے با اختیار کیسے ہو گئے کہ انجینیوں کے خلاف تحقیقات کر سکیں؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”وہ یہ جرات نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اسے رکی چھان بین اور معلومات کے باہمی تبادلے کا نام دیا ہے“ کام کی باتیں شروع ہوتے ہی اول خان تیزی سے غافل ہوتا جاتا تھا۔

”معلومات کے اس تبادلے سے وہ کیا نتائج حاصل کرنا چاہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی نامعلوم آدمی نے ایک ہوائی فائر کیا اور غائب ہو گیا۔ کوئی زخمی ہوا نہ کسی اور واردات کا کوئی گواہ ملا۔ یہ ایک عام سا واقعہ تھا۔ ایسے واقعات پر پولیس ایسی سرگرمی نہیں دکھاتی ابھی تک کسی نے موئی کی گمشدگی کی ایف آئی آر بھی درج نہیں کروائی۔ یہ چھان بین رستم کے لاڈلے کر رہے ہیں۔ وہ جانتا چاہتے ہیں کہ موئی اس وقت کس کی تحویل میں ہو سکتا ہے۔“

”رستم کے ہاتھ واقعی لمبے ہیں جب ہی وہ شہر میں اپنی سڈیکٹ چلا رہا ہے۔“

”بہت اچھا ہوا کہ موئی کو تم تینوں نے اٹھایا تھا۔ میرے آدمی یہ کام کرتے تو اسے کمرے سے اٹھا کراہتے۔ ان کی کارروائی کا کوئی ریکارڈ نہ ہونے کے باوجود پولیس کو ہوش کے عملے سے چٹا چل جاتا کہ موئی کو لے جانے کے لیے۔“

اس کے جاتے ہی ویرا اپنے کمرے سے لوٹ آئی اور بولی۔
”مکان کا بندوبست کرنے میں اول خان کو نظر انداز کر کے ہم نے
سنگین غلطی کی تھی۔ اس کا سامنا ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ
وہ اس تذکرے پر بھڑک اٹھے گا۔ میں وہ قصہ سرے سے گول کرنا
چاہ رہی تھی۔“

”مگر اس میں قطعہ لگانے والی کیا بات تھی؟“ میں نے
ناخوشگوار سی سے پوچھا۔

”کم از کم میرے لیے وہ پوزیشن ایسی ہی ہو گئی تھی۔ تم نے
پوری بات بتانے کے لیے خلوص سے تنہید باندھی اور وہ تم پر ہی
چڑھ دوڑا۔“

”وہ بہت بگڑ گیا تھا۔ تمہاری ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا
تھا۔“

”غزالہ نے مجھے سب بتا دیا ہے“ وہ پھر ہنس پڑی۔ ”تم نے بہت
خوب صورتی سے بات سنبھال کر اسے اعتماد میں لیا ہے۔ کم از کم
میرے ذہن پر سے ایک برا بوجھ اڑ گیا ہے۔“

”وہ بہت مخلص انسان ہے۔ اس سے بچے درپے جھوٹ بولتے
ہوئے میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا۔“

”جھوٹ کا سہارا لیے بغیر اسے رام کرنا ممکن نہیں تھا۔ انجام
بخیر ہو تو ہر بات جائز ہو جاتی ہے۔ تم نے جھوٹ بول کر اول خان کی
دل جوئی کی ہے۔ یہ جھوٹ قابل ملامت نہیں“ قابل احترام تھے۔
غزالہ نے تمہاری زبردست قلابازیوں کے بارے میں مجھے ہر بات
بتا دی ہے۔“

اس روز میں اپنے ذہن کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے
اول خان سے جو باتیں کہیں وہ ہمارے درمیان نہیں ہوئی تھیں
لیکن میرے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ضرور اچکی ہوئی تھیں۔
غبار صاف ہو جانے کے بعد سب کے ذہن خوب کام کر رہے تھے۔

شام کو اول خان آیا تو اس کا مؤذن بہت مزہ ہو چکا تھا۔ مجھنے
دل سے صورت حال پر غور کرنے کے بعد شاید اس نے اس
حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہمارے فطری تقاضوں
کے عین مطابق تھا۔ لمبے عرصے تک ہم سب کا ایک جا رہا ایک
مثالی خواب تو ہو سکتا تھا لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔

اس کے آدمیوں نے پنڈت منوہر لال اور موہنی پنڈت کے
بارے میں خاصی محنت کی تھی۔

پنڈت اور اس کی بیٹی کی نجی زندگیاں بہت گندی اور گھناؤنی
تھیں۔ وہ باتیں مجھے موہنی سے بھی معلوم ہو چکی تھیں۔ ایسی فی
انیف دانوں نے اپنی چھان بین میں ان واقعات کو زیادہ گہرائی تک
کر دیا تھا۔ یہ بات ہر شک و شبہ سے بالا تھی کہ پنڈت کو اپنی اکلوتی
اور خوب صورت بیٹی سے والہانہ محبت تھی۔ شاید دس سال پہلے
بیوی کی رفاقت سے داکڑی محرومی سے بیٹی کے لیے اس کی محبت گہری
ہو گئی تھی۔

اعتدال انسان کی زندگی کا سب سے سہرا اور کامیاب اصول
ہے۔ اعتدال برقرار نہ رہے تو انسان کو اذیت ناک تجربات کے
لیے جنم کے سفر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی حقیقت جاگتی دنیا اس
کے لیے جنم کا نمونہ پیش کرنے لگتی ہے مگر بیٹی کے لیے پنڈت کی
پدرانہ محبت میں بے اعتدالی نے ان دونوں میں سے کسی کے لیے
کوئی پریشانی پیدا نہیں کی تھی۔ وہ اپنی اپنی جگہ بہت خوش تھے۔

پنڈت رنگین مزاج آدمی تھا۔ اس نے موہنی کے لیے حد سے
بڑھی ہوئی محبت میں اسے وہ بے شمار آزادیاں دی ہوئی تھیں جن
سے وہ خود فیض یاب ہو تا رہتا تھا۔ دونوں ایک ہی رنگ میں رنگے
ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے دانستہ چشم پوشی
کرتے تھے لیکن ان کی صحبتوں سے لطف اندوز ہونے والے نجی
خود احتسابی کے نادر لحاظ میں پنڈت اور موہنی کو عبرت کا مرجع
قرار دیتے تھے۔

ان کے پاس شرم، حیا، عزت اور ساکھ کا کوئی روایتی تصور
نہیں تھا۔ رنگارنگ لوگوں کے جھوم میں سرمستی کی زندگی بسر کرنا
ان کا مشن تھا اور وہ اس میں کامیاب تھے۔ ان کے دوست اور
احباب ان کے منہ پر ان کی دریاہلی، احباب نوازی اور آزاد روی
کی تفریض کرتے نہیں سمجھتے تھے۔ پیٹھ پیچھے وہ جو بھی کہتے ہوں،
انہیں اس کی پروا نہیں تھی۔

پنڈت بہت ہی شہری اور دیکھی جا کر آدموں کا مالک تھا جن کے
کراہوں سے ہونے والی خطرہ آئنی کے بعد اسے کسی کام کاج کی
ضرورت نہیں تھی مگر وہ پھر بھی کاروباری لین دین کے ذریعے
دونوں ہاتھوں سے دولت بٹور کر اسے اپنی من پسند رعیتوں پر لٹاتا
رہتا تھا۔

وہ کاروبار کے بجائے صرف کاروباری لین دین کرتا تھا کیونکہ
شہر کے تجارت پیشہ گھرانوں میں تعلیم کا رچان کم تھا۔ بچے کو ہوش
سنبھالتے ہی موروثی کاروبار میں لگا دیا جاتا تھا۔ دوسرے کاروباری
وہ تھے جو تعلیم کے میدان میں منہ کے بل گرنے کے بعد کوئی نہ کوئی
دھندا چلانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

اس پھیر میں پڑے لکھے لکھانے والے بھی پائے جاتے تھے
لیکن ان کی تعلیم بس تقلید سند پر رکھی ہوئی تھی۔ عملی طور پر کوئی
سند ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ کاروبار میں اکثریت ایسے ہی
لوگوں کی تھی۔ وہ انکم ٹیکس اور دوسرے سرکاری چکروں کی وجہ
سے بینکوں سے لین دین کرنے سے گھبراتے تھے اور بھاری ہمانہ
شرحوں پر کھلی منڈی کے مہمانوں سے بڑی رقمیں لینے کو ترجیح دیتے
تھے۔

سوچہ بوجھ رکھنے والے تاجر ایسے مہمانوں کو نفرت کی نگاہ
سے دیکھتے ہیں اور تجارت سے انہیں سود خور قرار دے کر بینکوں
سے کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں مگر دوسروں کے لیے پنڈت منوہر لال
جیسے لوگ ایک برا سہارا تھے۔ بینک کی بند روٹیں فیصد سالانہ شرح

”غور ضرور کرو مگر یہ نہ بھولو کہ موسیٰ معمولی پڑھا لکھا اور بہت کم رتبے کا آدمی ہے۔ وہ موہنی کا محافظ تھا۔ اسے پنڈت کی پارٹیوں کی اتنی زیادہ تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟ موساد والوں کی شناخت ان کی پیشانی پر نہیں لکھی ہوئی کہ ہر ایرانفر! تھو خیرا انہیں پہچان لے۔“

”تم پیشہ گمری جزئیات پر نگاہ رکھتے ہو۔ تمہارے اعتراض میں وزن ہے۔“

”اگر وہ سچا ہے تو ہمیں پنڈت کے گھر سے اس کے کرتوتوں کا کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور ملے گا۔“

”وہ اپنی جان بچانے کے لیے کیا اس کر رہا ہے“ میری بات اول خان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

”ہمیں بے لاگ انداز میں ہریات کے شبت اور مٹنی پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ میری رائے غلط ہو اور وہ سچ بول رہا ہو۔“

”اس کا بہت کم امکان نظر آتا ہے“ اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

”یہ دو سرا پہلو ہے۔ ہم اسے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ میں نے اسے سمجھایا ”وہ چوبیس گھنٹے گھر میں رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کسی اور ذریعے سے یہ باتیں معلوم ہوئی ہوں۔“

روشن خیال گھرانوں کے مکین اپنے مسکین نظر آنے والے گھریلو ملازمین کو عام طور پر زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ان کو گونگا، بھرا سمجھتے ہوئے، ان کی موجودگی میں بھی اپنی گفتگو کے تسلسل میں فرق نہیں آنے دیتے۔ شام کو یا رات کو جب کسی مخصوص مقام پر ان خانگی ملازمین کی چوپال جھتی ہے تو بے احتیاطی سے کسی ہوئی بہت سی باتیں سینہ بہ سینہ گھر سے باہر نکل کر دوسروں تک پہنچ جاتی ہیں۔

گھر کے اندر اور باہر کام کرنے والے ملازمین میں بھی قریبی ربط ضبط ہوتا ہے۔ ایک خدمت گار کوئی چوکا دینے والی نئی بات سنتا ہے تو اپنے ساتھیوں میں اپنی برتری اور اہمیت بتانے کے لیے وہ اہم بات ہر طرف پھونک دیتا ہے۔ یہ سلسلہ ہر گھر میں یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

ملازمین کی سطح پر گردش کرنے والی ان سرگوشیوں میں بعض اوقات افواہیں بھی شامل ہو جاتی ہیں لیکن مالگوں کو شاذ و نادر ہی علم ہوتا ہے کہ ان کے کمروں میں ہونے والی باتیں کہیں اور بھی پھیل رہی ہیں۔

گھریلو ملازمین کی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھریلو مال باپ اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر محض روزی کمانے کے لیے دن رات اپنے مالکان کی سیوا کرتے ہیں اور اپنی روزی کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے دن رات ان کی جھڑکیاں اور ڈانٹ بٹٹ سنتے ہیں۔

کے مقابلے میں وہ اپنی دی ہوئی رقوم پر تین چار فیصد ماہانہ سود ضرور لیتے تھے لیکن وہ زبانی لین دین ہوتا تھا جس میں کسی رسید یا کھاتے کا دخل نہیں تھا۔

پنڈت نے اپنی کئی جائیدادیں گروہی رکھ کر بیٹکوں سے بڑی بڑی رقومیں کم شرح پر ادھار لی ہوئی تھیں اور بازار میں وہی رقومیں تین گنا سے بھی زائد شرحوں پر سود میں چلا کر بھاری نفع کمایا تھا۔

جب آمدنی ایسی بے حساب ہو، شوق بے لگام ہوں، مصروفیات رنگین ہوں اور خمیر سویا ہوا ہو تو وہی ہوتا ہے جو پنڈت کر رہا تھا۔

باپ اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر اندھی آمدنی کو ہوس اور خواہشات کے اندھے کنوئیں میں ڈبو رہا تھا۔ وہ خود خوش تھا، اس سے ملنے والیاں خوش تھیں اور موہنی سے ملنے والے بھی خوش تھے۔

وہ پنڈت منور لال کی زندگی کے ایسے پہلو تھے جو بہت سے لوگوں کے علم میں تھے۔ اس کی خفیہ سرگرمیاں جو ہر ایک کی نظروں سے اوجھل تھیں، زیادہ تشویش ناک تھیں۔

دھن راج موہنی کا منظور نظر ہونے کے ساتھ پنڈت کا بھی چیتا تھا۔ دھن راج کی طرح پنڈت بھی اہم اور اعلیٰ عہدوں پر مامور افسران سے گہری دوستیاں رکھتا تھا۔ انہیں اپنی محدود دوتوں میں بلا کر شراب و شباب سے ان کی مسمان نوازی کرتا تھا، ان مدارات کے صلے میں وہ ان سے کیا حاصل کرتا تھا، یہ کسی کے علم میں نہیں تھا۔ یہ سراغ لگانے کے لیے وقت درکار تھا۔

”وہ خطرناک آدمی ہے“ میں نے اول خان کی زبانی وہ ساری باتیں سننے کے بعد رائے دی ”اس نے ظاہری طور پر پلے بوائے کا روپ دھار رہا ہے مگر اندری اندر کوئی اور گل کھلا رہا ہے۔“

”گل ضرور کھلا رہا ہے۔ ہفتے میں ایک رات وہ چند گھنٹوں کے لیے بھرا ضرور جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہر رسم جیسے جرائم پیشہ شخص سے اس کا کیا مفاد وابستہ ہے جو رات گئے اسے خود گاڑی چلا کر بسرا جانے پر مجبور کر دیتا ہے؟ میرے آدمی اس پر کام کر رہے ہیں۔“

”کیا وہ ہمیشہ رات گئے ہی رسم کے پاس جاتا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نی الحال یہی معلوم ہوا ہے۔ ایک دو روز میں سب واضح ہو جائے گا۔“

”بے فکری کی زندگی گزارنے والا شخص ایسے پر اسرار رابطے کیوں رکھتا ہے؟ سرکاری افسر، سفارت کار اور مجرم، یہ سب ہی اس کے دوست ہیں۔ ان کی درمیانی کڑی وہ خود ہے۔“

”ہمیں موسیٰ کی بات پر غور کرنا ہوگا“ اس نے سنجیدگی سے کہہ ”ہو سکتا ہے کہ اس نے موساد کے انجینئرس سے پنڈت کے میل جول کی کمائی محض جان بچانے کے لیے نہ گھڑی ہو۔“

وہ سفاکی سے بولا۔

”وہ آخری علاج ہے۔ فی الحال نگرانی کراتے رہو“ میں نے اسے سمجھایا ”اس طرح وہ تمہاری نظروں میں رہے گا۔ اگر وہ سیرا کارخ کرے تو اس کے خلاف قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔“

”یہ ہو سکتا ہے“ اول خان نے سہلایا ”مجھے اس کی جان لینے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ تمہارے لیے خطرہ نہ بنے پائے۔ یہ مقصد اس طرح بھی پورا ہو جائے گا۔“

”موسیٰ کہاں ہے؟ اس کے بارے میں تم نے کیا طے کیا ہے؟“ مجھے وہ سوال یاد آگیا۔

”آج اس کی آخری رات ہے۔ لاش اس کے پرانے علاقے میں ڈال دی جائے گی۔“

”اسے بھی زندہ رکھو۔ جب تک اس کی لاش نہیں ملتی، رستم اس کی بازیابی کے بارے میں پرامید رہے گا۔ لاش ملنے کی تو اس کا موڈ بگڑ جائے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اوہلی والے کام سے انکار کر دے۔“

مقررہ وقت سے پہلے سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ رستم نے مجھے فون کرنے کے لیے کوئی خاص وقت نہیں دیا تھا۔ بس شام کا ذکر کیا تھا مگر میں نے اس کام کے لیے اپنے طور پر سات بجے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سات بجے میں اول خان کے ساتھ اس کے دفتر میں موجود تھا۔ فون ملنے پر دوسری طرف سے رستم کے کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔

”میں ملک ممتاز بول رہا ہوں۔ مجھے رستم سے ضروری کام ہے“ میں نے اپنا تعارف کرایا۔

”ہولڈ کرو!“ اس آواز کے بعد چند ثانیوں کے لیے لائن پر سکوت چھا گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ لائن ملارہا ہو گا مگر ایک لمبے سکوت کے بعد وہی آواز دوبارہ ابھری ”ملک ممتاز اور ملک افضل..... تم کل بھی آئے تھے؟“

”ہاں“ وہی سلسلہ ہے۔ رستم نے آج فون کرنے کے لیے کہا تھا“ مجھے اس کی باز پرس پر غصہ آنے لگا۔

اس مرتبہ ریسپور پر ہنگامی پلوچی موسیقی سنائی دینے لگی۔ وہ اپنے ایکس چینج کے ذریعے رستم سے لائن ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک موسیقی کی آواز منقطع ہو گئی اور وہی آدمی پھر لائن پر آگیا۔

”سات بیٹی لے کر دو بجے سے پہلے یہاں آ جاؤ۔ کام ہو جائے گا“ اس نے کہا۔

”یہ سات بیٹی کا کیا مطلب ہے؟ تم رستم سے میری بات کیوں نہیں کراتے؟“

”ایک بیٹی ایک لاکھ، سات بیٹی سات لاکھ“ اس نے نگرانی سے کوئی نام نہ نہ

ان کی زندگی میں سنسنی اور دلچسپی کا ایک ہی پہلو ہوتا ہے کہ وہ اپنے قابل رشک مالکان کے رازوں سے ایک معصومانہ سی باخبری حاصل کرتے رہیں اور پھر اسے بڑھا چڑھا کر اپنی کمائیوں سے دوسروں کو مرعوب کر سکیں۔ مالک ان کے خوابوں کے شہزادے ہوتے ہیں جنہیں ہر وہ آسائش اور سہولت حاصل ہوتی ہے جو ان کے خوابوں میں تاجپتی رہتی ہے لیکن عمر بھر وہ اسے نہیں پاسکتے۔ ان کے لیے ایسے شہزادوں کے قریب رہنا اور ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی چرا سرار آرزوؤں میں سلگتے رہنا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

بات کا دوسرا رخ ایک لمبی بحث کے بعد آخر کار اول خان کی سمجھ میں آئی گیا اور وہ قائل ہو گیا کہ موسیٰ کے بیان کی تردید یا تصدیق کے لیے پٹنٹ منور لال کی خانہ تلاشی ضروری تھی۔

”موسیٰ کے چکر میں بڑ کر ہم ملک کو بالکل ہی بھول بیٹھے ہیں۔“ اس موضوع کے سنبھلنے ہی اول خان کو رستم کے دوسرے آدمی کا خیال آگیا۔

”شاید موسیٰ اس سے زیادہ کار آمد ثابت ہوا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ ہم گدھے کے ساتھ جج کو بھی نہیں لائے ورنہ ہمیں اس کی ہسٹری شیٹ پر بھی غور کرنا پڑ جاتا۔“

”اس وقت صرف وہی ایسا مجرم ہے جو تمہیں کرل جمال دستی کی حیثیت سے پہچان سکتا ہے“ اول خان نے بتایا۔

”تم مجر بخشی کو بھول رہے ہو۔ اس بہروپ کی ابتدا کا ذمہ دار وہی ہے۔“

”بخشی ایک مختار سفارتی افسر ہے۔ شہر میں اس کی نقل و حرکت بہت محدود ہے مگر ملک سے کہیں بھی تمہارا سامنا ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ رستم کا آدمی ہے۔“

”چند روز کی بات ہے۔ میرے چہرے پر کچھنی داڑھی اگ آئے گی تو وہ بھی مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ اس وقت تک میں ذرا سی احتیاط کر لوں گا۔“

”آج تم رستم کو فون کرو گے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں سیرا کارخ کرنا پڑ جائے۔ ملک وہاں موجود ہوا تو تمہیں واپسی کی راہ بھی نہیں مل سکے گی۔“

”رستم اپنے آدمیوں کو اپنے گھر سے دور رکھتا ہے“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”پھر بھی اس نے موسیٰ کو وہاں بلایا تھا۔ موسیٰ غائب ہے۔ موسیٰ کا اتنا پتا لگانے کے لیے ملک کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

”احتیاط اچھی ہوتی ہے۔“ میں اس سے متفق ہو گیا ”جب تک میرا اور رستم والا قصہ طے نہیں ہو جاتا، ملک کی نگرانی شروع کر دو۔“

نگرانی سے کوئی نام نہ نہ

وقت بات نہیں کر سکتے۔ یہ پیغام ان ہی کی طرف سے ہے۔
 ”تو کیا آج ہی دو بجے سے پہلے آنا ضروری ہے؟“ میں نے
 اول خان کی طرف دیکھتے ہوئے انھیں آمیز لہجے میں پوچھا ”اس نے کم
 وقت میں اتنی بیٹیوں کا بندوبست کرنے میں دقت ہو سکتی ہے۔“
 ”جو ہوتا ہے وہ بندوبست کر لو۔ باقی باتیں خود آکر
 کر لیتا..... یوں کس وقت آؤ گے؟“

”گیارہ بجے!“ میں نے درے درے توقف کے بعد کہا ”اس میں
 ذرا سی دیر سویر ہو سکتی ہے۔“

”گیارہ اور بارہ کے بیچ تمہارا وقت ہے۔ آدیا زو خیال کر کے
 آنا۔ آج کل موسم ذرا خراب ہے۔ چنی چور مال کی بو سونگھتے
 پھرتے ہیں“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
 ”دو بجے!“ میرے سننے ہی اول خان نے اپنے منتھوں سے
 ایک گرا سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”یہ دو بجے اور گیارہ بجے کا
 کیا چکر تھا؟“

”معلوم ہوتا ہے رستم ایرانی کسی آلہ کی اولاد ہے۔ اس نے دو
 بجے سے پہلے بلایا تھا۔ میں نے گیارہ کا وقت دیا۔ اب گیارہ اور بارہ
 کے درمیان میرے لیے وقت مقرر ہے۔“
 ”یہ بیٹیوں کا کوڑا شاید رقم کے لیے تھا؟“ اول خان نے تائید
 طلب لہجے میں پوچھا۔

”تم ایسی بجرمانہ اصطلاحات سے خاصے باخبر ہو۔“ میں ہنس کر
 بولا ”رقم آج ہی ادا کرنی ہے۔“

”آج؟“ اول خان فکرمند ہو گیا ”میں نے سری بھیجی ہوئی
 ہے۔ رقم ملنے میں چند روز لگیں گے۔“

”اوہ!“ میری حیرت اور خوشی کا ٹھکانہ رہا ”تو کیا یہ رقم ایس
 ٹی ایف ادا کرے گی۔“

”بالکل۔ اور اہن تمہارا نہیں اس ملک کا دشمن ہے۔ اس
 کے سر کی قیمت یہ ملک ہی ادا کرے گا۔“

”پھر پروا مت کرو۔ میں ابھی جمانگیر کی طرف جاتا ہوں۔
 ڈالروں میں نوٹ بہت کم ہوں گے۔ رستم خوش ہو جائے گا۔ میں
 سلٹی سے رقم لے کر رستم سے ملنے کے بعد ہی واپس آؤں گا۔
 تمہیں فنڈز مل جائیں تو تم سات لاکھ کا اوجھار ادا کرو۔ اس وقت
 لوہا گرم ہے۔ اور اہن کے کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

میں نے رستم کے آدمی کو بتا دیا تھا کہ پوری رقم کے بندوبست
 میں دیر ہو سکتی ہے اور اس نے مجھے ہیرا آکر رستم سے بات کرنے کا
 مشورہ دیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ایسے کاموں میں پوری رقم کی پیشگی
 ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ رقم دینے میں تاخیر کا مطلب اور اہن
 کے فتنے کو زیادہ دیر پالنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

مجھے معاوضے کے تین تین میں رستم کی ایمان داری نے کافی
 تاثر کیا تھا۔ اس نے مجھے سات سے دس لاکھ تک کا تخمینہ دیا تھا
 اور میں نے سیر جیسی کے ساتھ اس کی ادائیگی پر اپنی رضامندی ظاہر

کر دی تھی۔ اس کے باوجود رستم نے اپنے تخمینے کی سب سے کم رقم
 طلب کی تھی۔ اس مطالبے سے ثابت ہو گیا تھا کہ رستم اپنے گاہک
 کی جیب دیکھ کر معاوضہ لینے کے بجائے کچھ اصولوں کی پاس داری
 کرتا تھا اور شاید ایسے کامیاب تھا۔

رستم سے ملاقات میں دیرا کے لیے سرے سے کوئی گنجائش
 نہیں تھی۔ اس سے ملنے کا حق صرف ملک ممتاز اور ملک افضل کو
 تھا مگر جوں ہی اسے یہ پتا چلا کہ میں جمانگیر کے گھر سے رقم لیتا ہوں
 سلطان شاہ کے ساتھ ہیرا جاؤں گا تو وہ بھی چل گئی کہ اسے اور
 غزالہ کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔

دن میں، میں پورے جلوس کے ساتھ کرائے کے مکان کی
 تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا مگر دونوں عورتوں کو جمانگیر کے گھر چھوڑ
 کر رستم سے ملاقات کے بعد اپنے ساتھ واپس لانے کی تجویز
 نہایت احمقانہ تھی۔ مجھے واپس میں رات کے ڈیڑھ، دو بجے بج سکتے
 تھے اور ایسے نامناسب وقت پر ہم چاروں کا ایک جاہ کو کرشمیں
 گھومنا کسی طرح موزوں نہیں تھا۔

رات کے کھانے تک دیرا رہ کر مجھ سے الجھتی رہی۔ اس
 دوران میں اس نے اول خان کے فراہم کئے ہوئے ذخیرے میں سے
 اسکاچ کی ایک مناسب مقدار اپنے معدے میں اتار لی تھی اس
 لیے اس کے لب دلیجے میں ضد کا عنصر بھی عود کر آیا تھا۔ وہ ہم میں
 سے کسی کی کوئی دلیل سننے یا ماننے کے بجائے اپنی بات منوانے پر
 تلی ہوئی تھی۔

”تم ان دونوں کو جانے دو۔“ اول خان کو نہ جانے وہ تجویز
 کیسے سوچ گئی ”غزالہ کمرے میں آرام کرے گی۔ ہم دونوں موسیٰ
 پر خصوصی سی محنت اور کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی کچھ اور
 بھی اٹکلے گا۔“

وہ نکتہ دیرا کی شمار زدہ کھوپڑی میں سنا گیا۔ وہ رستم اور جمانگیر کو
 بھول کر مسرت آمیز لہجے میں بولی ”رات کا اندھیرا ویسے ہی خوف
 آور ہوتا ہے اور اندھیرے کا تشدد بڑے بڑے سورماؤں کا حوصلہ
 توڑ دیتا ہے۔ یہ کھیل زیادہ برتر ہے گا۔“

میں نے اس کی آواز کی ہر تکرار کا کوئی کلمہ ادا کرنے کے بجائے
 اسی موضوع میں الجھائے رکھنا زیادہ مناسب سمجھا اور کہا ”کبھی
 کبھی تم تشدد سے بہت زیادہ محفوظ ہونے لگتی ہو اور حد سے گزر
 جاتی ہو۔ اسے باری نہ دینا۔ اس گرم موسم میں اسٹیشن فور پر دو
 چار روز تک لاشیں محفوظ رکھنے کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔“

”فکر مت کرو۔“ وہ اپنی ترنگ میں بولی ”وہ مر گیا تو اس کی
 لاش ایدھی کے مردہ گھریں رکھوا دیں گے۔“

”ایدھی والے لاشوں کو چھپانے کا دھندا نہیں کرتے۔
 دارتوں کی توجہ کے لیے فوراً ہی تصویریں خیرا اشتہار جاری کر دیتے
 ہیں۔“ سلطان شاہ نے منہ بنا کر کہا۔

”تم کو جہاں جانا ہے، چلے جاؤ۔ یہ میرا اور اول خان کا مسئلہ

ہو گا۔ اس سے ہم خود نمٹ لیں گے۔“

”تم نے اپنے کمرے کے دو تین پھیرے اور لگا لیے تو کوئی مسئلہ پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں رہو گی۔“ سلطان شاہ چڑ کر بڑا دایا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

ویرا شاید اس کا تبصرہ نہیں سن سکی تھی۔ اس کی روانگی کو اپنی فتح سمجھ کر ہنس دی۔

کھانے کے بعد سلطان شاہ کو ساتھ لے کر مٹی اسٹیشن فورسے نکل کھڑا ہوا۔ جاگیر اور سلسلی سے میری ملاقات کو کافی دن گزر گئے تھے۔ اس جوڑے کے لیے میں اسلام آباد اور لاہور گیا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے آسانی کے ساتھ میری گلو خلاصی نہیں ہو سکے گی۔ انہیں مطمئن کر کے ہی میں اپنی مہم پر روانہ ہو سکتا تھا۔ بلیر چھاؤنی سے کاشن تک کا سفر خاصا طویل تھا مگر سلطان شاہ کی مجلس فطرت اور اس کے پے درپے سوالوں کی وجہ سے وہ فاصلہ باتوں ہی باتوں میں کٹ گیا۔

ذور تیل کے جواب میں ایک کم عمر بچی نے دروازہ کھولا تو میں چونک گیا۔ مجھے بھر کے لیے میرا دل دھک سے رہ گیا کہ کہیں جاگیر نے کسی مجبور کی وجہ سے وہ فلیٹ نہ چھوڑ دیا ہو مگر اسی وقت اندر سے آنے والی، سلسلی کی آواز نے میرے وجود میں اطمینان کی ایک لہری دوڑا دی۔ وہ اس لڑکی کو میرا نام معلوم کرنے کی ہدایت دے رہی تھی۔

”بہنا! بتا دو کہ ہم آئے ہیں۔“ میں نے اونچی آوازیں کہا اور میری آواز پچان کر سلسلی تقریباً دوڑتی ہوئی خود ہی دروازے پر آگئی۔

”ارے“ تم غیروں کی طرح یہاں کیوں رک گئے۔ سیدھے اندر چلے آتے۔“ ہمیں غیر متوقع طور پر اپنے دروازے پر پا کر اس کا چہرہ خوشی سے گلہا ہو گیا تھا۔

میں اس دوران میں کم عمر لڑکی کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ معصوم اور خوب صورت بچی تھی۔ اس کے لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گھر کے کام کاج کے لیے ملازم رکھی گئی تھی۔ اپنی بالکن کی آواز سننے ہی اس نے قدرے جرت سے ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ سلسلی اس قدر جوش میں آئی ہوئی تھی کہ ہمارے داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

سلطان شاہ میرے ساتھ سلسلی کے تپاک کی وجہ سے جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ لڑکی نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دروازہ بند کر دیا۔

”تم لاہور سے کب آئے؟ وہاں سے پلٹ کر دوبارہ فون بھی نہیں کیا۔ گئے تھے تو میرے میکے والوں کے ساتھ میرے بیٹے کو بھی دیکھ آتے۔ تمہارا خون بالکل سفید ہو گیا ہے۔“

”تم نے ایک ہی سانس میں شکوں کا دفتر کھول دیا۔ ہمیں اندر بیٹھنے دو۔“ میں نے احتجاج کیا ”میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے

ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔“

”سلطان شاہ بھی اپنا ہے“ اسے سب معلوم ہے۔ تم اس کے بعد رو بننے کی کوشش مت کرو۔“

سلطان شاہ کچھ کے بغیر بے بسی سے دانت نکال کر رہ گیا۔ ”سلسلی!“ خواب گاہ سے جاگیر کی بو بھل آواز گونجی ”کون آیا ہے جو اتنا جھک رہی ہو۔“

”آ رہی ہوں۔ خود دیکھ لینا کہ میرا کوئی نہیں آیا۔ دونوں تمہارے ہی جگہ دوست ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم نے یہاں آنے کے لیے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے۔“ سلطان شاہ نے خفیف سی مگر اہٹ کے ساتھ معذرت کی ”ویسے بھی ہمیں فون کر کے آنا چاہیے تھا۔“ ”وہ شام کو بلانا نہ پیتے ہیں۔“ سلسلی نے منہ بنا کے کہا ”فون کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“ پٹنے کے بعد وہ ایسی ہی جلی جلی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اندر آ کر خود دیکھ لو کہ کیا ہو رہا ہے۔“

جاگیر نے اپنی خواب گاہ میں ساں باندھنے کے لیے دھبی روشنی جلائی ہوئی تھی اور کیٹ پیٹر پر ہلکی آواز میں جگمگت سگھ کی کوئی غزل چل رہی تھی۔ وہ خود کنگ سائز بیڈ پر پھیلا ہوا تھا اور کسی موالی کی طرح دونوں ہتھیلیوں کے درمیان اسکاچ کا گلاس دبائے ہوئے تھا۔

ہمیں پہچاننے کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر خاصا زور ڈالنا پڑا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ”اے تو!“ کا نعرہ لگایا اور مسہری پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کھڑے کھڑے اپنے گلاس میں بچی ہوئی اسکاچ غنائت حلق سے اتاری اور گلاس مسہری پر ڈال کر میری طرف چھلانگ لگا دی۔

سلسلی میرے پیچھے تھی۔ میں دانت ایک طرف سرک گیا اور جاگیر کو بھٹکنے کے لیے مجبوراً سلسلی کو اپنے بازوؤں میں لینا پڑ گیا۔ ”توبہ! دور نہیں.... منہ سے ایسی بدبو آ رہی ہے کہ داغ پینا چاہا ہے۔“ سلسلی نے ناک منہ چڑھا کر اسے اپنے بدن سے دور دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تم خود دور ہو۔“ کیوں میرے راستے میں آئی ہو۔“ جاگیر اس پر غرایا ”تمہارے پسینے میں سے اب ظلم کی بدبو آنے لگی ہے۔ تم بہت سفاک اور خود غرض ہو۔“

”میں جیسی بھی ہوں، تم سے اچھی ہوں۔“ سلسلی لڑا کا انداز میں بولی ”کوئی سفاک عورت کی ہوتی تو اب تک دس دفعہ لات مار کر اپنے گھر بیٹھ چکی ہوتی۔“

”دو دفعہ تو تم بھی بھاگ کر اپنے جیتے اور لاڈلے بھائیوں کے پاس جا چکی ہو۔ پھر کیوں آگئیں؟ میرے سینے پر مونگ دلے!“ جاگیر نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”دیکھ لو.... یہ نشے میں ایسی ہی باتیں کرنے لگتے ہیں۔“ سلسلی رو ہانسی ہو گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بے بات کی لڑائی تھی جو ہمارے پیچھے ہی اچانک شروع ہو گئی تھی۔ میں نے جہانگیر کو مسمری کی طرف لے جاتے ہوئے پکارا ”کیوں بلاوجہ بیوی سے لڑ کر اپنا موز اور نشہ غارت کر رہے ہو۔ سلطان شاہ تمہارے بارے میں اپنے دل میں کیا سوچے گا۔“

سلطان شاہ خواب گاہ کا خراب موسم دیکھ کر باہر نکل چکا تھا۔ سلی تیز سرگوشیاں آوازیں بولی ”نہیں اب کسی کی شرم اور پروا نہیں ہے۔ میں نے جب سے گھر کے کام کے لیے ایک بچی رکھی ہے، یہ انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔“

”یار تم خود غور کرو۔ اپنا پیچہ لاہور بھیج دیا ہے اور پرانی بچی پر ظلم کر رہی ہے۔ وہ مسیحی سی جان جب اپنی بساط سے بڑے بڑے کام کرتی ہے تو میرا دل کٹنے لگتا ہے۔“

”بھئی کہتے ہیں کہ چائلڈ لیبر اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے، کبھی اسی الزام میں مجھے پولیس سے پکڑوانے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ میں ہر وقت کے اس عذاب....“

جہانگیر نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی اور مسمری پر پہلو بدل کر مجھ سے بولا ”تم خود اس جاہل عورت کو بتاؤ کہ کیا میں غلط کرتا ہوں۔“

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سلی ہمارے قریب آکر زہریلے مگر سرگوشیاں بولنے میں بولی ”یہ سب جھوٹ اور فراڈ ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس بچی کو نکال کر کوئی جوان اور خوش شکل لڑکی رکھ لوں تاکہ میری زندگی کا رہا سا سکون بھی غارت ہو سکے۔ جب وہ بچی سامنے آتی ہے، یہ دانت پیٹنے لگتے ہیں۔“

پوری صورت حال واضح ہوتے ہی مجھے جہانگیر پر غصہ آگیا۔ میں نے قریباً نظروں سے اسے گھورا تو اس کے چہرے پر غصے کی جگہ یکایک تیزی برسنے لگی تھی۔

”میں ختم کھاتا ہوں کہ یہ جھوٹی ہے۔ میں نے کبھی جوان اور خوب صورت نوکرانی کے لیے نہیں کہا۔ بس اڑ بڑی ہو.... اتنی بڑی کہ وہ کام کرے تو اس پر رحم نہ آئے۔“ اس نے نشے میں قسم کو ختم بنا دیا تھا۔

”یہ ننتہ تم نے خود پایا ہے۔“ میں نے سلی کو لڑا ”جھوٹی نہ بڑی۔ تم دو آدمیوں کا کام کھاتا ہوتا ہے۔ تمہیں کسی ملازمہ کی کیا ضرورت ہے؟“

”میں تو اس کے لیے بھی تیار ہوں مگر یہ اڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ متبادل بندوبست کے بغیر یہ بچی نہیں جائے گی۔ انہیں کون سمجھائے گا؟“

”ہمیں ملازمہ کی ضرورت ہے۔“ جہانگیر نے پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ”وہ گھر کا کام سنبھال لے تو سلی میری دیکھ بھال کے لیے زیادہ وقت دے سکتی ہے، باہر کے کام

سکون سے کر سکتی ہے۔ اس سے ہمارے درمیان خلعت پیدا ہو سکتی ہے۔“

”خلعت نہیں، وہ مغاہمت ہوتی ہے۔“ میں نے اسے پھینکا ”ملازمہ بدل کر تم سلی کے لیے روزیہاہر کے کام نکالو گے۔ سلی تمہیں ٹھیک سمجھتی ہے۔ نشے میں بھی تمہیں اپنے مطلب کی باتوں کا ہوش رہتا ہے۔ تم کے بدمعاش ہو۔ اور ہر وقت نئے نئے گل کھلانے کے چکر میں رہتے ہو۔“

سلی نے مجھے اپنا ہم نوا پایا تو کمرے سے چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ میں جہانگیر کو لعن طعن کرنے کا فریضہ زیادہ بستر انداز میں سر انجام دے سکتا ہوں۔

”سالی کو جلانے میں برا مڑا آتا ہے۔“ سلی کے چلے جانے کے بعد جہانگیر مجھے آنکھ مار کے مسکرایا ”تم ذرا سی دیر میرا ساتھ دیتے تو میں اسے جلا کے راگھ کرتا۔“

”ساتھ دینے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ تمہاری ہر بات سے بدینتی نپک رہی تھی۔ گھر کے نوکروں کے لیے تم کو پولیس اور اقوام متحدہ کے قانون یاد آ رہے ہیں۔“

”آئیڈیا زبردست ہے۔“ اس نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی ”گھر ہی میں کوئی مناسب بندوبست ہو جائے تو آدمی کو ادھر ادھر بھاگنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم سلی کو پنی پدھاؤ گے تو وہ مان جائے گی۔ میرے ساتھ ہر بات میں ضد اور بحث پر اتر آتی ہے۔“

”بھول جاؤ.... وہ مر کر بھی تمہاری خواہش پوری نہیں کرے گی۔ اسے تم پر ارد پر سفیدی کے برابر بھی بھروسہ نہیں ہے۔ وہ اپنا گھر بگاڑنے کی غلطی نہیں کرے گی۔“

”نوکرائیاں کسی ہوشیار عورت کا گھر نہیں بگاڑ سکتیں۔ زیادہ سرچھنے سے پہلے ان کی کچھنی ہو جاتی ہے۔ سال چھ مہینے میں ایسی ادل بدل زندگی میں یکسانیت نہیں آئے دیتی۔“

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں تیزی سے پلانا تو کھلے ہوئے دروازے میں سلطان شاہ کھڑا ہوا تھا۔ شاید وہ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنے کا خواہاں تھا۔

میں نے دھندلائی ہوئی خواب گاہ میں دو بلب روشن کیے اور اس کی طرف بڑھ گیا۔

”ہم یہاں کے ان کے بھگڑے نمٹانے نہیں آئے۔“ قریب پہنچنے پر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی ”کیا رہ بجے ہمیں رقم لے کر رستم کے گھر پہنچنا ہے۔“

”حقیقت یہ تھی کہ میں اس وقت تک وہاں آمد کے مقصد کو بھولا ہوا تھا۔ سلطان شاہ کی یاد دہانی پر میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور وہ مٹا ہوا انداز میں سہلا کر ڈر اسٹنگ روم کی طرف چلا گیا۔

”کیا کہتے آ رہا تھا۔“ جہانگیر نے سات رینگے ہوئے دو گلاسز میں اسٹائٹ لائٹ پیٹنے ہوئے پوچھا۔

”اسے پیشاب آ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے دوسرا خالی گلاس سائینڈ نیبل سے اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔
 ”یہ کیا بددقتی ہے؟“ جہانگیر نے ناراضی سے پوچھا ”کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟“

”آج نہیں.... اب تو میں کراچی میں ہوں۔ فرصت کے وقت محفل بنے گی۔“
 ”تو کیا تمہیں اس وقت فرصت نہیں ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”غزالہ اور ویرا کو ہوٹل میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ رات گئے کسی مرد کے بغیر یوں ہوٹل میں رہنا پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ میں ذرا جلدی انھوں گا۔“
 ”انہیں ہوٹل میں کیوں چھوڑا؟ کیا یہ گھر موجود نہیں تھا؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”پہلے ہم یہاں رہ چکے ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا ”گلاب میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ شرمیں ہر وقت میری دشمنیاں چلتی رہتی ہیں۔“

وہ میرے اٹھائے ہوئے گلاس کو بھول گیا اور اپنی اسکاچ میں آکس پاٹ سے بج بڑے پانی انڈیلنے لگا۔ اسی دوران میں اس نے پوچھا ”تمہاری ہوٹل بازی کب تک چلے گی۔“

”ہم کل کراچی پہنچے تھے۔ آج میں نے ایک مکان دیکھ لیا ہے۔“ مجھے فوراً ایک شاندار بارمانہ سوجھ گیا ”اسی کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ ہماری امانت تو محفوظ ہے نا؟“

”ہر وقت سسلی کے ازار بند میں لٹکی رہتی ہے۔“ اس نے اپنے گلاس سے توجہ ہٹائے بغیر بے ساختہ جواب دیا ”اس سے زیادہ محفوظ جگہ اور کیا ہو سکتی ہے....“

”عجیب بے ڈھب اور بونگے آدمی ہو۔“ مجھے طرارہ آگیا اور میں نے اس کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی ”اپنی بیوی کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟“

اس نے سر اٹھا کر غمور اور تیز زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا ”میں نے ایسی کیا بات کہہ دی؟ کیش بکس میری مسمری کے نیچے رہتا ہے اور اس کی چابی سسلی کے ازار بند میں بندھی رہتی ہے۔“

”یہ بات ذرا مذہب پیرائے میں بھی کسی جاسکتی تھی۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”لنگوٹھے دوستوں کے ساتھ بھی تہذیب اور تکلف کا دھیان رکھنا بڑے توانسان کو ہیضہ ہو جاتا ہے۔ یہ بناوٹ میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

”سسلی کو بلاؤ۔ مجھے اس میں سے سات آٹھ لاکھ روپے نکالنے ہیں۔“

”روپے کہاں؟ وہ تو شاید سب کے سب ڈالر ہیں۔ انہیں

مارکیٹ سے کیش کرانا ہو گا۔“

”مجھے معلوم ہے۔ روپوں کو شرح تبادلہ سے تقسیم کر دیا جائے تو جواب ڈالروں میں مل جاتا ہے۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا ”تم سسلی کو بلاؤ۔ اتنا حساب وہ بھی کر لے گی۔“
 ”آجائے گی.... وہ بھی آجائے گی۔ یہ بتاؤ کہ تم اتنی مرچیں کیوں چن رہے ہو۔“

”میرے پاس وقت ہوتا تو آج میں یہاں رک کر مرچیں تو کیا، تمہاری ہڈیاں چبانے کے بارے میں ضرور سوچتا۔ تم نے اصلی شراب اور خنیاں عورتوں کے چکر میں اپنی زندگی برباد کر لی ہے۔“
 ”مجھے زبان کھولنے پر مجبور نہ کرو ورنہ میں بھی پوچھ سکتا ہوں کہ جب غزالہ تمہاری بیوی ہے تو ویرا کیوں دن رات تمہارے ساتھ چپک چپک رہتی ہے۔“

”اس سوال کا جواب تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ یاد کرو کہ جب وہ بلک کوئن کھاتی تھی اور اس کے نام سے شہر کے سورا کا پ اٹھتے تھے، وہ میری دسترس میں تھی۔“
 ”اور اب تم اسی پرانی دوست کو نباہ رہے ہو!“ اس نے چوٹ کی۔

”جو چاہو سمجھتے رہو مگر سسلی کو فوراً بلاؤ۔ تم میرا کافی وقت برباد کر چکے ہو۔“ میں نے اپنی رست و اوج پر نگاہ ڈالتے ہوئے اضطرابی لہجے میں کہا۔

غیبت یہ ہو کہ جہانگیر نے غمور ہونے کے باوجود میرے لہجے میں چھپی ہوئی بے یقینی کا اندازہ لگا کر سسلی کو آواز دی اور وہ فوراً خواب گاہ میں آگئی۔

میں نے اپنی جگہ چھوڑ کر سسلی کو مطلوب رقم کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ اتنی خیر رقم کا ذکر سن کر سسلی کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی مگر میں نے چند قہروں میں اسے مطمئن کر دیا۔

مکان کی خریداری کے لیے بڑی رقم کی ضرورت کا بمانہ ہر شک و شبہ سے بالا تھا۔ وہ دونوں کسی وقت ہمارے کلشن اقبال والے مکان پر آج بھی جاتے تو انہیں یہ علم نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم نے وہ مکان خرید لیا تھا یا وہاں محض کرائے دار کی حیثیت میں منتقل ہوئے تھے۔ کسی آڑے وقت میں ہمیں وہ گھر چھوڑنا پڑ جاتا تو اس کے لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ جہانگیر کے ساتھ سسلی کو بھی میرے مسائل کا بڑی حد تک اندازہ تھا۔ اپنے خون آشام دشمنوں کی وجہ سے مجھے ہی نہیں، جہانگیر کو بھی اپنا گھریار چھوڑ کر دوسرے ٹھکانوں کا رخ کرنا پڑا تھا۔

”سسلی! اپنا کام کر لے گی! اتنی دیر ہم ڈرائنگ روم میں سلطان شاہ کے پاس بیٹھتے ہیں۔“ میں نے جہانگیر کو وہاں سے الگ لے جانے کے لیے کہا۔

”اوہو.... میں اب تک اسے بھولا ہوا ہوں۔“ وہ اپنا تازہ گلاس لے کر ہوٹل کے باہر نکلے اور انداز میں مسمری سے اتر پڑا ”میرے

بارے میں وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔

ہم خواب گاہ سے لانی میں نکلے تو کسٹن ملازمہ شادیت کی انگلی اپنے دانتوں میں دبائے کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ کھڑی رہی لیکن جہانگیر پر نظر پڑتے ہی تیزی سے کچن میں روپوش ہو گئی۔ جہانگیر نے اپنے رویے سے اس کو خوف زدہ کیا ہوا تھا۔

”تم کچھ پیتے ہو؟“ جہانگیر نے سلطان شاہ کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”صرف چائے اور وہ بھی اس وقت نہیں پیوں گا۔ ہم جلدی میں ہیں۔“ سلطان شاہ نے خلیفانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

”ہماری کسی بات کا برا نہ منانا۔“ جہانگیر نے بائیں آنکھ دبا کر اس سے کہا ”میاں بیوی میں زیادہ چاہت ہو تو ذرا سی بات کا یوں ہی ہتکتو بنتا رہتا ہے۔“

”ہاں۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ چاہت بہت زیادہ ہو تو دونوں ایک دوسرے کا خون پی جانے پر تے رہتے ہیں۔ خدا جہانگیر اور سہلی کی محبت میں اتنی ہی کدے کہ یہ آپس میں لڑنا بند کر دیں۔“ میں نے اپنے دل کی گھڑائیوں سے دعا مانگی اور سلطان شاہ بے اختیار ہنس پڑا۔

”تم سے میرے حق میں کبھی اچھائی کی امید نہیں کی جاسکتی۔“ جہانگیر نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ لے کر بھرائی ہوئی آواز میں شکوہ کیا ”نوبت یہ آگئی ہے کہ اب منہ پر بددعا نہیں دے رہے ہو۔“

”اپنی منطق پر غور کرو تو یہ بددعا نہیں، بہت مبارک دعا تھی۔“

”ذرا ایک کانٹہ پر اپنے نئے گھر کا پتا لکھ دو۔“ جہانگیر نے سلطان شاہ سے فرمائش کی ”میں بھی وہاں آکر ڈینی کو ایسی ہی جلی کئی دعائیں دوں گا۔“

سلطان شاہ نے استغما میہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے کہا ”اگر یاد ہے تو اس کا پتا لکھ دو، جس کا ہم نے سوا کیا ہے۔ میں نے اسے پوری بات بتادی ہے۔“

”لکھ رکھا سکتا ہوں، پتا یاد نہیں ہے۔“ سلطان شاہ نے معذرت پیش کر دی۔

”کوئی بات نہیں، گھر سامنے کے بعد کسی وقت آکر ساتھ لے جانا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”سہلی ایک لفافے میں ڈالروں کی ایک گڈی لے آئی اور میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اسی وقت گن کر ایک لاکھ روپے کے مساوی ڈالر الگ کئے اور بقیہ رقم اسی لفافے میں ڈال کر جیب میں رکھ لی۔

”باقی رقم بھی گن لو۔ مجھ سے کوئی بھول چوک نہ ہو گئی ہو۔“

سہلی نے نیچے آواز میں کہا۔

”عورتیں حساب میں کر کر رہتی ہیں مگر گنتی میں طاق ہوتی ہیں۔“ یہ کہہ کر میں صوفے سے اٹھ گیا۔

”کہاں چلے؟ تم دونوں کے لیے چائے تیار ہوگی۔ میں ابھی لاتی ہوں۔“ سہلی بیٹھتے بیٹھتے دوبارہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے پیلا کو چائے بنانا سکھا دی ہے۔ اسے ان کا ڈرنہ ہوتا تو اب تک وہ پوری ٹرے تمہارے سامنے رکھ چکی ہوتی۔“

میں نے رست و اراج پر نگاہ ڈالی۔ سلطان شاہ کی بروقت یاد دہانی سے ہم اصل کام سے نمٹ چکے تھے اور اس وقت صرف سوا دس بجے تھے۔ ہم چائے پی کر آرام سے رستم کے گھر جا سکتے تھے۔

جہانگیر اپنی ترنگ میں صوفے پر بیٹھا بہت دھیرے دھیرے جھوم رہا تھا۔ اچانک اس کی ذہنی رو بہکی اور جھک کر سلطان شاہ سے مخاطب ہو گیا ”تم نے پیشاب تو کیا ہو گا؟“

اس ناگہانی سوال پر سلطان شاہ سٹپنا کر رہ گیا ”مم... مجھے تو ایسی کوئی حاجت نہیں تھی۔“

”بری بات ہے۔“ اس نے سلطان شاہ کو ناصحانہ انداز میں سمجھایا ”ایسی باتوں میں شرمانا تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے جہاں چاہو پیشاب کر لو۔“

مجھے ہنسی آگئی ”تم اپنی زبان بند رکھو تو فائدے میں رہو گے ورنہ یہ فلیٹ کبڑا خانے میں بدل جائے گا اور سہلی جو تے لگا کر تمہارا انشہ ہرن کر دے گی۔“

”بس! اب ایک لفظ بھی نہ کہنا۔“ وہ غصے میں غرایا ”تمہاری بکی باتیں اس کا داغ خراب کرتی ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس وقت وہ یہاں نہیں ہے۔“

ڈرائنگ روم میں ایک لخت گرمی خاموشی چھا گئی۔ تینوں نے اپنی زبانیں بند کر لیں تھیں۔

وہ سکوت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ سہلی چائے کی ٹرے لے آئی۔

وہ بھاپ اڑاتی ہوئی چائے کے تین گک لائی تھی۔ چائے کے ساتھ جے ہوئے ہٹز بیٹن اور پیر کے پارچے بھی موجود تھے۔ جہانگیر کی نوٹشی کی وجہ سے گھر میں ان لوازم کی موجودگی ناگزیر تھی۔

”چائے کی خوشبو اشتہا انگیز ہے۔“ میں نے پیر کا ایک پارچہ منہ میں رکھ کر کہا ”مغزہ اٹھیا۔“

”تمہیں جانے کی جلدی نہ ہوتی تو میں کچھ اور بھی بتاتی۔ آج تم نے شراب نوشی میں ان کا ساتھ نہ دے کر میرا دل خوش کر دیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ انہیں شراب نوشی کا عادی تم نے بنایا ہے۔“

”مجھ سے نکرانے سے پہلے یہ پکا شرابی تھا۔ پہلے یہ کٹی اور ٹھہرے پر گزارہ کرتا تھا۔ خوش حالی آنے کے بعد والدی شراب پر میں نے اسے ضرور ڈالا تھا۔“

”سہلی! جہانگیر نے اپنی ہوئی کو لاکا را۔“ بے سرو پا الزام

تڑاٹیاں کر کے ہم دونوں کو لڑانے کی کوشش مت کرو۔ میں نے کبھی ڈنڈی پر کوئی الزام نہیں لگایا۔“

”شراب نے تمہارے حافظے کا بھی ستیاناس مار دیا ہے۔ نشے میں کی ہوئی باتیں تم اکثر بھول جاتے ہو۔ اب میں تمہاری ساری باتیں نیپ کر کے بعد میں تمہیں سنایا کروں گی۔“

”دیکھو! تمہارے آنے سے یہ یہ ہوتا ہے۔“ جہانگیر نے مجھ سے شکوہ کیا ”ابھی تم نے صرف چائے کی تعریف کی ہے اور اس کا دماغ خراب ہونا شروع ہو گیا۔۔۔۔۔“

”فکر مت کرو۔ آئندہ میں آنے میں احتیاط برتوں گا۔“ میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

”جب جی چاہے، یہاں آؤ۔ میں دیکھتی ہوں کہ تمہیں کون روکتا ہے۔“ سلیٹی شیر ہو کر بولی۔

اسٹیشن فور کے خشک اور کٹھن ماحول میں مسلسل کئی ہفتے گزارنے کے بعد جہانگیر کے گھر پر ہونے والی نوک جھونک بہت دلچسپ محسوس ہو رہی تھی۔ ذہن فقرے بازیوں کے لیے چاق و چوبند تھا اور گنگو کے درمیان دل کھول کر ہنسنے کے مواقع بھی میسر آرہے تھے۔ وہ دور چٹا رہا اور ہم دونوں نے چائے کے کک خالی کرنے سے پہلے ننگیں گوشت اور پیر کی پلیٹیں خالی کر دیں۔

اس روز وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر پونے گیارہ بجے ہم کو اٹھنا پڑا۔ میں ہر بیت پر سوا گیا رہ بجے سے پہلے رستم کے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا تاکہ وہ زیادہ انتظار کی کوفت سے محفوظ رہ سکے اور ہمارے مذاکرات خوش گوار فضا میں مکمل ہو سکیں۔

”آج تو مزا ہی آگیا۔ اول خان کے سمان بن کر ہم شہری زندگی کے لیے ترس گئے ہیں۔“ نیچے جاتے ہوئے سلطان شاہ نے مسرت کا اظہار کیا۔

”اس کے سامنے ایسی کوئی احتمال بات نہ کہہ دینا۔ وہ زود رنج آدمی ہے، آزرہ ہو جائے گا۔“

”یہ کہنے والی نہیں محسوس کرنے والی بات ہے۔ اس میں اول خان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بہت خلوص سے ہمیں خوش رکھنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔“

”ایس لی ایف کے ان کارکنوں کو دیکھو جو گھروالے اور عیال دار ہو کر کبھی بے کیف ویرانوں میں پڑے ہیں اور سال چھ مہینے میں چند روڑے لے کر گھر چاکر خوش ہو جاتے ہیں۔“

”یہ سب اسی قبیلے کے لوگ ہیں جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔“

یہ غازی، یہ تیسے پر اسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے، ذوقِ خدادادی دونوں ان کی تھو کر سے صحرا دور کیا، سٹ کر پناہ ان کی ہیبت سے رانی“

گاڑی میں بیٹھنے تک ہم دونوں کے ذہنوں پر سلیٹی کی پُرورش توابع کا سرور چٹایا رہا لیکن سفر کی ابتدا ہوتے ہی میرا ذہن رستم اور اس کے بھٹکانے کی طرف چلا گیا۔ سلطان بھی خاموش ہو کر کسی سے بات نہ کر رہا تھا۔

یہ غازی، یہ تیسے پر اسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے، ذوقِ خدادادی دونوں ان کی تھو کر سے صحرا دور کیا، سٹ کر پناہ ان کی ہیبت سے رانی“

گاڑی میں بیٹھنے تک ہم دونوں کے ذہنوں پر سلیٹی کی پُرورش توابع کا سرور چٹایا رہا لیکن سفر کی ابتدا ہوتے ہی میرا ذہن رستم اور اس کے بھٹکانے کی طرف چلا گیا۔ سلطان بھی خاموش ہو کر کسی سے بات نہ کر رہا تھا۔

یہ غازی، یہ تیسے پر اسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے، ذوقِ خدادادی دونوں ان کی تھو کر سے صحرا دور کیا، سٹ کر پناہ ان کی ہیبت سے رانی“

گاڑی میں بیٹھنے تک ہم دونوں کے ذہنوں پر سلیٹی کی پُرورش توابع کا سرور چٹایا رہا لیکن سفر کی ابتدا ہوتے ہی میرا ذہن رستم اور اس کے بھٹکانے کی طرف چلا گیا۔ سلطان بھی خاموش ہو کر کسی سے بات نہ کر رہا تھا۔

تخلفات تھے، میں اپنے تفکرات کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔

گیارہ بج کر سات منٹ پر ہماری گاڑی بھرا کے آہنی بھانک کے سامنے موجود تھی۔

آہنی بھانک کا ایک در خاموشی سے اندر کھلا۔ میں نے جوں ہی گاڑی آگے بڑھائی۔ بھرا کا چہرہ اور ناقابلِ فراموش منظر میرے سامنے تھا۔

غمات کی تمام کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے جن سے چھن کر روشنی باہر آ رہی تھی۔ پختہ روشوں کے اطراف میں پانیوں پر لگے ہوئے سارے دودھیا گولے روشن تھے۔ باغ اور لان کے چیدہ چیدہ مقامات پر اس طرح روشنی کا اہتمام کیا گیا تھا کہ ڈھلتی رات کے گھور اندھیرے میں بھرا میں بیٹھ کر ہوتی تھی سی دنیا بہت خوب صورت اور خواب ناک نظر آ رہی تھی۔

بھرا میں وہ ہماری دوسری آمد تھی۔ گاڑی وہی تھی، چرے وہی تھے، وقت کا دورانیہ طے شدہ تھا اور یہ باتیں شاید ڈیوٹی پر موجود سارے عملے کو معلوم تھیں۔ ہمیں کہیں روکا گیا، نہ ہم سے ہتھیار طلب کئے گئے۔ میں رستم کی بھائی ہوئی اس جنت کے نظاروں سے لطف لیتا اور بہت رفاکار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا پختہ روش پر آگے بڑھتا رہا۔

روش کے اختتام سے کچھ پہلے، پرانی جگہ پر کھڑے ہوئے باوردی شخص نے اشارہ کیا، گاڑی رکی، اب سے میرا دروازہ کھولا گیا اور ہم نیچے اتر گئے۔

اس وقت بھی رستم وہیں تھا جہاں اس سے ہماری بچھلی ملاقات ہوئی تھی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں کافی روشنی تھی۔ اس کے ارد گرد دور دور تک پھولوں کے کج اور پودوں کے تختے ملکی روشنی میں اپنی بھاری بھر پور تھی۔ ہم ان مناظر سے واضح طور پر مرعوب تھے اور اپنی اس کیفیت پر غالب آنے کی کوشش کئے بغیر اس کے سامنے پہنچ گئے۔

اس نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا۔ اس کی عقلمانی نظریں ہمارے جسموں میں اتاری جا رہی تھیں۔ ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ جم کر سر اور دھیمی آواز میں پوچھا ”تم خالی ہاتھ کیوں آئے ہو، کیا تمہیں کچھ بتایا نہیں گیا تھا؟“ میں نے جلدی سے جیب سے لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی نظریں لفافے پر پڑیں اور پھر اس کا چہرہ غصے سے تپنے لگا۔

”کیا مذاق ہے؟“ اس کی آواز غصیلی تھی مگر اس کا لہجہ بلند نہیں ہوا تھا ”تم سے سات بیٹیاں لانے کے لیے لگایا تھا۔ یہ تو پوری ایک جہنمی بھی معلوم نہیں ہوئی۔“

اس کے فطری ردِ عمل کو دیکھ کر میرے فرشتے کوچ کرنے لگے تھے مگر میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا ”یہ پاکستانی روپے نہیں“ امریکی ڈالر ز ہیں۔ حساب کرو گے تو مال سات

جہتی سے دو چار ہزار اور ہی ہو گا۔“ اس دوران میں میرا بڑھا ہوا ہاتھ فضا میں معلق رہا تھا۔

اس کے کانوں کی نرم اور لمبی یوں اپنے قدرتی رنگ پر لوت آئیں، چہرے کی سرخی کم ہوئی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔

رستم کے بارے میں اس کی بے تابی کے مدِ نظر میرا خیال تھا کہ وہ لفافہ کھول کر نوٹ گنتے یا کم از کم دیکھنے بغیر نہیں رہے گا مگر اس نے وہ لفافہ یوں ہی اپنے سامنے نیل پر ڈال دیا۔

”یہ اٹھاؤ اور بیس بیٹھ کر گن لو۔ سات جہتی ہونا چاہیے۔“ رستم نے ہمارے سروں کے اوپر کسی سے مخاطب ہو کر حکم دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس سے مخاطب تھا کیونکہ ہمارے ساتھ باوردی شخص تنک باغیچے میں نہیں آیا تھا۔

غیر ارادی طور پر ہم دونوں کے سر پیچھے گھوم گئے۔ ہمارے پیچھے بڑی بڑی چمک دار آنکھوں اور گنتے سرو والا ایک ارجن عمر شخص بیٹھ کر دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ پتا نہیں وہ ہماری بے خبری میں کیب اور کماں سے نمودار ہو کر راز داری سے ہمارے سروں پر مسلط ہو گیا تھا۔

میرے بدن میں خوف سے پھر پریاں سی دوڑ گئیں۔ ہماری طرف سے کوئی گریز ہوئی ہو تو رستم کی جنبش ایرو پر وہ شخص نہایت اطمینان سے ہماری کھوپڑیاں اڑا سکتا تھا۔ ہمیں پتا بھی نہ چلتا کہ ہمیں نشانہ بنانے والا کون اور کہاں موجود تھا۔

وہ لفافہ لے کر رستم کے قدموں سے ذرا دور دبیز گھاس پر بیٹھ گیا اور لفافہ کھول کر ڈالر گنتے لگا۔

”چوس شام تک تمہارا کام ہو جائے گا۔“ رستم نے اپنے آوی کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھ سے کہا ”رات کے گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان باقی تین لاکھ بھی یہاں پہنچ جانے چاہئیں۔“

”باقی تین لاکھ!“ میرے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی استغابیہ آواز پر آمد ہوئی ”تمہارے آدمی نے صرف سات جہتی کی بات کی تھی۔ یہ دس ہو جاتی ہیں۔“

رستم کے چہرے پر ابھر آنے والی غصے کی سرخی معدوم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی نرم اور دھیمی آواز میں کہا ”اس نے بیٹھنے کی بات کی تھی۔ میں نے تمہیں کل ہی بتا دیا تھا کہ پورس کا معاملہ ہے۔ سات سے دس تک خرچ آسکتا ہے۔ اتنا خرچ نہیں کر سکتے تو یہ سات بھی لے جاؤ۔“

میں نے محسوس کیا کہ گفتگو کے دوران میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے مخاطب کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹاتا تھا۔ بلیکس جھپکاتے بغیر مسلسل اس کے چہرے کی تحریر پر ہتارتا رہتا تھا۔

”صاحب! آج کے بھاد سے یہ تین ہزار کے لگ بھگ زیادہ ہیں“ اس کے آدمی نے نوٹوں کی گنتی کے ساتھ ہی زبانی حساب لگا کر میری بات کی تصدیق کر دی۔

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے کہا ”تمہارا شوہر بہت عقل مند دکھائی دیتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے اسے ہر بات کا علم ہے؟“

عورت نے کہا ”حق نہ ہو۔ اسے تو شبہ بھی نہیں ہے۔“

س م شرافت کی رازداری، بھائی پھیرو سے

”تین بھی پہنچ جائیں گے“ میں نے کمزور آواز میں کہا ”تمہارا آدمی بتا دیتا تو ہم پورے دس لے آتے۔ اب تم باقی تین لاکھ کے لیے کوئی ضمانت مانگو گے؟“

”لے جاؤ“ اس نے اپنے آدمی کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا پھر مجھ سے کہا ”اپنے مال کی سب سے بڑی ضمانت میں خود ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ جو کام ہونے سے پہلے سات دے سکتا ہے، کام ہونے کے بعد خوشی سے تین بھی پہنچا دے گا۔ میرا مال دینے والا آج تک نہیں چنپ سکا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہیں ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی“ میں نے پھلبدل کر وعدہ کیا۔

کی جواب طلب خاموشی میں مجھے بولنا پڑا۔ میں کم سے کم وقت میں وہ ملاقات ختم کرنے کا خواہاں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ گفتگو کی طوالت میں کہیں اسے پھسل کر اپنے وعدے سے منحرف ہونے کا موقع نہ مل جائے۔

”میں لمبے چکروں سے دور رہتا ہوں۔ تم سے سودا کر لیا ہے تو اسے ضرور پورا کروں گا مگر یہ یاد رکھنا کہ تم اس کا کوئی پتا ٹھکانا بتانے میں ناکام رہے ہو۔“

”اسے کوئی عذر نہیں بننا چاہیے۔ وہ مشور آدمی ہے۔ اس کا پتا آسانی سے مل جائے گا۔“

میری بات پر لحد بھر کے لیے اس کا چہرہ متغیر ہوا مگر وہ فوراً ہی مسکرا دیا ”میں حیلے اور ہمانے نہیں دھونڈتا۔ کام کرتا ہوں یا انکار کر دیتا ہوں۔ یہ کام ہو گا اور پرسوں تک ضرور ہو گا۔“

اس کے مضبوط اقرار پر میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ شاید میں نے اس کی صحیح رنگ دہائی تھی۔

”مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کام ہو گیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

اس کے گلابی ہونٹوں پر دوبارہ خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

اس نے کہا ”وہ مشور آدمی ہے۔ اس کی موت کی خبر اخباروں میں ضرور آئے گی۔ ویسے تم پرسوں شام سات بجے فون کر لیا۔“

”فون پر تم سے بات کرنا شاید ناممکن ہے۔ تمہارے آدمی کے پاس ہر جواب موجود ہوتا ہے“ موقع میسر آتے ہی میں نے شکایت کر دی۔

”میں بہت مصروف ہوتا ہوں اور اپنے ہر مہمان کو پوری رازداری فراہم کرتا ہوں۔ آج کے فون کے لیے میں نے تمہیں کوئی وقت نہیں دیا تھا۔ تمہارا فون آیا تو میں مصروف تھا۔ جب میں وقت دیتا ہوں تو خود ہی بات کرتا ہوں۔ اس میں میرے آدمی کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”ابھی تم نے اوپر اُن کی موت کا ذکر کیا تھا۔ ہم اس کے مرنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ابھی تک جو کچھ طے ہوا ہے اس کے مطابق اوپر اُن کو قتل کرنا ہے۔“

”قتل بھی مرگ یا موت کی ایک صورت ہے۔ تم مطمئن رہو“

”تم بے آرام ہو..... مجھ سے نظریں چرا رہے ہو۔ اگر تمہاری نیت میں کوئی کھوٹ ہے تو یہ بتا دوں کہ وقت پر رقم نہ مل تو پھر میں رقم نہیں، انتقام لیتا ہوں۔ تم دونوں کی وڈیو بن چکی ہے۔ یہ باتیں بھی ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ تم نے بے ایمانی کی تو یہ چیزیں تین لاکھ میں مارے جانے والے کے وارثوں کو دے دی جائیں گی۔ میرا حساب پورا ہو جائے گا اور وہ لوگ تمہیں دھوڑ کر مار ڈالیں گے۔“

”یہ دونوں ریکارڈنگز ہمیشہ تمہارے پاس رہیں گی؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اس نے دھیرے سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور ضمانت سے بولا ”میرا حساب پورا ہوتے ہی انہیں بقی بیٹھی میں جلادیا جائے گا۔ یہ باتیں میں ہر ایک کو نہیں بتاتا“ ایسے گاہوں کو ضرور جنتا ہوں جو تمہاری طرح پریشان خیال اور گھبراہٹ ہوئے ہوتے ہیں۔“

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میرے بارے میں تمہارے اندازے درست نہیں ہیں۔ تم کام کروادو۔ میں رقم پوری کر دوں گا۔“

”پرسوں کا دن یاد رکھنا“ اس نے تاکید کی پھر پوچھا ”اب اس کا نام پتا بھی بتا دو۔“

”اوبرائن ڈی ہنٹ!“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا ”کراچی میں امریکی قونصل خانے کا ڈیرا“ افسر نے آج کل نئی دہلی میں ہے۔ اس کا پتا مجھے نہیں معلوم۔“

”اوہ!“ وہ دونوں ملاقاتوں میں پہلی بار متغیر نظر آیا ”تو وہ امریکی سفارتی افسر ہے۔ یہ بات پہلے معلوم ہو گئی ہوتی تو شاید میں انکار کر دیتا۔“

”میں کل ہی بتانا چاہ رہا تھا مگر تم نے روک دیا۔ اس میں میرا قصور نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔ میرا پہلا اندازہ تھا کہ تم اپنے کسی دشمن کے قتل کے لیے دس لاکھ نہیں دے سکتے۔ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی پر تمہاری تیار میرے لیے حیران کرنے والی بات تھی۔“

”اُن کے لیے آدمی اس سے بڑا جو ابھی تکیل گزرتا ہے“ اس

تمہاری رقم برباد نہیں ہوگی۔“

بارہ بجتے میں دیر تھی مگر ضروری باتیں ہو چکی تھیں۔ میں وہاں سے اٹھنا چاہ رہا تھا مگر کسی تواضع کے بغیر ہمیں یوں رخصت کر دینا شاید رستم کی مہمان نوازی کی روایات کے خلاف تھا۔ اس نے ہمیں جانے کے لیے روکا اور میں نے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

مفتنگو کے دوران میں وہ ایک بار میری بے چینی محسوس کر کے کھلے لفظوں میں میری نیت پر اپنے شبے کا اظہار کر چکا تھا۔ اگر میں وہاں سے روانہ ہونے میں تجلّت دکھاتا تو اس کے دل میں پیدا ہونے والے دوسو سو کو مزید تقویت مل سکتی تھی۔

رستم جتنا سیدھا اور کھرا نظر آتا تھا، وہ درحقیقت ویسا نہیں تھا۔ جب اس نے اوپر اس کے قتل کے عوض اچانک ہی مزید تین لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تو مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ میں اس کی طرف سے اس خوش گمانی میں مبتلا تھا کہ وہ ایک اصول پسند مجرم ہے۔ اپنے کسی گئے بندھے فارمولے کے تحت کاموں کے معاوضے کا متین کرتا ہے۔ اس نے ابتدا میں سات سے دس لاکھ کا تخمینہ دیا تھا لیکن شام کو اس کے آدمی نے فون پر صرف سات لاکھ کا ذکر کر کے میرے دل میں رستم کے لیے جگہ پیدا کر دی تھی۔

رستم نے اپنے بارے میں میری وہ غلط فہمی زیادہ دیر پر قرار نہیں رہنے دی تھی۔ پہلے کم رقم یا صرف بیٹنگی رقم کا مطالبہ کر کے اس نے یہ دیکھا تھا کہ میں یعنی ملک ممتاز کس مالی حیثیت کا مالک ہوں۔ جب سات لاکھ اس کے ہاتھ میں آ گئے تو اس نے کام سے دستبردار ہونے کی دھمکی دے کر مزید تین لاکھ کا مطالبہ پیش کر دیا۔

اس پورے معاملے میں صرف ایک ہی بات قابل اطمینان تھی کہ سب کچھ طے ہو جانے کے باوجود رستم نے میرے پتے یا ٹھکانے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔ جب میں نے خود اقبیہ تین لاکھ کی ضمانت کا ذکر چھیڑا تو اس نے وصولی کے خالنامہ نظام پر روشنی ڈال کر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنی بساا کا ماہر کھلاڑی تھا۔ کسی کی مدد یا ضمانت کے بغیر اپنے مہروں کو بڑھانے کے فن سے اچھی طرح واقف تھا۔ میرے کسی رابطے سے بے خبر رہنے کے باوجود اسے اپنی رقم دوہنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چائے آئی تو رُے میں تازہ چٹلوں کے ساتھ دوسرے لوازم بھی موجود تھے۔ پچھلی شام کے مقابلے میں اس رات ہماری ضیافت کا کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اسے ایک بڑی رقم دے کر باقاعدہ اس کے گاہک بن چکے تھے۔

”ملک افضل!“ اس نے چائے کی پیالی سے پہلا گھونٹ لے کر غور سے سلطان شاہ کی طرف دیکھا اور تائید طلب لہجے میں اس کا مفروضہ نام دہرایا۔ سلطان شاہ نے بے ساختہ اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔ قدرے توقف کے بعد رستم نے اپنی بات جاری رکھی ”کل سے اب تک میں نے سلام دعا کے سوا تمہاری آواز نہیں سنی۔ چہرے سے تم اتنے کم گو معلوم نہیں ہوتے۔“

وہ بلا کا گھاگ اور چرو شاس تھا۔ سلطان شاہ کھسپائے ہوئے انداز میں مسکرا کر بولا ”جی بڑے ملک صاحب سارے معاملات پر ٹھیک ٹھاک بات کر رہے ہیں تو مجھے بچ میں دغل دینے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے سامنے میں کمی ہی بولتا ہوں۔“

”بروں کا لحاظ کرنا بہت اچھی عادت ہے مگر اس پکر میں انسان کو اپنی شناخت سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔“ پتا نہیں وہ کیا سوچ کر سلطان شاہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

”شناخت کے لیے میرا نام ہی کافی ہے“ سلطان شاہ نے اس مرتبہ اعتماد سے جواب دیا ”ہم جہاں جاتے ہیں بڑے اور چھوٹے ملک کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔“

”مجھے کوئی خاص ضرورت نہیں ہے لیکن تمہارا کام ٹیڑھا ہے“ رستم نے حسب عادت سلطان شاہ کے چہرے پر نظرس گز کر دھیمی آواز میں کہا ”شاید کوئی مسئلہ نکل ہی آئے۔ مجھے اپنا کوئی فون نمبر یا تادے دو جس پر تم میں سے کسی سے رابطہ ہو سکے۔“

رستم کا وہ مطالبہ سلطان شاہ کے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی طاری ہو گئی۔ اس نے بوکھلا کر امداد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ رستم بدستور اسے گھورے جا رہا تھا۔ سلطان شاہ کی بوکھاہٹ پر اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

”میرا موبائل نمبر گھر لکھ لو“ میں نے اوپچی آواز میں رستم سے مخاطب ہو کر کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ اس سوال کا جواب تم ہی دو گے“ رستم نے سرد آواز میں کہا ”سایہ دار اور تانور درخت کے آس پاس کچھ نہیں اگ سکتا۔ وہ ہر کوئیل کو جلا کر راہ کر دیتا ہے۔ تم اتنے زبردست آدمی ہو تو بچ بچ بتاؤ کہ اوپر ان کو مروانے کے لیے میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

میرے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ چائے پلا کر اس نے یکایک ہی ایک خطرناک موضوع چھیڑ دیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ذہن میں دھیرے دھیرے پروان چڑھنے والے شکوک و شبہات اس وقت کوئی واضح روپ دھار چکے تھے۔

وہ ہم دونوں کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ میرا کی چار روپواری میں ہمارا کوئی معاون یا مددگار نہیں تھا۔ ہم پوری طرح رستم اور اس کے ملازمین کے لشکر کے رحم و کرم پر تھے۔ ہمارے پاس امید کی پہلی اور آخری کرن دو بھرے ہوئے ریوالبوروں کی صورت میں نمایاں تھی۔

میں نے آخری معرکے کا ارادہ کرتے ہوئے فیصلہ کن تیروں کے ساتھ رستم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

افسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عیدت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

بغیر میرے کسی ٹیڑھے سوال کا جواب نہیں دے سکے گا۔
”اسی لیے تم نے اس سے فون نمبر اچتے کے بارے میں پوچھا تھا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ دھیرے سے ہنسا اور بولا ”جو میں نے سوچا تھا وہی ہوا۔
چھوٹے ملک نے پوچھا کہ تمہاری طرف دیکھا اور تمہیں بولنا پڑ گیا۔
میرا شبہ بے بنیاد نہیں تھا۔“
”تو کیا تم ہم دونوں پر کسی قسم کا شبہ بھی کر رہے ہو؟“ میں نے ناگواری سے پوچھا۔

”یہ شبہ ہی تھا کہ تم نے چھوٹے ملک کو بُری طرح دبا کر رکھا ہوا ہے!“

”تم نے اپنے طور پر اس کی تصدیق کر لی۔ کیا اس سے ہماری ڈیل پر کوئی اثر پڑے گا؟“ اس بار میں اپنی آواز میں بڑھنے والی تلخی پر قابو نہ رکھ سکا۔

”چائے پو، ٹھنڈی ہو کر بے مزہ ہو جائے گی۔“ اس نے میرے لمبے کی تلخی کو بیکر نظر انداز کر کے نرمی سے کہا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرے رویے سے محفوظ ہو رہا ہو۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میں نے چائے کی پیالی اٹھا کر اسے یاد دلایا۔

”رستم! اپنے قول سے کبھی نہیں پھرتا۔ جو بات طے ہو گئی وہ طے ہو گئی۔ تم کا لے چور ہو تب بھی وہ کام پورا ہو گا۔ نئی دہلی میں تمہارا دشمن مقررہ وقت کے اندر اندر مار دیا جائے گا۔“

”تم نے میرا موبائل نمبر نہیں لیا!“ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا ”میں نے وہ سوال چھیڑنے کے لیے کیا تھا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ لوگ کتابیں پڑھنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ میرے لیے ہر چہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہوتا ہے اور میں اسے پڑھ کر خوش محسوس کرتا ہوں۔“

”میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔“ میں نے تلخی کو فراموش کر کے سوال کیا۔

”ضدی اور حوصلہ مند آدمی ہو۔ مجھے اب بھی حیرت ہے کہ تم نے اپنا زور بازو آزمانے کے بجائے میری مدد لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ قدم تمہارے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔“

”وہ یہاں نکار رہا تو شاید میں نے تمہارا رخ نہ کیا ہوتا۔ میرے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں کہ میں نئی دہلی میں اس کو مزہ چکھا سکوں۔ یہ کام تم جیسا پیشہ ور ہی کر سکتا ہے۔“

”تمہارا کام اس خوب صورتی سے پورا ہو گا کہ تم خوش ہواؤ گے۔ ایسے ہر منصوبے میں میری کوشش ہوتی ہے کہ جرم ہونے کے باوجود کسی کو جرم کا شبہ نہ ہو۔ اور ارنلڈ کے بارے میں میرے ذہن میں ایک تجویز کا خاکہ تیار ہونا شروع ہو گیا ہے۔“

”یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں نے ابھی تک تم سے یہ نہیں پوچھا کہ امریکا جیسے بڑے ملک کے ایک اہم سفارتی ملازم سے تمہاری کیا دشمنی ہے اور تم اسے کیوں مروانا چاہتے ہو۔“
”میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے اسے پیشکش کی ”تم نے خود اس بارے میں دلچسپی نہیں لی۔“

”میں غیر متعلقہ باتوں سے دور رہنے کے اصول پر سختی سے عمل کرتا ہوں۔ تمہاری دشمنی کیوں ہے؟ تم اسے کیوں مروانا چاہتے ہو؟ یہ تمہارے مسائل ہیں۔“

”میرے بارے میں تجسّس کا مظاہرہ کر کے تم نے اپنے اصول سے انحراف کیا ہے!“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر دھیرے سے اعتراف کیا ”میرا یہ تجسّس بلاوجہ نہیں تھا۔“
”اگر تم اپنے اصولوں کے بارے میں اتنے ہی سخت اور کھربے ہو تو اب تمہیں تجسّس کی وجہ بھی بتا دینی چاہیے۔ یہ جاننا میرا حق بنتا ہے۔“ موقن باتے ہی میں نے مطالبہ کر دیا۔

وہ لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر فیصلہ کن لمبے میں بولا ”تمہیں معلوم ہو گا کہ میں ایرانی خزاہ ہوں۔ یہاں کی سیاست کے بکھیڑوں سے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے جبکہ یہاں کے اخبار سیاست ہی سیاست میں لتھڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اپنا کام کرتا ہوں اور فاضل وقت اپنے بال بچوں میں سگن رہ کر گزارتا ہوں۔ اپنی چار دیواری میں مجھے دنیا کی ساری خوشیاں میسر ہیں۔ مجھے کسی ضرورت کے لیے باہر نہیں جانا پڑتا۔“

وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا تو میں نے اسے لوکا ”تمہارا یہ تعارف بہت زیادہ قابلِ رشک ہے مگر اس میں میرے سوال کا جواب کہیں بھی نہیں ہے۔“

”میں اسی طرف آ رہا تھا۔“ وہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے کان کی لومسلے ہوئے بولا ”آئے جانے والوں سے مجھے باہر کی خبریں ملتی رہتی ہیں یا پھر ٹیلی وژن کا خبرنامہ اپنی کانیاں سناتا ہے۔ تم نے اپنے شکار کے طور پر ایک اہم سفارتی افسر کا نام لے کر مجھے چونکا دیا تھا۔ ایسے واقعات عام اور سرسری نہیں ہوتے۔ ان کی بنا پر بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی زیر زمین سیاست میں کچھ تیزی آ رہی ہے اور آنے والے دن اچھے نہیں ہیں۔“

”سیاست تمہارا میدان نہیں ہے تو تمہیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

”میں نادانستگی میں کسی سیاسی سازش کا ایذا دہن بننا پسند نہیں کروں گا۔“
”میں اپنے ذاتی عناد کی بنا پر بدلے لینے کے لیے تمہارے پاس آیا تھا۔ تمہیں سیاست کا اندیشہ کیوں ستانے لگا تھا؟“ میں نے اس پر اپنا دباؤ بڑھایا۔

مت کرو۔“

اس نے اپنی رست واپج پر نظر ڈال کر کہا ”بارہ بجتے ہیں صرف سات منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ تم چاہو تو بارہ بجتے سے پہلے بھی جا سکتے ہو کیونکہ اب ہم اپنے اصل موضوع سے بھٹک کر دوسری غیر متعلقہ باتوں میں الجھنے لگے ہیں۔“

پہلے میں بے آرام تھا۔ اس وقت وہ مضطرب ہونے لگا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمارے سامنے وہ ایک ایسے موضوع پر زبان کھول چکا تھا جو اس کے پیشہ ورانہ رازوں کے زمرے میں آتا تھا۔ ہم مزید سات منٹ تک اس کے سر پر سوار رہتے تو اس سے کچھ اور بھی اگلا سکتے تھے۔

اس موڑ پر میں وہاں سے اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن مجھے رستم ابرانی کی خوشنودی بھی عزیز تھی۔ اسے میرے لیے ایک بڑا کام کرنا تھا۔ میری کسی حرکت کے نتیجے میں وہ ذرا بھی بدل ہو جاتا تو میں امریکیوں کو دہشت زدہ کرنے کے اعزاز سے محروم ہو سکتا تھا۔ ”اگر تم ہماری موجودگی سے ناخوش ہو تو ہم اجازت چاہتے ہیں۔“ میری تقلید میں سلطان شاہ بھی کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا۔

رستم نے اٹھ کر ہمیں الوداع کہا اور ہم ہیرا کے خواب ناک ماحول سے نکل کر چند منٹ بعد دوبارہ کراچی کی سڑکوں پر آ گئے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میں عقب نما آئینوں میں دور تک جائزہ لیتا رہا مگر اس رات بھی رستم نے کسی کو ہمارے پیچھے پیچھے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

کچھ دیر تک شہری سڑکوں پر آواہ مگروں کرنے کے بعد میں نے گاڑی اسٹیشن فور کی راہ پر ڈال دی۔ وہ سفر خاموشی اور تیز رفتاری سے طے ہوا۔ بیس منٹ بعد ہم بلیر چھاونی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔

چھاونی کی حدود میں چیک پوسٹوں کے سوا ہر طرف دیرانی اور سانے کا راج تھا۔ دن بھر کی مشقت آئیز سرگرمیوں سے ٹھکے ہمارے فوجیوں کے لیے وہ آرام کا وقت تھا۔ ہمارے کیمپ میں بھی کم و بیش وہی صورت تھی مگر ہمارا ایک کمرہ آباد تھا۔

”میں نے جاتے ہوئے دانستہ بدھنگونی سے گریز کیا تھا ورنہ میرا دل فکر مند تھا۔“ سامنا ہوتے ہی اول خان نے مسرت کا ایک گہرا سانس لے کر کہا ”آج کا معرکہ خطرناک تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم دونوں صحیح سلامت لوٹ آئے۔ میں گمن گمن کر گھڑاں کاٹ رہا تھا۔“

”میں نے سنا تھا کہ صرف بوڑھی مائیں ہی اپنے جوان بیٹوں کے لیے اس طرح فکر مند رہتی ہیں۔ تم نے ان کو بھی مات کر دیا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا ”دیرا کو دیکھو! لگتے سکون کے ساتھ اپنی کرسی میں ٹیم دراز ہے۔ تمہیں اسی سے کچھ سبق لینا چاہیے۔“

”یہ آپ کو اس وقت ایسی پرسکون نظر آ رہی ہے۔“ غزالہ نے اپنی سربراہ مگر اس کے ساتھ کہ ”آپ کی گاڑی کی آواز سننے سے پہلے ایسے ایسے دور از کار دوسوے بیان کر رہی تھی کہ ہم

ایک بڑا کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ ایک ہفتے کی مختصر مدت میں دو بڑے بڑے کام سامنے آجائیں تو وہ خود ہی کوئی راہ نکالنے لگتا ہے۔“

رستم ابرانی کے وہ الفاظ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اپنی گفتگو کے دوران میں انتہائی تسلسل سے رازداری اور غیر معمولی تجسس سے گریز کے اصولوں کے تقارے پیٹنے کے باوجود وہ باتوں کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اور ان جیسے کسی اور کام کا تذکرہ میرے لیے دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔

”کیا وہ بھی کسی سفارت کار کے قتل کا معاملہ ہے؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”ضروری نہیں کہ صرف سفارتی افسروں کے قتل کو ہی اہم سمجھا جائے۔ بعض اوقات قتل سے بہت کم تر واقعات اپنے اثرات کی وجہ سے زیادہ اہم بن جاتے ہیں۔“

”میں تمہیں تفصیل بتانے پر مجبور نہیں کروں گا۔ میرے لیے صرف یہی جاننا کافی ہے کہ میرے جیسا کام تم کسی اور کے لیے بھی کر رہے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح تمہیں ایک ہی کام کا دہرا معاوضہ مل رہا ہو۔“ بات ہرگز ایسی نہیں ہو سکتی تھی جو میں نے بیان کی تھی مگر اسے چڑانے اشتعال دلانے اور مزید کچھ اور اچھلنے پر مجبور کرنے کے لیے میں نے وہ حکمت عملی اختیار کی تھی۔

”اس بھول میں نہ رہنا۔“ اس بار وہ واقعی چڑ کر بولا ”اوبرائن کو دس لاکھ روپے کے عوض، صرف اور صرف تمہاری خواہش پر مارا جائے گا۔ دوسرا کام ڈینی نامی ایک آدمی کی تلاش کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک اہم آدمی ہے اور امریکا والوں نے اس کی گرفتاری پر بیس لاکھ ڈالر کا انعام مقرر کیا ہوا ہے۔“

میں نے ہیرا کی پڑ شکوہ عمارت پر نگاہ ڈالتے ہوئے حیرت سے کہا ”بیس لاکھ ڈالر کی رقم تم جیسے باحیثیت شخص کے لیے بھی بڑی ہے۔ تم دس چھوٹے کاموں....“

”خاموش رہو اور میری بات سنو!“ اس نے دھیمی مگر سخت آواز میں مجھے ڈانٹ دیا ”میں ایسے انعاموں پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے اپنے صاف ستھرے کاموں سے اتنا کچھ مل جاتا ہے کہ مجھے ٹھکوں بھوکوں کی طرح کسی انعام کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔“

”پھر تمہیں ڈوٹی کی کیوں تلاش ہے؟“ میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”ڈوٹی نہیں، ڈینی۔“ اس نے میری تھج کی ”کسی نے ایک مقررہ معاوضے پر مجھ سے اس کی تلاش کا معاملہ طے کیا ہے۔ تمہارے اور اس معاملے میں بس ایک بات مشترک ہے۔ امریکا والے ڈینی کے دشمن ہیں اور تم ایک امریکی کو مروانا چاہتے ہو۔“

میں نے ہنس کر اس کی بات کو اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”جب سے امریکا والے عالمی پولیس میں بن بیٹھے ہیں، ہر جگہ ان کا نام آنے لگا ہے۔ میرا عقائد ان سے نہیں ملے گا۔“ اس نے کہا ”میرے معاملے کو تم اسی گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش

”اس کی فکر نہ کرو۔ وہ بہترین ہاتھوں میں ہے۔ میں نے امراضِ قلب کے شیعے کے گھرانے کو معالے کی نزاکت سے آگاہ کر دیا ہے۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہو گا۔“

”خدا کی قدرت ہے۔“ سلطان شاہ نے چھت کی طرف نظریں اٹھا کر کہا ”دور و بعد جسے جہنم واصل کرتا ہے“ اس کی زندگی کے لیے آج ہم سب پریشان ہیں۔“

”وہ جلد ہی خطرے سے باہر نکال لیا جائے گا۔ اسے جھوڑو اور رستم نے اپنی ملاقات کے بارے میں بتاؤ۔“ اول خان نے اسے گھور کر کہا۔

امراضِ قلب کے شعبے کے نمبروں کو معاملے کی نزاکت سے آگاہ کر دیا ہے۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہو گا۔“

”خدا کی قدرت ہے۔“ سلطان شاہ نے چھت کی طرف نظریں اٹھا کر کہا ”دو روز بعد مجھے جہنم واصل کرنا ہے“ اس کی زندگی کے لیے آج ہم سب پریشان ہیں۔“

”وہ جلد ہی خطرے سے باہر نکال لیا جائے گا۔ اسے چھوڑو اور رستم نے اپنی ملاقات کے بارے میں بتاؤ۔“ اول خان نے اسے گھور کر کہا۔

رستم کے گھڑ باتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا تھا مگر وہ باتیں
خاصی الجھی ہوئی اور بیچ دار تھیں۔ اول خان کے لیے یہ بات
یہ ان کن تھی کہ میں نے رستم کی زبان سے مہاجر بخشی کے دعوے کی
تائید کر دی تھی۔ اس توثیق کے بعد موسیٰ بہت اہم ہو گیا تھا۔

بہترین طبی امداد ملنے کے باوجود وہ جاں برب نہ ہوتا پھر اس کی لاش کو کسی بے نام قبر میں دفن کر کے ہی ہم سکھ کا سانس لے سکتے۔ موتی زندہ رہ کر ہمارے لیے بے ضرر تھا لیکن اس کی لاش سامنے آنے پرستم کسی بھی رد عمل کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔

”اور اب ملنگ بھی اسی قدر اہم ہو گیا ہے۔“ ویرانے اپنی
نست میں ہمیں یاد دلایا۔

”یہ نکتہ میں پہلے ہی سمجھ چکا ہوں۔“ اول خان نے اس کی سید کی ”رستم نے او برائن اور ڈینی کے معاملات میں ایک

سائیت کا ڈاکٹر کے خطرے کی ہتھی بجا دی ہے۔ ڈینی کو اب بہت
 خطرہ رہنا ہو گا۔ رستم کو اس کی بھینک بھی نہیں ملنی چاہیے کہ وہ ڈینی
 سے ملتا رہا ہے۔“

SANIPLAST®

فوری امدادی پیٹی

 NICHIIBAN
JAPAN


FIRST-AID BANDAGE
SANIPLAST®
NICHIIBAN
JAPAN



خریدنے سے پہلے نام ضرور دیکھ لیں۔

SANIPLAST®

فوری امدادی پٹی

SANIPLAST®
سٹی پلاسٹ
FIRST-AID BANDAGE

SANIPLAST®
سٹی پلاسٹ
FIRST-AID BANDAGE

PEEL OFF
NICHIBAN JAPAN
PEEL OFF
NICHIBAN JAPAN

LASERDOT

خریدنے سے پہلے نام ضرور دیکھ لیں۔

Downloaded from

صرف اتنا علم ہے کہ وہ ایس ٹی ایف کے پیچھے ہوئے ایک مریض کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ کسی اور ایجنسی کو اس کے بارے میں تردد میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اداروں میں ایسی ہم آہنگی نہ ہو تو ہر وقت محاذ آرائیاں ہوتی رہیں۔“

”ان معاملات میں تمہاری مداخلت ہم سے زیادہ بہتر ہے۔“ میں نے کہا ”تم مطمئن ہو تو ہم بھی مطمئن ہیں۔“

”بس تو پھر کل منتقلی کا پروگرام طے ہے۔“ ویرا نے اٹھتے اٹھتے ایک غیر ضروری بات دہرائی۔

”سورج طلوع ہوگا تو کچھ سوچا جائے گا۔ ابھی جا کر آرام کرو۔“ میں نے ترشی سے کہا۔

دونوں عورتیں اپنے کمرے میں چلی گئیں تو اول خان بھی اٹھ گیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا ”تم کہاں چلے؟ کیا آج کی رات ہمارے ساتھ نہیں کرو گے؟“

”میں کچھ کاموں میں الجھا ہوا ہوں۔“ اس نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ”جلد منٹ گیا تو واپس آ جاؤں گا ورنہ دفتری میں کرسی دھکی کر لوں گا۔“

وہ واضح طور پر اداسی کا شکار ہو گیا تھا۔ میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔ اس وقت اول خان کو چھینٹنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک دفعہ ہم اپنے نئے ٹھکانے پر منتقل ہو جاتے تو وہ دو چار دنوں میں سب کچھ بھول بھال کر اس عارضی صدمے سے نجات حاصل کر لیتا۔

”کیا ہماری منتقلی کے بارے میں تم اب بھی کسی تذبذب میں پڑے ہوئے ہو؟“ چھت میں لگے ہوئے ٹکے کے دھیمے اور یکساں شور میں پہلی بار سلطان شاہ کی آواز ابھری تو میں چونک پڑا۔ اول خان کے چلے جانے کے بعد میرا ذہن کیسے اور الجھ گیا تھا۔

”یہ کام کل ہو ہی جانا چاہیے۔ صبح ساری کانغذی کارروائیاں مکمل کرانے کے بعد تم ہی عورتوں کو وہاں لے جاؤ گے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”کانغذی کارروائی کیا ہوتی ہے۔ بس اسٹیٹ ایجنٹ کو رقم دے کر کچھ دستخطوں کا تپا لہ کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ناشتے کے بعد یہاں سے چل دینا چاہیے مگر تم اس کا خیر سے خود کو الگ کیوں کر رہے ہو۔“

”میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ موسیٰ کے بیان کی صداقت کو جانچنے کے لیے کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جم کر پُر خیال لہجے میں کہا۔

”کیا چنٹ منو ہر لال کی خانہ تلاشی کا منصوبہ بنا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”رستم کو دیا ہوا کام پورا ہونے تک یہ نکل بھی دور ہو جانی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ

”اب تم اپنی ساری کشتیاں جلا چکے ہو۔“ ویرا نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”بقیہ رقم کی ادائیگی کے لیے پرسوں تمہیں رستم سے ملنا ہی پڑے گا۔“

”یہ ساری احتیاط اسی وقت تک کرنی ہوگی۔ اس کے بعد ہم کوئی نئی راہ تلاش کر لیں گے۔“

”نئی راہ اختیار کرنے سے پہلے پرانے سوراخ بند کرنے کے بارے میں سوچو۔“ ویرا نے مریبانہ لہجے میں مشورہ دیا ”کل کا دن خالی ہے۔ ہم اطمینان سے گلشن اقبال والے مکان میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ اس دوران میں تم ملنگ کو اٹھالو۔ ڈینی کے خلاف اس وقت وہی اکلوتا گواہ ہے۔“

”اسے راستے سے ہٹا دینے کے بعد میری بخشی کے علاوہ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکے گا کہ کرل جمال دستی کون تھا۔ یہ فتنہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔“ سلطان شاہ بولا۔

اول خان کا چہرہ اتر گیا ”کل تم چاروں یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“

”پہلے سے کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔“ میں نے جلدی سے کہا ”ویرا نے ابھی ابھی یہ بات چھیڑی ہے اور میں اس کی رائے سے متفق ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے ہمیں ایس ٹی ایف سے دور رہنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اول خان نے قدرے توقف کے بعد کہا ”تم سوچ سمجھ کر فیصلے کرتے ہو۔ میں تمہاری راہ نہیں روکوں گا۔ تم جب چاہو گے تمہاری روانگی کا بندوبست کر دیا جائے گا۔“

”ملنگ کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔“ خاموشی سے سگریٹ سلگانے کے بعد میں نے سکوت توڑا۔

”تمہیں اس سے دور رہنا چاہیے۔ میں خود ہی اس کا کوئی بندوبست کروں گا۔ اس بار یہ احتیاط ضروری ہے کہ ملنگ کے قہے میں ایس ٹی ایف کا نام نہ آنے پائے۔“

”موسیٰ یہاں موجود ہے مگر تم ایجنسیوں کے استفسار پر اس کے قہے سے اپنی بالا علمی یا لاطعلی ظاہر کر چکے ہو۔ اس مرتبہ بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔“

”میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ موسیٰ کو میرے آدمیوں نے نہیں اٹھایا اور یہ سونی صد حقیقت ہے۔ اس کے بعد مجھ سے کچھ نہیں پوچھا گیا۔ ملنگ کا معاملہ مختلف ہوگا۔“

”موسیٰ کی موجودگی سے تمہارے عملے کے بہت سے لوگ واقف ہیں۔ اب سی ایم ایچ والے بھی آگاہ ہو گئے ہیں۔ اسے کوئی بھی چپک کر سکتا ہے۔ کئی ایجنسیاں براہ راست سرسبز سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہیں تمہارے تکنیکی جھوٹ کی ہوا لگ گئی تو کیا ہوگا؟“ ویرا نے سوال کیا۔

”میرے آدمی صرف مجھ سے رابطہ رکھتے ہیں۔“

آسان ترین حل تھا اور میں نے کچھلی رات سے وہی رویہ اپنایا ہوا تھا۔

ناشتے کے وقت وہ آیا تو شب بیداری اور اعصابی ٹکان کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری رات بہت مصروف گزری ہے۔“ میں نے بہت بڑے تھے لفظ منتخب کر کے اس کی مزاج پر سی کا اخلاقی فرض ادا کیا۔

”میں سمجھ لو۔“ اس نے پھسکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ”تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے کہ موسیٰ کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ اسے بروقت طبی امداد میسر آگئی تھی۔“

”اس کی موت اگر ہمارے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو وہ ایسے دس دوسرے بھی جمیل جائے گا۔“

”تمہارے نہیں، میرے ہاتھوں۔“ اس نے میری تصحیح کی ”تم چاروں تو آج جا رہے ہو۔“

میرے دل میں چور تھا۔ میں مصنوعی انداز میں ہنس پڑا۔

”ہمارے اور تمہارے ہاتھ ایک ہی ہیں۔“

ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ اسٹیشن فور سے ہمارے کوچ کا معاملہ بھی زیر غور آیا مگر وہ ذرا بھی گمبیر نہیں تھا۔ ہم اپنی جانیں بچانے کے لیے کلفٹن والے فلیٹ سے تن کے کپڑوں کے ساتھ فرار ہوئے تھے بعد میں چند جوڑے اور خریدے گئے جو محض ایک کشادہ بیگ میں سما سکتے تھے۔ ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ بیم گن، اول خان کے خصوصی نوادر سے حاصل کی ہوئی چند انگوٹھیوں اور سی ایس ڈی پر مشتمل تھا۔ ویرانے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نہایت خود غرضانہ انداز میں ان اشیاء کو یکجا کرنا شروع کر دیا۔ اول خان مولوی نظروں سے اس کا ردوائی کا جائزہ لیتا رہا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسٹیشن فور سے ہم دو ٹکڑیوں میں بٹ کر روانہ ہوتے۔

میں نے سلیٹی سے آٹھ لاکھ روپے کے مساوی ڈالر لیے تھے۔

رستم کو سات لاکھ دینے کے بعد بقیہ رقم فلیٹ کے کرائے کی ادائیگی اور گھرداری کی دیگر ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے کافی تھی۔

ہم نے کلفٹن اقبال میں جو مکان پسند کیا تھا، تادہ کے فلیٹ کی طرح مکمل آراستہ نہیں تھا۔ اس میں پردے، کچے، قالین اور صرف مسکراہٹ منوجو تھیں۔ بقیہ آرائش کرائے داروں کی مرضی اور جیب پر چھوڑ دی گئی تھی۔ ویرا اور سلطان شاہ اسٹیٹ ایجنٹ کو پیشگی رقم دے کر مکان کا قبضہ لے سکتے تھے اور اپنی گرائی میں گھر کی ضروری صفائی وغیرہ کوا سکتے تھے جبکہ مجھے رستم ایرانی کو دینے کے لیے مزید رقم کا بندوبست کرنا تھا۔

دن میں جہانگیر ایرانی فارسی پر ہوتا تھا۔ میں تنہائی میں سلیٹی کا سامنا کرنے سے ہشمت گھرا تا تھا کیونکہ اسے اچھے پردہ میرے لیے چھوایا کرتے تھے۔

”مجھے تو یہ پنڈت منوہر لال، جو اہر لال کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر ادب و ادب اور رنگین مزاج لیکن اندر سے انتہائی کینہ پرور سازش۔“ وہ تبصرہ کرتے ہوئے اس کی آواز تحقیر آمیز ہو گئی تھی ”اسے دیکھنا کھٹکنا بہت ضروری ہے مگر اس وقت نہیں۔“

”تم بھول رہے ہو کہ رستم ایرانی سے اس کے گہرے مراسم ہیں، موسیٰ کو کسی نے اس رستم کے پاس نوکری دلائی تھی اور اب بھی وہ بیٹھے میں ایک بار رستم سے ملنے ضرور جاتا ہے۔“

سلطان شاہ کی زبان سے رستم ایرانی کا نام ادا ہوتے ہی میرے ذہن کے بند در پیچے وا ہو گئے۔ میں اپنی رو میں بس ایک ہی سمت میں سوچے جا رہا تھا۔ سلطان شاہ نے ایک اشارے سے سارے امکانات روشن کر دیے تھے۔

جس طرح اور برائن کی ہلاکت تک موسیٰ کا زندہ یا کم از کم پوشیدہ رہنا ناگزیر تھا اسی طرح پنڈت منوہر لال کا بے فکر رہنا بھی ضروری تھا۔ اس کا کوئی بھی مسئلہ رستم کے سکون کو درہم برہم کر سکتا تھا۔ اس کے تفکرات میں الجھ کر رستم اپنے معمول کے کاموں سے صرف نظر کر سکتا تھا۔ ان کاموں میں اور برائن کی سرکوبی میرے لیے سرفہرست تھی۔ وہ کام ہر قیمت پر اور بروقت پایہ تکمیل کو پہنچانا ضروری تھا۔

میں نے اٹھ کر محبت سے سلطان شاہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ”بعض اوقات تم بہت دور کی کوڑی لاتے ہو۔ اس وقت میں پنڈت کو سب سے الگ تھک رکھ کر کچھ منصوبہ بنا رہا تھا۔“

”کاموں کے سلسلے میں ان باریکیوں کا دھیان رکھنے کا تجربہ میں نے تم ہی سے حاصل کیا ہے۔“

”اس میں تمہاری محنت کا دخل بھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم مشینی رپوٹ کی طرح صرف میری ہدایات پر عمل نہیں کرتے، غلطیوں پر ٹوکتے بھی رہتے ہو۔“

”غلطیوں پر تو ویرا بھی ٹوکتی ہے لیکن تم نے اس کے ساتھ ایک مدت سے شفقت کا رویہ نہیں اپنایا۔ شاید غلطیوں کی نشان دہی میں وہ مجھ سے آگے ہے۔“

میں اسے کیا بتانا کہ ویرا ذرا سی شفقت سے بہلنے والی مخلوق نہیں تھی۔ میری طرف سے ذرا سی نرمی کا اظہار ہوتے ہی بہت سی محبت کی دعوے دار بن سکتی تھی۔ میں نے سلطان شاہ کا وہ نازک سوال خفیف سی مسکراہٹ میں ٹال دیا۔

رات سکون سے بسر ہو گئی۔ صبح بیدار ہوتے ہی غیر ارادی طور پر میری نگاہ تیسری چارباٹی کی طرف گئی۔ بستر خالی اور بے شکن تھا۔

اول خان نے اپنی ناراضگی کے بھرپور اظہار کے لیے وہ رات شاید اپنے دفتری بیس گزار دی تھی۔

میں اس کے لیے افسردہ ہونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی جذباتی طبعیت کے سامنے بے بس تھا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے لیے

میں اس کے لیے افسردہ ہونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی جذباتی طبعیت کے سامنے بے بس تھا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے لیے

میں اس کے لیے افسردہ ہونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی جذباتی طبعیت کے سامنے بے بس تھا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے لیے

میں اس کے لیے افسردہ ہونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی جذباتی طبعیت کے سامنے بے بس تھا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے لیے

میں اس کے لیے افسردہ ہونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی جذباتی طبعیت کے سامنے بے بس تھا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے لیے

میں اس کے لیے افسردہ ہونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی جذباتی طبعیت کے سامنے بے بس تھا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے لیے

میں اس کے لیے افسردہ ہونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی جذباتی طبعیت کے سامنے بے بس تھا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے لیے

میں ڈرائیور موجود تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ویرا اور سلطان شاہ کو منزل مقصود پر پہنچانے کے ساتھ وہ ہمارا نیا ٹھکانا دیکھ لے اور بعد میں اول خان کی راہ نمائی کر سکے۔ میری گاڑی کے لیے اس نے دانستہ کسی شو فر کا بندوبست نہیں کیا تھا۔

وہ اول خان سے ہماری آخری ملاقات نہیں تھی۔ ہم اسی شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں بسے جا رہے تھے مگر اول خان کے رویے کی وجہ سے ہماری روانگی خاصا جذباتی رنگ اختیار کر گئی۔

ٹیکسی پہلے حرکت میں آئی۔ میں نے بھی گاڑی اس کے پیچھے ڈال دی۔

شارع فیصل پر بڑگ روڈریلو اسٹیشن تک دونوں گاڑیاں اسی ترتیب سے دوڑتی رہیں۔ وہاں سے ٹیکسی واپسی طرف گھوم گئی۔ ہم سیدھے نکلنے چلے گئے۔

”آج میں خود کو بالکل ہلکا اور تروتازہ محسوس کر رہی ہوں۔“ غزال نے کہا۔

”شاید اس لیے کہ آج ہم دونوں ایک طویل مدت کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ کہیں باہر نکلے ہیں۔ ایسی تنہائی تو اب خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔“ میں نے ایک گمراہ سانس لے کر جواب دیا۔

”شکر ہے کہ یہ باتیں آپ کے دل کے نماں خانوں میں بھی موجود ہیں۔ مجھے کبھی کبھی تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ سوچنے لگی ہوں۔“

میں نے اس کے نرم و گداز ہاتھوں پر پیار سے چھکی دے کر کہا ”میں بھی تمہاری طرح جوان ہوں۔ میرے دل میں بھی انگلیں اور آرزوئیں اگڑائیاں لپکتی ہیں مگر کام کی خاطر مجھے ان خواہشوں کو تھکیاں دے دے کر سلاتا پڑ جاتا ہے۔ یہ وقت سدا یوں ہی نہیں رہے گا۔“

”میں سوچتی ہوں کہ میں نے آپ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر کے آپ کو ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ میری وجہ سے آپ کھلے ذہن سے کہیں ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔“

”تمہاری دونوں باتیں غلط اور عقل سے خالی ہیں۔ شادی کا فیصلہ ہم میں سے کسی کا نہیں تھا۔ مکاؤ کے ذہن نے ایک چینی مولوی کے ذریعے ہم دونوں کو اس رشتے میں یک جا ہونے پر مجبور کیا تھا۔“ میں نے ہنس کر اسے ماضی کا خوش گوار آئینہ دکھایا۔

”اس کے بعد بھی ہم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ جب کوئی خوں خوار حریف سامنے آ جاتا ہے تو میں بھول جاتا ہوں کہ میرا کسی سے کوئی رشتہ ہے یا کسی کو میری صحیح و سلامت واپسی کا انتظار ہوگا۔ تمہارا خیال کبھی میرے قدموں کی زنجیر بنا نہ بنے خیالوں کی لگام۔“

توڑیہ تھا کہ غزالہ بھی میرے ساتھ ہوتی۔ ہم دونوں سلیٹی سے رقم لے کر براہ راست کلشن اقبال والے سٹے گھر پہنچ سکتے تھے۔ یہ تجویز سن کر اول خان بول پڑا۔

”یہ خیال رکھنا کہ اور رائن کے سلسلے میں خرچ ہونے والی رقم تمہیں جلد ہی واپس مل جائے گی۔“

میں ہنس دیا ”مجھے معلوم ہے کہ تم سات لاکھ روپے کے لیے اوپر بات کر چکے ہو۔ اب اس رقم کو دس لاکھ کرنے سے شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔۔۔“

”کیسے شبہات!“ اول خان میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بھڑک اٹھا ”مگر رستم نے پہلے سات لاکھ ٹانگ کر بعد میں دس لاکھ کا مطالبہ کر دیا ہے تو اس میں شبہ کیا؟ ایس ٹی ایف میں سارے ہی معاملات ایمان داری اور باہمی اعتماد پر چلتے ہیں۔“

”پھر بھی میں یہ نہیں چاہوں گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”اس اہم قومی مقصد کے حصول کے لیے ہم کبھی تھوڑی سی سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم ہمارے کسی مطالبے کے بغیر سات لاکھ روپے کی ادائیگی کا بندوبست کر چکے ہو۔“

”وہ بات پرانی ہو گئی۔ میں نے آج صبح ہی فون پر اسلام آباد بات کر کے رقم میں اضافہ کر دیا ہے۔ اب دس لاکھ کی پوری رقم آئے گی۔“ اس نے کہا۔

”سرخ فیتے یا کسی کانڈی کارروائی کے بغیر اتنی بڑی رقم سیکرٹ فنڈ سے ہی مہیا کی جاسکتی ہے۔“ ویرا نے خیر زدہ لہجے میں کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ رقم کہاں سے فراہم کی جائے گی۔ بس یہ یقین ہے کہ کام پورا ہونے کی اطلاع ملنے ہی رقم بھیج دی جائے گی۔“ اس کے ایک ایک لفظ سے بھرپور اعتماد جھلک رہا تھا۔

”اتنی آسانی سے پورے دس لاکھ واپس مل سکتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مجھے تو یہ خیال تھا کہ آؤٹ والے ایک ایک پیسے کے خرچ کو شے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تین لاکھ روپے کا اضافہ وہ ہضم نہیں کر سکیں گے۔“ میں نے خوش دلی سے اس کی پیشکش قبول کر لی۔

”ایس ٹی ایف کے خرچ کا کوئی آؤٹ نہیں ہوتا۔“ اول خان نے میری معلومات میں اضافہ کیا ”رستم تم کو دس لاکھ تو کیا دس روپے کی رسید بھی نہیں دے گا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بڑے بڑے غنیم رسیدوں اور اندراجات کے ہیر پھیر کے ذریعے ہی ہوتے ہیں۔ جہاں بات ایمان اور اعتماد پر چھوڑ دی جائے اسکیڈنڈل کم ہی بنتے ہیں کیونکہ ایسے اخراجات کی تصدیق غیر روایتی انداز میں سینہ بہ سینہ کی جاتی ہے جس کی کسی کو بھنگ نہیں ملتی۔

گیارہ بجے ہم روانگی کے لیے تیار تھے۔ اول خان نے ہمارے لیے دو الگ الگ گاڑیاں بندوبست کر کے انتظار میں رکھی تھیں۔

دھوم مچا دیں گے۔

”دھوم مچانے والی شاعری کتابوں اور مشاعروں سے چلتی ہے۔ میری کتاب کوئی چھاپنے پر آمادہ نہیں ہو گا کیونکہ دینی انتہائی غیر شاعرانہ تخلص ہے اور مشاعرے میں گیا تو وہاں سی آئی اے والے دھاوا بول کر مجھے اٹھالے جائیں گے۔ امریکیوں کو اردو شعر اور شاعر کے قتل پر ذرا بھی ندامت نہیں ہوگی۔“

غزالہ ہنسی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔

جہانگیر کے دروازے پر ڈور بیل بجتے ہی وہاں کام کرنے والی بچی نے دروازہ کھولا مگر اس کے کسی سوال سے پہلے، سہلی خود اس کے پیچھے آ موجود ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسرت کی ایک عجیب سی حیوانی چمک دوڑ گئی۔ اس نے فوراً ہی پورا دروازہ کھول دیا۔

پہلے اس کی نظر غزالہ پر نہیں پڑی تھی۔ پورا دروازہ کھولنے پر جب اس نے غزالہ کو اپنے روہر پایا تو اس کے والمانہ انداز میں یکایک تبدیلی آگئی اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”اوہ۔۔۔ تو آج تم بھی ساتھ آئی ہو!“ سہلی نے خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھونڈے انداز میں غزالہ کا استقبال کیا ”رک کیوں گئے؟ دونوں اندر آ جاؤ۔“

”تم دروازے سے ہٹ کر راستہ دو گی تو ضرور اندر آئیں گے۔“ میں نے احساس دلایا ”ہم دروازے پر مزاج پر سی کرنے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔“

شرمنہ ہو کر اس نے ہمیں راستہ دے دیا۔ جھینپ مٹانے کے لیے اس نے ملازمہ کا بازو پکڑ کر اسے بھی پیچھے کھینچ لیا ”بچ میں کیا کھڑی ہے۔ ہٹ کر مہمانوں کو اندر آنے دے۔“

لوکی کھیا کر اندر چلی گئی۔ سہلی ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

”بیٹھو۔۔۔ کو، اس وقت کیسے آنا ہوا؟“ اس نے رسی اور پر تکلف لہجے میں غزالہ سے پوچھا۔

”تم نے خود کسی دم دلا سے بے بغیر سوال کر ڈالا ہے تو سن لو کہ ہم غلت میں ہیں۔ مجھے مزید کچھ ڈالر درکار ہیں۔ شاید ہمیں آج ہی مکان کا قبضہ مل جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”رہ تمہاری امانت ہے۔ چاہو تو سب لے لو۔ یہ مکان تم نے کتنے میں خریدا ہے؟“ میرے بے لوج رویے سے مایوس بلکہ پریشان ہو کر سہلی ہمیں بٹھانا بھی بھول گئی۔

”اٹھارہ لاکھ کا پڑے گا۔“ میں نے مستقبل کی پیش

اترنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہوں۔“ اس وقت غزالہ یکایک ہی ایک شخص سی بچی بن گئی تھی اور میری بات پر روکھی روکھی سی لگنے لگی تھی۔

”غزالہ، مالی ڈرائنگ! تم اتنی نا سمجھ تو نہیں ہو۔ شاعری اور تصورات کی دنیا حقیقت سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ جب آدمی کی جان پر بن جاتی ہے تو اسے اپنی کوئی جان یا محبوبہ یا بیوی یاد نہیں آتی، صرف خدا یاد آتا ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے مذہب کے مطابق خدا کو ہی پکارتا ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے دشمن پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ جان بچ جائے اور وہ سرخ رو رہے تو پھر اپنی جان کی آغوش میں اس سنگین کہانی میں رنگیں لکھے جو ذکر ایک نیا لطف لیتا ہے۔“

”جان، جان کے چکر میں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی ”چلیں یہ تو دشمن اور دشمنی کی بات ہوئی۔ چاہنے والے تو ایک دوسرے کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔“

”وہ بزدل ہوتے ہیں۔ ان میں ہارنے کی ہمت ہوتی ہے، نہ جینے کی امنگ۔ چاہنے کا تعلق جسم اور وجود سے نہیں، جذبول سے ہوتا ہے۔ میں تمہیں اس وقت سے چاہتا ہوں، جب میں نے تمہیں چھوا بھی نہیں تھا پھر ایسا وقت بھی آیا جب ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہو گئے، مجھے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ تم زندہ ہو یا دیر کے اندھے انتقام کا نشانہ بن چکی ہو۔ اس وقت بھی میری چاہت میں کوئی دراڑ نہیں آئی۔۔۔“

”اس وقت میرے ساتھ صرف میری باتیں کریں۔ میں ان باتوں کے لیے ترسی ہوئی ہوں۔ اس وقت ویرا کا نام نہ لیں۔ وہ رفتہ رفتہ میرے اعصاب کے لیے ایک۔۔۔“

”بس! اب اس پر اپنے الفاظ برباد مت کرو۔“ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ میری انگلیوں کا ایک نرم سا بوسہ لے کر خاموش ہو گئی اور میں نے اس کے دل میں چھپی ہوئی عورت کو ان چاند ستاروں کی کمنائیاں سنائی شروع کر دیں جو اس کے حسن کی ذرا سی رمت پر اگر خلا کی بے گراں وسعتوں میں پر نور نکتوں کی طرح دیکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہمارا سفر باتوں کی محویت میں گزر گیا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں گاڑی جہانگیر کے فلیٹ والے بلاک کے قریب روک چکا تھا۔

”کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ جیسا بے جگر آدمی ایسی شاعرانہ باتیں کر سکتا ہے۔“ غزالہ نے میرا بازو دبا کر بھاری آواز میں کہا ”آپ شاعری شروع کر دس تو ہر طرف

بندی کرتے ہوئے کہا ”کل آٹھ لیے تھے۔ آج پانچ اور دے دو۔ باقی چند روز بعد درکار ہوں گے۔“
 ”بیٹھ کر کچھ چائے وغیرہ تو پی لیتے یا یوں ہی واپس جانے کا ارادہ ہے۔“

سلمی کے وہ الفاظ بے جان اور خلوص سے عاری تھے۔ مجھ سے پہلے غزالہ بول پڑی ”پھر کبھی فرصت سے آئیں گے۔ آج مالک مکان سے ملاقات کا وقت طے ہے۔“
 ”ویسے ہم بیٹھ جاتے ہیں، تم اطمینان سے رقم لے آؤ۔“ میں نے بیٹھے ہوئے کہا۔
 ”مجھے ڈار بتادو۔ روپوں کا حساب خود کرتے رہنا۔“ سلمیٰ نے رکھائی سے پوچھا۔

حساب میں نے راستے میں ہی لگا لیا تھا۔ میرا جواب سن کر وہ ڈار تنگ روم سے نکل گئی۔
 ”اس وقت سلمیٰ کچھ اکٹری اکٹری سی نظر آ رہی ہے۔ کیا کل کوئی جھڑپ ہو گئی تھی؟“ اس کے چلے جانے کے بعد غزالہ نے سرگوشیاں لہجے میں سوال کیا۔
 ”کل تو یہ کسی لہلہ کی طرح چمک رہی تھی۔ آج شاید اسے جھانگیر سے گھڑا ناشتا ملا ہے۔ میرے حساب سے اسے تم سے لپٹ جانا چاہیے تھا۔“ میں نے بات بنائی۔
 ”مجھ سے یا آپ سے۔۔۔؟“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر بے گاڑ کے شوخی سے پوچھا ”آپ کے بارے میں دیر غلط نہیں کہتی۔۔۔“
 ”تم نے پھر اس کا نام لیا؟“ میں نے اسے گھورا ”اس کے بارے میں تم ہی نے کچھ کہا تھا۔“

اسی وقت بیلا نامی ملازمہ ایک ٹرے میں ٹھنڈے مشروب کے دو گلاس لے آئی۔ لڑکی بچپلی رات مجھ سے مانوس ہو چکی تھی۔ میں نے پیار کے ساتھ اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔
 ”یہ کون ہے؟“ بیلا کے چلے جانے کے بعد غزالہ نے سوال کیا۔

”سلمی کی ملازمہ اور اس کے گھر میں ایک نئے فساد کی جڑ۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
 ”میں سمجھی نہیں۔“ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بات اس کے لیے نہیں پڑی تھی۔
 ”جھانگیر اس سے دگنی عمر کی ملازمہ کا مطالبہ کر رہا ہے“ سلمیٰ اسی عمر پر ہند ہے۔“

غزالہ بے ساختہ ہنس پڑی ”مبالغہ آرائی کوئی آپ سے سیکھ۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی گھڑباز نہ بتا دے۔“

انتاہد سیدھانیں رہا ہوگا۔“

”اب خاموشی سے شربت پیو۔ سلمیٰ کو تمہاری سرگوشیوں کی ہنک مل گئی تو وہ سمجھے گی کہ تم اس کی برائیاں کر رہی ہو۔ اس وقت وہی ہماری خزانچی ہے۔“
 گلاس خالی ہونے سے پہلے سلمیٰ سو ڈالر کے نوٹوں کی شکل میں مطلوبہ رقم لے آئی۔ اس نے حسب معمول رقم گننے پر اصرار کیا اور میں نے ہمیشہ کی طرح انکار کر کے وہ پستی سی گدڑی غزالہ کو دے دی۔ ڈالروں کی شکل میں بڑی مالیت کے نوٹوں کی تعداد مت کم رہ گئی تھی۔

کام ہو جانے کے بعد ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ سلمیٰ سے اجازت لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں دیر اور سلطان شاہ کو موجود ہونا چاہیے تھا۔
 ان دونوں کے ساتھ اسٹیٹ ایجنسی میں کام کرنے والا لڑکا بھی وہاں موجود تھا اور دو افراد پوری مستعدی سے گھر کی صفائی میں مصروف تھے۔

”شاہ صاحب نے ذرا سی دیر میں سارا کام مکمل کر دیا۔“ مجھے دیکھ کر اسٹیٹ ایجنٹ نے خوشامد انداز میں سلطان شاہ کی کارکردگی کی تعریف کی۔
 سلطان شاہ نے شناخت کی تاخیر ضرورت کے تحت وہ معاہدہ اپنے اصل نام یعنی سید محمد سلطان شاہ کے مخفف کے ساتھ کیا تھا جو سٹ کر صرف ایم ایس شاہ رہ گیا تھا۔ یہ بات ہمارے درمیان طے پا چکی تھی اس لیے غزالہ بھی شاہ صاحب کی اصطلاح کو ہنسم کر گئی۔

اسٹیٹ ایجنٹ ہمارے مفروضہ سامان کی منتقلی میں بھی ہمارا ہاتھ پٹانے پر تیار ہوا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ ہماری کل کائنات صرف ایک بیگ پر مشتمل تھی جو ہمارے ساتھ موجود تھی۔

وہ ایجنسی کا مالک نہیں بلکہ ملازم تھا اور کسی انعام کے لالچ میں ہمارے سروں پر سوار تھا۔ سلطان شاہ یہ رمز میں پاس کا تھا۔ اس نے علیحدگی میں مجھے بتایا کہ وہ ہر جنس کرنے کے باوجود اس سے چھٹکارا پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔
 ”اسے دو سو روپے تمہارے اور پھر دیکھو کہ وہ کتنے سیکند میں اسے رکھتا ہے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”سلطان شاہ سدا کا سعادت مند تھا۔ اس نے مشورے پر فوری عمل کیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے کرائے کی مدد میں ایک مٹت دو ہزار روپے کی کمی کا حوالہ دے کر انعام کی رقم میں اضافہ چاہا۔ سلطان شاہ نے سو روپے کا مزید ایک نوٹ اسے تھما دیا اور وہ ہم چاروں کو جھک جھک کر سلام کرتا ہوا تیزی

سے بھانک سے نکلتا چلا گیا۔ انعام کی وہ رقم اس کے لیے بہت زیادہ نہیں تو بومیہ اجرت سے یقیناً زیادہ تھی۔

”مکان چھ سو گز پر ہے مگر اس میں خوبی یہ ہے کہ خواب گاہیں چار ہیں۔“ صفائی کرنے والوں کو رخصت کرنے کے بعد ویرانے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”جو تھی خواب گاہ میں تمہیں کیا افادیت نظر آ رہی ہے؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”اول خان کی مسمان داری کی جاسکتی ہے۔“ ویرانے باری باری ہمارا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”یا پھر ذہنی اور غزالہ میں فساد ہو جائے تو یہ دونوں الگ الگ کمروں میں سو سکتے ہیں۔“
”خدا کے لیے دیر!“ غزالہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر احتجاج کیا ”اپنی زبان سے ایسے منخوس کلمات تو نہ نکالو۔ خدا خدا کر کے ہمیں یہ ٹھکانا نصیب ہوا ہے تو تم نے ابھی سے بد شگون شروع کر دی۔“

”ایک امکان تھا جو میں نے ظاہر کر دیا۔“ اس نے اپنے شانے اچکا کے بے پروائی سے کہا ”اسے رو دینا ہونے سے روکنا یا نہ روکنا تمہارے اختیار میں ہے۔“

”ویرا! بد گوئی اچھی عادت نہیں ہوتی۔“ سلطان شاہ نے بھی اس پر آنکھیں نکالیں ”ان باتوں میں پڑنے کے بجائے مجھے کراگری اور چچی کے سامان کی ایک فہرست بنا کر دو تاکہ میں خریداری کر لاؤں۔ یہاں چائے بنانے کے لیے بھی کوئی برتن دستیاب نہیں ہے۔“

”غزالہ کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ تمہارا کام آسان کر دے گی۔ اجناس کے ساتھ خورد و نوش کی کچھ سرہند چیزیں بھی لے آنا تاکہ فوری گزارہ ہو سکے۔“

ویرانے دانستہ غزالہ کو ساتھ لے جانے کی پیش کش کی تھی۔ غزالہ نے اس مشورے پر تیوریاں چڑھا کر کہا ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے بجائے تم چلی جاؤ۔“

”میرے باہر نکلنے پر ذہنی نے کڑی پابندیاں لگائی ہوئی ہیں۔“ ویرانے مکاری سے جواب دیا ”بھرے بازار میں“ میں ہر ایک کی نظر کا مرکز بن جاؤں گی۔“

میں اس زبانی زور آزمائی میں پنہاں مفہوم کو خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ویرا میرے ساتھ کچھ دیر کے تنخیلے کی خواہاں تھی اور وہ دونوں اسے ایسا کوئی موقع فراہم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ میں خود بھی ان دونوں کا طرف دار تھا۔ میں نے ویرا سے کہا ”چلو فہرست بنا دو!“

”میں اردو لکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ انگریزی میں بہت سی چیزوں کے نام اتنے پیچیدہ ہیں کہ سلطان شاہ کی بھی سی

کھوپڑی پر سے گزر جائیں گے۔“ اس کے پاس دوسرا عذر تیار تھا۔

”آؤ!“ غزالہ کے تیور خراب ہو گئے اور وہ سلطان شاہ کے ساتھ وہاں سے چل دی ”فہرست بنانے میں کوئی ہاتھی گھوڑے نہیں لگتے۔“ ویرا کو سنانے کے لیے اس نے جاتے جاتے اونچی آواز میں کہا اور ویرا الوفرانہ انداز میں ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجانے لگی۔

میں وہاں سے اٹھا تو اس نے مجھے ٹوک دیا ”تم کہاں چلے؟“
”فون تلاش کرنے۔ ایجنٹ نے کہا تھا کہ اس گھر کا فون کام کر رہا ہے۔“

”ایسا ہی کوئی ضروری کام ہے تو تم اپنا موبائل فون بھی استعمال کر سکتے ہو؟“ اس نے طنز کیا۔

”موبائل فون کے ساتھ ہی ایس ڈی کے استعمال سے میں لاعلم ہوں۔“ میں نے بھی تلخی سے جواب دیا اور اپنی راہ ہولیا۔ وہ وہاں اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

پہلی خواب گاہ میں ہی فون مل گیا جو کام کر رہا تھا۔ سلطان شاہ بھی اسی کمرے میں بیٹھا غزالہ کے مشورے سے خریداری کی فہرست تیار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں خوش ہو گئے۔

”اچھا کیا کہ آپ بھی اٹھ آئے۔“ غزالہ نے مسرت آمیز مگر بچی آواز میں کہا ”کبھی کبھی وہ اپنی حد سے زیادہ تجاؤز کرنے لگتی ہے۔“

”زبان بند رکھو۔ اس کے کان بہت لمبے ہیں۔“ میں نے تیز سرگوشی میں کہا پھر سلطان شاہ سے مخاطب ہو کر کہا ”سامان کے تھیلے میں سے سی ایس ڈی نکال دو۔“

سلطان شاہ فہرست ادھوری چھوڑ کر پھولے ہوئے تھیلے کی طرف بڑھ گیا۔

سی ایس ڈی کے دو تاروں کو فون لائن سے منسلک کرتے ہوئے میرے ذہن میں دو کام موجود تھے۔ پہلے اول خان کو اپنے نئے فون نمبر سے مطلع کرنا اور اس کے بعد امریکی قونصل خانے میں اوبراٹن ڈی ہنٹ کے ڈائریکٹ فون پر رابطہ کر کے اس کے جانشین کو ادبی کے عبرت ناک حشر کے بارے میں وارننگ دینا۔

تار جوڑتے ہوئے میں نے سوچا کہ اول خان ایسی چھپر چھاڑ کو بیشہ غیر ضروری قرار دے کر اس سے گریز پر زور دیتا رہا ہے۔ اسے میرے عزائم کا علم ہوتا تو وہ لامحالہ مجھے وہی مشورہ دیتا جو بیشہ سے دیتا چلا آیا تھا جب کہ میرے لیے وہ اتنا کاسلہ تھا۔

معقول سوال

پولیس نے جوئے کے شے میں مکان پر چھاپا مارا تو چار افراد میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں تاش کی گڈی تھی۔ کچھ تاش میز پر تھے۔ کچھ رقم بھی پڑی تھی۔

”تم تاش کے ذریعے جو کھیل رہے تھے؟“ پولیس نے اصل انداز میں کارروائی شروع کرنے سے پہلے ایک شخص سے پوچھا۔
”میں...؟ ہرگز نہیں۔ میں تو بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”تم تاش کھیل رہے تھے؟“ دوسرے سے پوچھا گیا۔
”ہرگز نہیں۔ میں تو میاں اجنبی ہوں۔ راست پوچھنے رکا تھا۔“

”تم تاش کھیل رہے تھے؟“ تیسرے سے پوچھا گیا۔
”ہرگز نہیں۔ میں تو بیٹھا لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔“ جواب ملا۔

آخر پولیس والے اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے جس کے ہاتھ میں گڈی تھی ”تم ضرور تاش کھیل رہے تھے۔“
”لیکن کس کے ساتھ...؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

اوبرائن ڈی ہنٹ نئی دہلی میں رستم ایرانی کے کسی ہر کارے کے ہاتھوں مارا جاتا تو دافنے کی نوعیت کے لحاظ سے اس کی تفتیش ہوتی رہتی۔ کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ اس کے جنم و اصل ہونے میں میرا ہاتھ تھا۔ امریکیوں کے دلوں پر اپنی ہیبت پر قرار رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کی اولیٰ کے قتل سے پہلے اپنی پیش گوئی ان کے کانوں تک پہنچا دینا تاکہ بعد میں وہ اسی ایک سمت میں سوچنے پر مجبور ہو جاتے۔

اس نتیجے پر پہنچ کر میں نے ان دونوں کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور فون پر اولیٰ کے دفتر کا ڈائریکٹ نمبر ملا لیا۔
دوسری گھنٹی پر ایک سلیجی ہوئی باوقار آواز میرے کانوں میں آئی ”ہیلو، کون بول رہا ہے؟“
”یہ کال ریکارڈ کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ لائن ڈراپ ہو جائے گی۔“ میں نے انگریزی میں جواب دیا ”میں تم کو اوبرائن کے انجام سے آگاہ کرنا چاہ رہا ہوں۔“

”اوہ! تو تم اوبرائن کے قاتل ہو؟“ حیر اور خوف میں ڈوبی ہوئی وہ آواز میرے کانوں میں کسی نئے کی طرح گونجی ”تمہاری یہ جرات کہ تم فون پر اپنے اس گھٹاؤنے جرم کا اعتراف کر رہے ہو۔“

میری بات مکمل ہونے سے پہلے کیے جانے والے ان فقروں سے صاف ظاہر تھا کہ رستم اپنے قول کا پکا ثابت ہوا تھا۔ اس نے وقت سے پہلے ہی اپنا کام پورا کر لیا تھا۔
”ہاں، اگر یہ کوئی جرم ہے تو میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ کان کھول کر سن لو کہ اس کی راہ پر چلنے والے ہر شخص کو اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔“

”تم مندرے ایٹمی سور۔ کالے بد معاش۔“ میرے مخاطب کی زبان سے گالیوں کا ایک بے ساختہ طوفان ابل پڑا اور شاید اسی دوران میں اس نے میری ہدایت کو نظر انداز کر کے کال کسی اور کو سنا لیا یا ریکارڈ کرنے کی کوشش کی۔
سی ایس ڈی کے ذریعے فون بند ہو گیا۔

”یا ہوسہ!“ میں نے ریسپورڈ کر ڈیل پر رکھ کر جذبات سے بے قابو ہو کر لغو لگایا اور وہ دونوں اچھل پڑے۔ دیر ابھی ہو کھلائے ہوئے انداز میں دوڑتے ہوئے وہاں آگئی۔
”کیا ہو گیا۔؟“ تم کس سے بات کر رہے تھے...؟ کس جرم کا اعتراف کیا ہے تم نے...؟“ تینوں نے بے یک وقت میرے اوپر سوالوں کی یلغار کر دی۔

”میں اوبرائن کے جانشین سے بات کر رہا تھا۔ اس نے انکشاف کیا ہے کہ اوبرائن جنم واصل ہو چکا ہے۔“ میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں ان تینوں کو بتایا۔

ہم میں سے ہر ایک کے لیے وہ سمت بڑی غیر تھی۔ چند لمحوں کے لیے ان کے چروں پر حیرت اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیات طاری رہیں پھر وہ تینوں اپنی خوشی کے اظہار کے لیے مجھ سے لپٹ گئے۔

کمرے میں چشم زدن میں جشن کا سا سماں ہو گیا۔ سب اپنے اختلافات بھلا چکے تھے۔ سب کچھ سن لینے کے باوجود ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بڑی خیراتی جلد اور آسانی سے

ہمیں مل جائے گی۔

”یہ مکان ہمارے لیے مبارک ثابت ہوا ہے۔ یہاں قدم رکھتے ہی ہمیں یہ اچھی خبر ملی ہے۔“ سلطان شاہ نے مسرت سے سرشار لہجے میں کہا ”تمہیں اس وقت اور اس کے دفتر فون کرنے کی کیا سوجھی تھی۔“

”خبر میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ میں انہیں دھکنا چاہ رہا تھا۔“

”وہ کب اور کیسے مارا گیا؟“ غزالہ تفصیل جاننے کے لیے تاب تھی۔

”تازہ واقعہ معلوم ہوتا ہے دیکھتے ہیں کہ اول خان کیا کتا ہے۔ اس کے پاس ہمارا فون نمبر بھی نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے دوبارہ ریسیور اٹھالیا۔

اول خان کی آواز میں ولولے یا ظفر مندی کی کوئی رمت نہیں تھی۔ شاید وہ اس وقت بھی ہمارے پچھڑنے کا سوگ منا رہا تھا۔

”تم مایوسی کی کن دلدلوں میں دھنسے ہوئے ہو؟ تمہیں علم نہیں کہ ادبی مارا جا چکا ہے؟“ میں نے کسی تہمد کے بغیر اس سے سوال کیے۔

”کیا؟“ وہ گویا گہری نیند سے اچانک جاگ اٹھا ”ادبی مارا گیا؟ یہ کب کی خبر ہے؟“

”مجھے مختصر ترین خبر ملی ہے۔ اس کی تصدیق اور تفصیل حاصل کرنے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔“

”خبر کا ذریعہ کیا ہے؟“ اس کی آواز بیجان آمیز ہو گئی

”کسی نے تم سے مذاق تو نہیں کیا؟“

”یہ ادبی کے جانشین کے الفاظ ہیں۔ سی ایس ڈی لگانے کے بعد میں نے اسے فون کیا تھا۔“

”میں تھوڑی دیر میں موبائل پر تم سے رابطہ کرتا ہوں۔“

شاید یہ اسی صبح کا واقعہ ہے۔ اسلام آباد والوں کو اب تک ضرور بھک مل چکی ہوگی۔“

میں نے اسے اپنا نیا فون نمبر نوٹ کروانے کے بعد فون بند کر دیا۔

”تم فوراً بازار جاؤ اور ضروری خریداری کر کے لوٹ آؤ۔“ خبر پھیلنے کے ساتھ خطرات بڑھ جائیں گے۔ ہمیں یک جا رہ کر ایک دوسرے کی حفاظت کرنی ہوگی۔“ میں نے سلطان شاہ سے کہا۔

اس وقت صورت حال بالکل بدل چکی تھی۔ مذاق یا بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ سلطان شاہ گاڑی لے کر نکل گیا کیونکہ ایس ٹی ایف کا آدمی ان دونوں کو پچھانے کے

بعد ٹیکسی واپس لے جا چکا تھا۔ ہمارے استعمال کے لیے اول خان کی فراہم کی ہوئی اکھوتی کار رہ گئی تھی۔

”اب کل رات تک کا وقت بہت کڑا ہے۔“ ویرانے سگریٹ سلگا کر پُر خیال لہجے میں کہا ”رستم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اسے بروقت رقم مل جانی چاہیے۔“

”اگلی رات کا انتظار ہم سب کے اعصاب کو بکھیر کر رکھ دے گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا ”اس نے اپنا کام کر دیا، ہمیں اپنی ذمہ داری سے بے گدوش ہو جانا چاہیے۔“

”اسی میں دانش مندی ہے۔“ غزالہ نے میری تائید کی ”وقت گزرنے کے ساتھ رستم کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اس نے بارود کے ڈھیر میں جنگاری ڈالی ہے۔ تمہارے ساتھ اس کے روپے میں تبدیلی آسکتی ہے۔ ویسے بھی وہ ڈینی کے پیچھے لگا ہوا ہے۔“

”اپنے اصول کے مطابق اس نے بخشی سے پیشگی رقم بھی لے رکھی ہوگی۔“ ویرانے رائے زنی کی ”ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ وہ اپنے گاہکوں سے وعدہ خلافی نہیں کرتا۔“

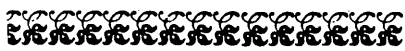
”اور اس کے دفتر سے اس وقت بہت اہم خبر ملی ہے مگر یہ بُرا ہوا کہ اس واقعے کے پیچھے آپ کی کارکردگی کا راز فاش ہو گیا۔“ غزالہ نے نرمی سے کہا۔

”غصیت یہ ہے کہ اس نے بہت کچھ کہا مگر ڈینی کے طور پر میرا نام نہیں لیا۔“ میں نے اپنے ذہن میں اس گفتگو کا اعادہ کرتے ہوئے جواب دیا ”نہ میں نے اسے اپنا نام بتایا پھر بھی وہ سب جانتے ہیں کہ انہیں اس طرح فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔“

”کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لوٹا ہے نہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ جو ہو چکا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ انہیں دھمکی دیتے ہوئے مجھے اور برائے قتل کا اندازہ نہیں تھا۔ میرا ابتدائی تقوُّدو معنی تھا۔ اس کا ردِّ عمل سننے ہی میں نے بات بتائی تھی مگر پھر بھی اس ٹیلی فون کال میں ایک سقم تھا۔“

میں نے اور برائے ڈی ہنٹ کے قتل سے پہلے رابطہ کیا ہوتا تو میری بات کی صداقت پر سو فی صد یقین کر لیا جاتا مگر میں نے واردات کے بعد اس نمبر پر فون کیا تھا۔ فون سننے والے کے اضطرابی ردِّ عمل کے باوجود یہ امکان باقی تھا کہ میری اس کال کو جینی قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا۔

ان کی صفوں میں موجود کئی بقراطیہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ ڈینی نے اور برائے ڈی ہنٹ کی موت کی خبر سن کر اس کا سہرا اپنے سر پہننے کی کوشش کی ہے۔ فون سننے والے نے



سوال

ایک پارٹی میں ایک دولت مند شخص نے اعلان کیا کہ جو شخص قسم کھا کر یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہے، وہ اس کی خدمت میں ایک لاکھ روپے کا نذرانہ پیش کرے گا۔

ایک صاحب اٹھے اور بولے ”میں ایک خوب صورت بیوی کا شوہر ہوں۔ تین پیارے پیارے بچے ہیں۔ کاروبار شاندار ہے۔ میں زندگی سے بالکل مطمئن ہوں۔“

ایک نوجوان بولا ”میں غیر شادی شدہ ہوں۔ شاندار عہدے پر فائز ہوں۔ نئی گاڑی ہے۔ اچھا بنگلا ہے۔ زندگی میں کوئی فکر پریشانی نہیں۔ میرا خیال ہے میں زندگی سے بالکل مطمئن ہوں۔“

اس طرح تقریباً ہر شخص نے اپنے آپ کو زندگی سے خوش اور مطمئن قرار دیا۔ تب دولت مند شخص اٹھا اور افسوس زدہ لہجے میں بولا ”میری سمجھ میں نہیں آتا جب آپ سب لوگ زندگی سے اس قدر مطمئن ہیں تو میرا ایک لاکھ روپے کا انعام کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“



دے دے گا۔“ میں نے کہا۔

”کوئی اچھی خبر ہوئی تو میں فون کروں گا۔ تم بھی مجھے اپنے پروفیگرام سے باخبر کرتے رہنا۔“
”وہ ٹریفک کے حادثے میں بڑی طرح مارا گیا ہے۔“ میں نے ان دونوں کو خنی خبر سنائی۔

”یہ اچھا ہوا۔“ غزالہ بے ساختہ بولی ”نہیں یقین کرے گا کہ آپ کراچی میں بیٹھ کر نئی دہلی کا ٹریفک کنٹرول کر سکتے ہیں وہ آپ کے فون پر توجہ نہیں دیں گے۔“

ٹریفک کنٹرول کرنے والے وہاں کے ٹریفک

دھیان دیا ہوتا تو وہ یہ بتا سکتا تھا کہ میری کال بیرون ملک سے نہیں تھی اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ کراچی یا پاکستان کے کسی حصے میں بیٹھا ہوا شخص کم و بیش اسی وقت نئی دہلی میں کسی کو فون کر سکے۔

وہ ہماری خوش فہمیاں تھیں۔ وہ لوگ کس نتیجے پر پہنچتے اور کیا حکمت عملی اختیار کرتے؟ اس کا انحصار اوپر اٹن کی ہلاکت کی تفصیلات پر تھا مگر ایک بات ناگزیر تھی کہ ہمیں جلد از جلد رستم سے اپنا حساب صاف کر لینا چاہیے تھا۔ اس میں تاخیر ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اوبرائن کے دفتر میں نے اپنی مرضی سے فون کیا تھا۔ رستم کے بارے میں مجھے دیر اور غزالہ کا مشورہ بھی حاصل تھا۔ اس کے میاں ایچمنج کے ذریعے بات ہوتی تھی اس لیے مجھے رنگ کرنے سے پہلے سی ایس ڈی کو آف کرنا ہوتا تھا۔ میں نے اس کے بٹن پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف اول خان موجود تھا۔ میری آواز سننے ہی وہ پرجوش لہجے میں بولنے لگا ”اس کی موت ایک حادثے کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ وہ اپنے معمول کے مطابق دفتر جا رہا تھا کہ اچانک غلط سمت سے ایک بڑا ٹریلر نمودار ہوا اور اوبرائن اپنی گاڑی میں ہی پچک کر مر گیا۔“

”اسے خاصا مضبوط آہنی مابوت نصیب ہوا ہے۔“ وہ تبصرہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں رستم کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ قتل اس طرح ہو کہ قتل معلوم نہ ہو۔ اس نے اوبرائن کے لیے اپنے اسی قول پر عمل کیا تھا۔

”ٹریلر ڈرائیور فرار ہو گیا۔ افواہیں ہیں کہ وہ ٹریلر چوری کا تھا۔“ اول خان کہہ رہا تھا۔

”جسے مرنا تھا وہ مر گیا۔ اب یہ قصہ مہینوں چلتا رہے گا۔“ میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

”ابھی تک موسیٰ کے بارے میں کوئی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی لیکن اس کی تلاش میں ایک مرتبہ پھر شدت آگئی ہے۔ تم اشارہ دو گے تو اسے بیچ دیا جائے گا۔“

”اس کے ساتھی کو بھی دیکھو۔ وہ آج ہی تمہارے پاس آجائے تو بہتر ہوگا کیونکہ میں آج رات اپنے میزبان کی طرف جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔“

”اس سے بات ہوئی ہے تمہاری؟“ اول خان کی آواز میں حیرت تھی۔

”اب ہوگی۔ ملاقات میں اس کا علاج ہے۔ وہ دوست

”میرے لیے وہ عملاً بے ضرر ہیں کیونکہ ان سے سامنا ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔“

”یہ مان لیا کہ دھن راج مفروز ہے اور ایک لمبی مدت تک اس کے سامنے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔“ ویرا نے کہا ”مگر موہنی پنڈت اسی شہر میں رہتی ہے۔ اس سے تمہارا کہیں بھی سامنا ہو سکتا ہے۔ وہ دیکھتے ہی تم کو کرل جہاں دستی کے طور پر پہچان لے گی۔“

”ماڈلنگ اس کا پیشہ اور فلرنگ اس کا مشغلہ ہے۔ وہ جن مقامات اور تفریح گاہوں میں اپنا وقت گزارتی ہے، میں وہاں کارخ بھی نہیں کرتا۔“

ویرا نے میری بات کاٹ دی ”تم پنڈت کی خانہ تلاشی کے لیے پر تول رہے ہو۔ موہنی اسی چھت کے نیچے رہتی ہے۔ کیا تم اس کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکو گے۔“

”خانہ تلاشی اور ملاقات میں باریک سافرق ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”خانہ تلاشی چوری چھپے ہوتی ہے۔ ملاقات میں ہر فریق روبرو ہوتا ہے۔“

گاڑی کے بارن نے سلطان شاہ کی واپسی کی اطلاع دی اور وہ گفتگو وہیں ختم ہو گئی۔ بحث میں جینے کے لیے میں نے ویرا کو جواب ضرور کر دیا تھا مگر مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اس وقت تک موہنی کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ ایک غیر متعلقہ فریق کی طرح اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

سلطان شاہ کی خریداری میں ہر چیز قابل ذکر تھی مگر دو اشیاء بہت نمایاں تھیں۔ ان میں ایک ٹیلی وژن اور دوسرا کیسٹ پلیئر تھا۔

انسانوں کے قدم آئے تو اس غیر آباد گھر کی رونق بھی بحال ہونے لگی۔ بچن میں چلو مار روشن ہونے کے بعد نضامین مانوس اور اشتیاء انگیز خوشبوئیں چکرانے لگیں۔ سب نے اپنے اپنے کمروں کا انتخاب کیا اور سلطان شاہ کی خریداری سے فیض اٹھاتے ہوئے ان کمروں کو سونے کے قابل بنانے میں مصروف ہو گئے۔

سات بجنے سے پہلے اول خان کا فون آگیا۔ اس کے پاس دو خوش خبریاں موجود تھیں۔ ملنگ ہاتھ آگیا تھا اور کراچی سے گئی ہوئی پولیس پارٹی عمرکوٹ کے ایک مضافاتی کالج سے دھن راج کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ دھن راج کو اپنے ملک کی سرحدوں میں ایسے زرخیز اہل کاروں کی حمایت حاصل تھی جو اس کے درباری ہوتے رہے۔

”کیسے بے لگام کر دیا۔“

”سیدھی سی بات ہے۔ نئی دہلی کے کسی مضبوط گروہ بند سے اس کا باقاعدہ رابطہ ہے۔ اس کی رضامندی کے بعد رستم نے میرے کام کی حامی بھری تھی۔“ میں نے اوبرائن کے قتل کی سازش کی امکانی نقشہ کشی کرتے ہوئے کہا ”اس کے آدمیوں نے اسی وقت سے اوبرائن کے معمولات پر نگاہ رکھی ہوگی۔ رستم کی طرف سے گرین سگنل ملنے پر آج صبح کہیں سے ایک تیز رفتار ٹریلر چرایا گیا اور اس کا پیچھا کرنے والوں نے واک ٹائی جیسے کسی نظام کے ذریعے ٹریلر ڈرائیور کی راہ نمائی کر کے طے شدہ مقام پر اوبرائن کو پکڑ ڈالا۔“

”کیا یہ واقعی سیدھی سی بات ہے؟“ ویرا نے خشک لہجے میں غزالہ سے پوچھا۔

”ہر وہ بات جو ان کے ذہن میں آجائے، سیدھی ہی ہوتی ہے۔“ غزالہ نے ہنس کر جواب دیا۔

اوبرائن ایک اہم ملک کا اہم تر سفارتی افسر ضرور تھا مگر پاکستان کے لیے وہ اتنا اہم نہیں تھا کہ ٹریفک کے ایک غیر معمولی حادثے میں اس کی موت پر اخباروں کے صفحے بازار میں آجاتے۔ عام لوگوں کو اگلے دن کے اخبارات کے ذریعے اس واقعے کا علم ہو سکتا تھا۔ ٹیلی وژن کے خبرنامے میں اس کے بارے میں ایک آدھ سطر آجانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ خبرنامے کو وقفہ تصور کر کے ٹیلی وژن کے بیشتر ناظرین اپنے ضروری کام نمٹانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ویسے بھی مجھے خبرنامے سے دو گھنٹے پہلے یعنی شام کے سات بجے رستم کو فون کرنا تھا۔ میں اس وقت بھی خود کو نئی دہلی کے حادثے سے بے خبر ظاہر کر کے اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا۔

اوبرائن کی موت کی تفصیلات سامنے آنے کے بعد صورت حال قدرے واضح ہو چکی تھی۔ میں نے رستم کو فون کرنے کا ارادہ شام تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس وقت تک اول خان کی طرف سے ملنگ کے بارے میں بھی کوئی مثبت خبر آسکتی تھی۔

”آپ ملنگ کی طرف سے اتنے فکر مند ہیں لیکن دو آدمیوں کو سرے سے بھولے ہوئے ہیں۔“ ملنگ کے ذکر پر غزالہ نے رسائی سے کہا۔

”ہر خطرہ میری نگاہوں میں ہے۔ شاید تم دھن راج اور موہنی پنڈت کا ذکر کر رہی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا ”کیا آپ کو ان سے کوئی خطرہ نہیں“

سوال کیا گیا۔

”آٹھ اور ساڑھے آٹھ کے درمیان ضرور آجاؤں گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔
”ٹھیک ہے۔“ اس کی فیصلہ کن آواز آئی ”میں انتظار کروں گا۔ دیر نہ کرنا۔“

اس سے بات کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اتفاق سے اول خان نے مجھے وہی گاڑی دی تھی جو دونوں مرتبہ رستم کے گھر جانے کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ اس رات تیسری بار استعمال کے بعد اس گاڑی کی تبدیلی ضروری ہو گئی تھی۔ گلشن اقبال سے بھرا کافاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر اس سے زیادہ وقت مانگا تھا تاکہ وہ ہماری قیام گاہ کے بارے میں کوئی غیر ضروری اندازہ قائم نہ کر سکے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ انسان کی زندگی میں بعض دن ایسے بڑے ثابت ہوتے ہیں کہ بنتے ہوئے کام بھی حیران کن انداز میں بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض دن ایسے سعد ہوتے ہیں کہ برسوں اور مہینوں سے اٹکے ہوئے بگڑے کام خود بخود بن جاتے ہیں۔

ہمارے لیے وہ ایسا ہی مبارک دن تھا۔ اس کی ابتدا ہم نے اسٹیشن فور کو خیرباد کہہ کر کی تھی۔ اس کے بعد سے مسلسل اچھی ہی اچھی خبریں مل رہی تھیں۔ ہمارے ہر حریف کو منہ کی کھانی پڑی تھی جس کے نتیجے میں ایک ایک کر کے بیشتر کاؤنٹیں دور ہو چکی تھیں۔

تھے۔ اسے پاکستان کی سرحد عبور کر کے پڑوسی ملک میں جانے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے آبائی شہر کے مضافات میں کچھ توں کے درمیان بنے ہوئے کالج میں عیش و عشرت کے دن گزار رہا تھا۔

”دھن راج پولیس کی تحویل میں رہے گا یا تمہارے پاس آجائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سنگین پولیس کیس میں ملوث ہے اور ان ہی کا مجرم ہے۔ اس فیصلے میں ایس ٹی ایف کہیں بھی شریک نہیں ہو سکے گی۔ چاہو گے تو اس کا اقبالی بیان مل جائے گا۔“

میں بے اختیار ہنس دیا ”میں اقبالی بیان کا کیا کروں گا۔ بس یہ دیکھ لینا کہ وہ پنڈت منور لال کی گردن پھنسا نے میں کس حد تک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔“

”وہ خود ہی کہیں نہ کہیں پھنس جائے گا۔ اس کی بیٹی اور دھن راج کے مراسم کے بارے میں آدھا شہر جانتا ہے۔ دھن راج کے کراچی پہنچنے ہی پولیس موہنی پنڈت کو بھی اٹھا لے گی۔ اس کا باپ دھن راج والے کیس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکے گا۔“

بات سے بات نکل رہی تھی۔ میرے لیے وہ خرابا ہم تھی کہ موہنی پنڈت بھی حوالات کی سیر کرے گی۔ اس کے ہٹ جانے سے میری اور پنڈت کی پچھ آزمائی کے لیے میدان صاف ہو سکتا تھا۔

سات بجے میں نے سی ایس ڈی آف کر کے بسرا کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی مجھے چند ثانیوں بعد رستم سے براہ راست بات کرنے کا موقع فراہم کر دیا گیا۔
”تمہارے مزاج کیسے ہیں؟“ رستم نے نرم اور دھیمی آواز میں میری مزاج پرسی کی۔

”نہاں ساز ہیں۔ زمینوں پر کچھ مار کرائی ہوئی ہے۔ میرا ایک آدمی مرا ہے، تین چار زخمی ہوئے ہیں۔“ میں نے اور ابراہن کے بارے میں کچھ کہنے بغیر اپنی سوچی سمجھی کہانی چھڑ دی ”مجھے فوراً واپس جانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری امانت آج ہی تمہارے حوالے کر دوں۔“

”بہت اچھی خواہش ہے۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج صبح تمہارا کام ہو چکا ہے۔“ اس نے کسی غور یا تکبر کے بغیر اسی رسائی سے کہا۔

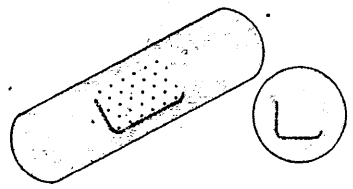
”یہ بہت اچھی خبر ہے۔ میں کراچی سے بالکل بے فکر ہو کر جاؤں گا۔“ میں نے خوشی کا اظہار کیا پھر پوچھا ”میں ملاقات کے لیے کس وقت آجاؤں؟“

”آٹھ بجے پہنچ سکتے ہو؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد

SANIPLAST®

فوری امدادی پٹی





خریدنے سے پہلے نام ضرور دیکھ لیں۔

فون پر رستم نے اور اس کے قتل کے بارے میں کسی لاف و گزاف سے کام لیے بغیر نہایت اختصار کے ساتھ اس کے انجام کی اطلاع دی تھی۔ وہ اس کا خالص پیشہ وارانہ انداز تھا۔ کوئی کام ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا۔ اور جب کام ہوتا ہے تو نہایت صاف ستھرے اور قابل رشک انداز میں ہوتا ہے۔ اس کے بیان کے لیے ایک پیشہ ور کو فالتو لفاظی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

”مجھے یہ حسرت رہے گی کہ رستم سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔“ باتوں کے درمیان دیرا نے مایوسی سے کہا ”اپنے بڑے یا بھلے اصولوں پر اتنی سختی سے اڑے رہنے والے لوگ کم ہی نظر آتے ہیں۔“

”وجہ اور شاندار ہونے کے باوجود وہ ادھیڑ عمر اور عیال دار آدمی ہے۔“ سلطان شاہ نے اسے چڑایا ”ہم اس کے ایک عدد نواسے سے بھی مل چکے ہیں۔ وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گا۔“

”تم بہت لنگے اور کور ذوق ہو۔“ دیرا بھنا کر بولی ”ہر بات میں کیڑے نکالنے کی عادت تمہیں کسی دن لے ڈوبے گی۔ پتا نہیں میں نے تمہاری کون سی جاگیر ماری ہے۔“

”آج کے خوشگوار دن کو ان تلخ باتوں سے برباد مت کرو۔“ میں نے ان دونوں سے التجا کی ”وقت کا پیہر ہمارے حق میں چل رہا ہے۔ اسے یوں ہی گردش میں رہنے دو۔“

چائے کی ایک پیالی پیئے کے بعد ہم دونوں نے رستم سے الوداعی ملاقات کی تیاری شروع کر دی۔ پچھلے ملاقات میں ہم سے ہمارے رپوالور نہیں لیے گئے تھے۔ بظاہر وہاں ان کی ضرورت پیش آنے کا کوئی امکان نہیں تھا پھر بھی میں نے مسخ ہونے کو ترجیح دی۔ سلطان شاہ نے دونوں جیمیز چیک کرنے کے بعد فاضل گولیوں کا ڈبا بھی ساتھ لے لیا۔ اس کی احتیاط غیر ضروری نہیں تھی۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ٹھیک آٹھ بجے ہم گھر سے روانہ ہو گئے۔ سلطان شاہ نے گولیوں کا ڈبا ڈیش بورڈ میں ڈال دیا۔ اس مرتبہ میں نے تین لاکھ روپے کے مساوی گئے ہوئے والرز کا لٹافہ اسی کے سپرد کر دیا تھا تاکہ رستم کو اس ڈیل میں اس کے مساویانہ کردار کا اندازہ ہو سکے۔

ہم بیس منٹ میں بیرا کی فسیل کے سائے میں پہنچ گئے۔ اندر سب کچھ وہی تھا۔ روشنیوں میں نہائی ہوئی خوب صورت عمارت کا نظارہ کرتے ہوئے ہم نے مقررہ جگہ پر گاڑی روکی اور محافظ کی نشان دہی پر رستم سے ملنے، باغ میں داخل ہو گئے۔ اس روڈ وہ پانچ بجوں پر پہنچا۔

رستم نے اپنے روایتی انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ چند رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا ”آج دوپہر بارہ بجے کے قریب وہ بے چارہ ٹریفک کے ایک حادثے میں مارا گیا۔“

”وقت سے پہلے تم نے اپنا وعدہ پورا کر کے ہمارا دل موہ لیا ہے۔“ سلطان شاہ نے کہا۔

اس کے گلانی ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی اور وہ مجھ سے بولا ”آج تم نے چھوٹے ملک کو تھوڑی سی ڈھیل دی ہوئی ہے۔“

اس کی نرم آواز کی فروختی دل میں گھر کرنے والی تھی۔ میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا ”تناور درخت اپنے سائے میں اگنے والی ہر کوئیل کو چاٹ جاتا ہے۔ تمہاری یہ بات میرے دل میں گھر گئی ہے۔ اب میں نے ملک انفل کو بھی آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”اچھی بات ہے کہ تم مناسب مشوروں کو مان لیتے ہو۔“ اس کے جواب کے درمیان سلطان شاہ نے ڈالروں کا لفافہ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔

”یہ بھی بڑے ڈالر معلوم ہوتے ہیں۔“ اس نے لفافے کی موٹائی سے اندازہ کر کے کہا ”تم نے گمن لیے ہیں تو پورے ہی ہوں گے۔“

دونوں فقروں کے درمیان سلطان شاہ نے سر ہلا کر اس کے پہلے فقرے کی تائید کر ڈالی تھی۔

”مجھے حیرت ہے کہ تم نے یہاں بیٹھے بیٹھے نئی دہلی میں ٹریفک کے حادثے کا بندوبست کیسے کر لیا؟“ لین دین ختم ہونے کے بعد میں نے نئے سرے سے بات چھیڑی۔

”وہ میرا نہیں، نئی دہلی والے کا منصوبہ تھا۔ چند روز پہلے آگرہ میں چوری کے ٹریڈر اور کار کے تصادم میں تین آدمی مر گئے تھے۔ ٹریڈر چرانے والا ڈرائیور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آج صبح نئی دہلی میں اسی واقعے کو تھوڑی سی تیاری کے ساتھ دہرایا گیا اور تمہارا کام پورا ہو گیا۔“

”شان دارا!“ میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا ”ایسی آسان اور کامیاب تدبیر تم اور تمہارے آدمی ہی سوچ سکتے تھے۔“

”جرم کرنا ایک فن ہے۔ کم از کم میں یہی سمجھتا ہوں۔ اسی لیے لوگ دور دور سے میرے پاس آتے ہیں۔“ اس مرتبہ اس نے کسر نفسی کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

وہ ہماری تواضع پر مصر تھا۔ میں نے اپنی زمینوں کے مالکوں سے ملنے کے لیے اس کے ساتھ مل کر اس نے عزت

اپنے مشتبہ آدمیوں کو بھی ادھر کارن کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔“

”مگر کیوں؟ اسے ہم سے ایسی کیا پر خاش ہو سکتی ہے۔ اس نے منہ مانگا معاوضہ لے کر ہمارے لیے ایک بڑا کام سر انجام دیا ہے۔ اب وہ ہم سے محاذ آرائی کیوں کرے گا؟“

”ہو سکتا ہے کہ او برائن کے قتل کے بعد اسے کہیں سے بھٹک ملی ہو کہ وہ لاعلمی کی بنا پر غلط لوگوں کا آلہ کار بن گیا ہے۔ اس جیسے مجرم کے لیے یہ احساس سخت اشتعال انگیز ثابت ہو سکتا ہے۔“

”ہم سے باتیں کرتے ہوئے وہ ذرا بھی مشتعل نہیں تھا۔ وہ اتنا بڑا اداکار نہیں ہو سکتا کہ اپنی نفرت کو سونی صد کامیابی سے مفاہمت کے اظہار میں بدلنے پر قادر ہو۔ پچھلی بار تم نے دیکھ ہی لیا تھا کہ نوٹوں کے پتلے لفافے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے کانوں کی لوہیں تپنے لگی تھیں۔“

”وہ میرا وہم نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ کون لوگ تھے؟ یہ ایک اہم اور بڑا سوالیہ نشان ہے۔“ میں نے بر تشویش آواز میں کہا۔

بڑی بڑی کامیابیوں کے جلو میں گزرنے والا وہ دن اپنے اختتام پر یکایک ہی پر ہول محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی سنا رہا تھا کہ وہ جو لوگ بھی تھے، ہماری گاڑی کی ساخت اور رجسٹریشن نمبروں تک سے واقف تھے جبکہ ہم ان کی گاڑی کا رنگ تک نہیں دیکھ سکے تھے۔ راستے میں وہ کہیں بھی گاڑی پہچان کر ہم پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اس تشویش نے مجھے مضطرب کر دیا۔

اسی لمحے مجھے ایک نیا خیال سوچھا اور میں نے موبائل فون سلطان شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”رستم کا نمبر ملا کر فون مجھے لوٹا دو۔“

اس نے اندھیرے میں لمحہ بھر توقف کیا پھر موبائل فون پر نمبر ملنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسری طرف کھٹی بجتے ہی سلطان شاہ نے فون میرے حوالے کر دیا۔

”میں ملک ممتاز بول رہا ہوں اور ابھی رستم سے مل کر لوٹا ہوں۔ اس سے میری بات کرا دو۔“ ”بیرا سے کسی کا جواب سن کر میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ریسیور پر قلیل سے وقفے کے لیے موسیقی بجی اور میری توقع کے بالکل برعکس رستم کی آواز ابھری ”ہاں ملک ممتاز! کیا بات ہے؟“ ”میرا آدمی کہہ رہا ہے کہ تم کچھ پریشان ہو۔“

”پریشانی کی بات ہے۔ تمہارے گھر سے نکلنے کے بعد

کے ساتھ ہمیں واپسی کی اجازت دے دی۔ ہماری گاڑی باہر نکلتے ہی بیرا کا چھانک بند ہو گیا۔ میں نے سگریٹ سلگائی۔

سڑک کا موڑ گھومتے ہوئے مجھے شبہ ہوا کہ رستم کے مکان کی کسی قریبی گلی سے کوئی گاڑی ہیڈ لیمپس روشن کیے بغیر رنگ کر باہر آئی تھی۔ میں آدھے سے زیادہ موڑ کاٹ چکا تھا۔ عقب نما آئینوں کا زاویہ بدل جانے کی وجہ سے تاریک کار کا وہ مبہوم سایہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”ہوشیار!“ میں نے سر سرائی ہوئی آواز میں سلطان شاہ کو خبردار کیا ”ابھی کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں نکلی ہے۔“

سلطان شاہ نے پھرتی سے اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ میں نے گاڑی کو تیزی کے ساتھ بائیں طرف کاٹ کر فٹ پاتھ کے کنارے لگا لیا۔

اس وقت میری چھٹی حس بہت تیزی سے کام کر رہی تھی۔ گاڑی روکتے ہی میں نے انجن بند کر کے روشنیاں گل کر دیں اور کھڑکی سے نیچے جھک گیا۔ سلطان شاہ نے میری تقلید کی۔ اس وقت ہماری کار سڑک کے کنارے نیم تاریکی میں گھڑی ہوئی تھی۔

روشنی اور انجن کی غراہٹ سے اندازہ ہوا کہ اسی سڑک سے ایک کار برآمد ہو کر تیزی سے سڑی اور اسی سمت میں بڑھتی چلی گئی جدر ہمارا رخ تھا۔ تاریکی کی وجہ سے انہوں نے ہمیں بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

لمحہ بھر کے بعد ہم سیدھے ہوئے تو وہ تیز رفتار کار کافی دور نکل چکی تھی۔

وہ ایک ناگمانی خطرہ تھا جو ناول ہوتے ہوتے یکایک ٹل گیا تھا۔ ان گزرے ہوئے لمحات کی سنسنی سے میرا دل کپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں شبہ ہوا تھا۔“ گاڑی کے حرکت میں آنے پر سلطان شاہ بولا ”بیرا کے دروازے پر کوئی بھی رستم کے مہمانوں سے چھپر چھاڑی ہمت نہیں کر سکتا۔“ انجن اشارت کر کے میں نے گاڑی آگے بڑھا دی ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ رستم کے آدمی رہے ہوں اور ہمارے باہر آنے کا انتظار کر رہے ہوں۔“

”یہ بات محال نظر آتی ہے۔ ہم اندر تھے۔ وہ چاہتا تو ہم کسی قیبت پر باہر نہیں آ سکتے تھے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ وہ اپنی اقامت گاہ کو ہر قسم کے

تھی۔ اپنے آدمیوں کی بے نیل و مرام واپسی پر ہی اسے پتا چلا کہ اسے کے آدمیوں نے ہمیں فوراً کھو دیا تھا اور میری فون کال کا مقصد صرف اسے ٹھوننا تھا۔

فون سے فارغ ہو کر میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ میں اول خان کی دی ہوئی اس کار سے جلد از جلد پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے ہم پر کیا شبہ ہوا ہے۔“ ایک طرفہ گفتگو سے اخذ کیے ہوئے مفہوم کی روشنی میں سلطان شاہ نے کہا ”کم از کم یہ بات تو طے ہو گئی کہ ہمارے تعاقب کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ تمہارا کوئی خوف یا وہم نہیں تھا۔“

فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ہم جلد ہی گھر پہنچ گئے۔ سلطان شاہ نے اتر کر پھاٹک کھلوایا اور میں نے گاڑی اندر پارک کر کے پوربج کی روشنیاں گل کر دیں۔

”کیا بات ہے؟ تم دونوں ہی فکر مند اور خاموش نظر آ رہے ہو۔“ روشنی میں ہمارے چہرے پڑھ لینے کے بعد ویرا نے پوربج کے اندھیرے میں سوال کیا۔

”یہ تمہاری اور سلطان شاہ کی کل کل ہے جو رنگ لائی

”میں اپنی چار دیواری سے باہر رونما ہونے والے اس واقعے کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اپنے مہمانوں کی بحفاظت واپسی تمہاری اخلاقی ذمے داری ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ”وہ لوگ کسی ہنگامی میں چھپ کر ہماری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔“

”دیکھو ملک، میرے گھر سے تم پوری عزت کے ساتھ باہر گئے ہو۔ اب یہ تمہارے اعمال ہیں جو تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔ ہمت ہے تو اپنی گاڑی روک کر ان سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔“

میں دانستہ بیانی سی ہنسی ہنسا ”تم تو مجھے خود کشی کا مشورہ دے رہے ہو۔ ان کے تیور ایسے ہیں کہ وہ ہماری کوئی بات سننے سے پہلے ہی گولیوں کی بارڈھ کھول دیں گے۔“

”کوئی تمہارا ایسا دشمن کیوں ہو جائے گا؟ دشمنی ہوتی ہے تو اس کا کوئی سبب بھی ہوتا ہے جو دونوں فریق بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”میری کسی سے دشمنی ہے اور نہ میں نے کسی پر ظلم کیا ہے۔ اس وقت میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں وقت طے کر کے تم سے ملنے کے لیے آگیا اور مصیبت مول لے لی۔“

”میں کسی کی فالتو باتیں سن کر اپنا وقت اور موڈ برباد نہیں کرتا۔“ اس کی آواز میں سختی در آئی ”تم سے ذرا سی دیر پہلے ایک ڈیل مکمل ہوئی ہے اس لیے ہمیں وقت بھی دے رہا ہوں۔ آسان الفاظ میں بتاؤ کہ اس وقت تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”میں پیچھا کرنے والوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر انہوں نے اب تک گولی نہیں چلائی تو وہ صرف تمہارا پیچھا کر رہے ہیں، شرافت سے اپنے گھریا ہوٹل چلے جاؤ۔ تمہارا ٹھکانا دیکھ کر وہ لوٹ جائیں گے۔“

رستم کے اس مشورے میں حکم پوشیدہ تھا۔ اس نے کھل کر اعتراف نہیں کیا لیکن اس مشورے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گاڑی ہماری قیام گاہ کا سراغ لگانے کے لیے ہمارے پیچھے نکلی تھی۔

”وہ فائر کریں یا نہ کریں، میں انہیں ضرور تباہ کر دوں گا۔“ میں نے دھمکی دی۔

”کوشش کر کے دیکھ لو۔ تمہاری مشکل آسان بھی ہو سکتی ہے۔“ اس کا جواب مبہم تھا۔

میں نے فون بند کر دیا۔ اس کے معاندانہ رویے سے یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ تعاقب کی کوشش اسی کے ایما پر کی گئی

قدیم اضافہ مکن ہے

آپ خواہ
مردہوں یا عورت
اپنے پسندیدہ قدیم مزید
اضافہ کر کے اپنی شخصیت کو
خوبصورت اور پُر وقار
بنانے کے لئے ہمیں اپنے
موجودہ قدیم پیمائش اور عمر
کی تفصیل ہمراہ جوابی
لٹافے کے لکھیں اور مفید
معلومات حاصل کریں۔

KAYBEE HOME

پوسٹ بکس نمبر 2535 - کراچی 74600

ہے۔ سب کچھ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تھا کہ واپسی پر رنگ میں بھنگ ہو گیا۔“

سلطان شاہ اسے خاموشی سے ڈرائنگ روم تک لے آیا۔ وہ دونوں عورتوں کو تازہ ترین واقعات سنانے لگا اور میں اول خان کو فون کرنے کے لیے خواب گاہ میں چلا گیا۔

تغاق کی کوشش کے ذکر پر اول خان پریشان ہو گیا۔ وہ عجیب سا واقعہ تھا جس کا ظاہری طور پر کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ رستم سارے چکروں سے الگ تھلک رہ کر اپنی سینڈکیٹ چلا رہا تھا۔ اسے یہ فکر تک نہیں ہوتی تھی کہ اس کے پاس آنے والا کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اسے ہمارے بارے میں جستجو کیوں ہو گئی تھی؟

میری دانست میں اس زنجیر کی گمشدہ کڑی پنڈت منوہر لال کی شخصیت میں پوشیدہ ہو سکتی تھی کیونکہ ایک طرف وہ بخشی اور دھن راج کا گہرا دوست تھا تو دوسری طرف رستم سے بھی اس کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ شاید اسی کے ذریعے کوئی بری خبر رستم تک پہنچی تھی۔

قوی امکان یہ تھا کہ اوہرائن کی ہلاکت پر امریکیوں کے شدید رد عمل کے بارے میں پنڈت نے رستم کو کچھ بتایا ہو اور رستم نے کسی لمبے منصوبے کے بغیر ہمارا سراغ حاصل کرنے کی کوشش کر ڈالی۔ وہ صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ اوہرائن کو مروانے والے کون تھے اور ان کے کیا مقاصد تھے۔ وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام ہو گیا تھا اسی کے ساتھ کہانی بھی ختم ہو گئی تھی۔

آخری نتیجہ اول خان نے اخذ کیا تھا۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ رستم نے ہمارے اعتماد کو مجروح کر کے اپنے حق میں کانٹے بولے تھے۔ اسے وہ فصل ہر حال میں کاٹنی تھی۔

اول خان سے طویل گفتگو ہوئی۔ اس کا ماحصل صفر تھا۔ بس ایک بات طے ہوئی کہ وہ عارضی طور پر میرے لیے کوئی دوسری گاڑی بھیج کر پرانی کار واپس منگوالے گا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمارے پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی تبدیل ہو چکی تھی۔

میرے ذہن میں مسلسل ایک بالکل سی مچی ہوئی تھی۔ میرے سامنے دو نشاے دھیرے دھیرے بالکل واضح ہو گئے تھے۔ پنڈت منوہر لال اور رستم ایرانی۔

پنڈت کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میں اس کے گھر کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ دس بجے میں نے اول خان کو دوبارہ فون کیا۔ اس سے بتا ملا کہ دھن راج کو لانے والی

پولیس پارٹی رات میں کسی بھی وقت کراچی پہنچ سکتی تھی۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے آنے سے پہلے موہنی اپنے گھر ملو ملا زمین سمیت پولیس کی تحویل میں چلی جائے؟“ میں نے اس سے اگلا سوال پوچھا۔

”موہنی کا نام پولیس کی لسٹ پر ہے۔ ملازمین کو پوچھ گچھ کے لیے بلایا جاسکتا ہے لیکن تم یہ ضرورت کیوں محسوس کر رہے ہو؟“

”میں نے صرف معلومات کے لیے پوچھا ہے ورنہ ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔ پولیس کی کسی بڑی کارروائی کے نتیجے میں پنڈت ہو شیار ہو کر وہ تمام شہادتیں تلف کر سکتا تھا جو اس کے جہانہ وابطوں سے متعلق ہوتیں۔ بہتر یہی تھا کہ اس کے خلاف خاموشی اور رازداری سے اچانک کارروائی کی جائے۔

”تمہاری یہ کال بے سبب نہیں ہو سکتی۔ یقیناً تمہارے ذہن میں کوئی نہ کوئی بات ریکر رہی ہے۔“

”ہو سکے تو کچھ ہتھیار لے کر یہاں آجاؤ۔ آج رات پنڈت سے ملاقات کرتے ہیں۔“ میں نے نیچی آواز میں کہا ”کچھ ہتھیار، فاضل بھی ہونے چاہئیں جو یہاں رکھے جاسکیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آج کی رات تمہاری بے چینی کوئی نہ کوئی رنگ لاکر رہے گی۔“ اول خان کا جواب سن کر میں نے دوبارہ فون بند کر دیا۔

بڑے مکان میں یہ سولت تھی کہ چاروں افراد ایک دوسرے کے سر پر سوار نہیں تھے۔ سلطان شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھائی دی دیکھنے میں منہمک تھا۔ دیراچکن میں سامان جمانے میں غزالہ کا ہاتھ بٹاری تھی اور میں نے تیغیے میں اول خان سے اپنی بات مکمل کر لی تھی۔

کچھ دیر بعد اول خان آیا تو سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ گھر دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ اسٹیشن فور سے ہماری روانگی سے پیدا ہونے والی اس کی ناراضی بالکل رفع ہو چکی تھی۔ اس نے کہیں بیٹھنے سے پہلے تحسین آمیز بھروسے کے ساتھ گھر کا جائزہ لیا پھر میں اسے سلطان شاہ کے کمرے میں لے بیٹھا۔ دیرا اور غزالہ نے دوبارہ اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ گھر کو جلد از جلد سمیٹ لینے کی فکر میں تھیں۔ سلطان شاہ کی نگرانی میں اول خان کے لائے ہوئے ہتھیار الماری میں رکھے جا رہے تھے۔



”اچھی اور بُری“

اختر نے اپنی شادی کی تصویر مقامی ہفت روزے میں چھپنے کے لیے بھیجی۔ تصویر تو چھپ گئی مگر نیچے عبارت تبدیل ہو گئی۔ اختر اور ان کی بیگم کا نام کسی اور تصویر کے نیچے لگ گیا۔ ”بیگم...“ اختر نے رسالہ بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے اور ایک بُری...“

”دونوں سنا دیں۔“ بیگم نے رسالہ لیتے ہوئے فرمائش کی۔

”اچھی خبر یہ ہے کہ میرے سر پر بال اگ آئے ہیں... اور بُری خبر یہ ہے کہ تم بد صورت ہو گئی ہو۔“



کونے سے تیسرے مکان کی دیوار کے قریب رک کر سلطان شاہ نے ایک پتھر اندر اچھال دیا۔ پتھر ہلکی سی آواز کے ساتھ ترشی ہوئی گھاس یا نرم زمین پر گرا۔ چند ثانیوں تک کوئی رد عمل سامنے نہ آیا تو میں نے اچھل کر دیوار کی ٹکڑی پر ہاتھ جمائے اور پورا زور صرف کر کے دیوار پر سے ہوتا ہوا، بچوں کے بل اندر کود گیا۔

وہ مکان میرے لیے اجنبی تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ اصل مکینوں کی تعداد صرف دو ہے۔ باقی چار پانچ ملازمین کو اس وقت اپنے اپنے کمروں میں جو خواب ہونا چاہیے تھا۔ انتظار اور احتیاط کے جملہ مراحل کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے سلطان شاہ کو بھی اندر بلایا۔

بغلی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے سروٹ کو ارٹز میں تاریکی کے ساتھ سناٹا تھا۔ اصل عمارت کی صرف دو کھڑکیاں روشن تھیں۔ ہم نے زمین سے لگ کر درمیانی فاصلہ طے کیا اور عمارت کے اس پہلو پر چلے گئے جہاں ملازمین کے متوجہ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مکان میں راج کرنے والے سناٹے نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں پر مضبوط آہنی گرل نصب تھی

”تمہاری فرمائش پر میں آگیا ہوں لیکن میں تمہارے ساتھ پنڈت کے گھر نہیں جاؤں گا۔“ اس نے نرمی سے کہا ”آج کل رستم نے ہر ایک کو ہلایا ہوا ہے۔ میں ان معاملات میں براہِ راست ملوث ہونا پسند نہیں کروں گا۔ پنڈت اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی زیادتی پر رستم کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔“

”ایسی بات تھی تو تمہیں اتنی لمبی دوڑ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں سلطان شاہ کو اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میرا خیال تھا کہ تمہیں ہتھیاروں کی بھی ضرورت ہے۔ تم لوگوں کو اپنی ضروریات کے معاملے میں خود کفیل ہونا چاہیے۔ ویسے بھی آج یہاں سپلاؤن ہے۔ عورتیں اکیلی ہوتیں۔ تمہاری واپسی تک میں یہیں رکوں گا۔“

سلطان شاہ نے وہ پروگرام سننے ہی رواں لگی کی تیاری شروع کر دی۔ اول خان مجھے پنڈت کے گھر کا پتا سمجھانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ شہر کے ایک معروف اور منگے علاقے میں مقیم تھا۔

وہاں ہمارا کشت و خون کا کوئی پروگرام نہیں تھا اس لیے ریوالوروں کے ساتھ صرف فاضل راؤنڈ جیبوں میں بھر لیے۔ اپنی تیاری مکمل کر کے ہم اول خان کے ڈرائیور کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

ہم اس پُر سکون اور آسودہ حال علاقے میں پہنچے تو شہر کے دوسرے علاقوں کی طرح وہاں بھی بیشتر اسٹریٹ لیمپس نقصان سے محروم تھے۔ وہ تاریکی ہمارے لیے سود مند تھی۔ گاڑی میں سست روی کے ساتھ پنڈت کے مکان کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے قریبی ٹکڑ پر گاڑی چھوڑ دی اور تیزی کے ساتھ قریبی دیوار کا سایہ لے کر پنڈت کے مکان کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔

اس علاقے میں سارے ہی مکان وسیع اور کشادہ تھے۔ مکینوں کی گاڑیاں احاطوں اور گیراجوں میں بند تھیں۔ پھر بھی رات گئے اٹھنے والے ملاقاتیوں کی اکاؤنٹ گاڑیاں باہر پارک کی ہوئی تھیں۔ ان کی آڑ میں اول خان کے ڈرائیور کے لیے وہاں رک کر ہمارا انتظار کرنا آسان تھا۔

مکانوں کے عقبی احاطے کی دیواروں میں چھوٹے آہنی گیٹ تھے مگر وہ سب مدقوں سے بند اور متروک تھے۔ اس سمت کی پتلی سی گلی میں گرا اندھرا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں وغیرہ سے چھن کر آنے

ایما پر سلطان شاہ کھڑکیوں پر بیٹے ہوئے چھتے پر چڑھ گیا۔

چند ثانیوں بعد وہ پکن یا اسٹور کی دیوار میں ایک چوکور خلا دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں آگزا سٹ فین نصب نہیں تھا۔ اس خلا سے گزر کر ہم مٹی میں اٹی ہوئی دو چھتی سے ایک اسٹور میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسٹور کا دروازہ ذرا سی کوشش سے کھل گیا۔

دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد ہم دونوں تاریک راہداری میں تھے۔

مکان کی تاریک فضا میں انرکنڈنٹ شز کی آواز گونج رہی تھی۔ ان کے سہارے ہم پہلی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گئے جس کے خیلہ خلا میں ہلکی ہز روشنی نظر آ رہی تھی۔

دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینے کے بعد میں نے دستے پر دباؤ ڈالا اور اندر سے ٹھنڈی ہوا کے میکتے ہوئے جھونکے باہر آنے لگے۔ ہلکی روشنی میں موہنی پنڈت اپنے بستر پر بے لگاری سے سو رہے تھے۔

میں نے دروازہ بند کر کے سلطان شاہ کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور کچھ فاصلے پر موجود دوسری خواب گاہ کے سامنے جا رکا۔ فرش اور دروازے کے درمیانی خلا کی دھبی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ کمرہ بھی آباد تھا۔

مجھے اندر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کمرہ انرکنڈنٹ تھا، کھڑکیوں پر دبیز پردے بڑے ہوئے تھے، ہلکی روشنی میں سب کچھ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ باہر سے دیکھ لے جانے کے خطرے سے بے نیاز ہو کر میں نے بستر پر بے سُدھ، اوندھے بڑے ہوئے ادھیڑ عمر شخص کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ نشے میں دھت ہو کر گہری نیند... سویا ہوا تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ دونوں خواب گاہیں اندر سے بولٹ یا مقفل نہیں کی گئی تھیں۔

اس کے رنگے ہوئے بالوں کی جھار کے وسط میں تانبے جیسی چند بتا رہی تھی کہ اپنے ایک ایک بال کو رنگ کر جوان بنادینے والا وہی شخص پنڈت منوہر لال ہو سکتا تھا۔ اس کی ابتر حالت دیکھ کر مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ میں نے اسے بیدار کیا تو وہ اپنی مدہوشی میں، کسی خطرے کا ادراک کیے بغیر، غل غباڑے براتر آئے گا۔ میں نے اسے جھپڑے بغیر اس کی خواب گاہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

شراب کی بوتلوں سے لے کر خواتین کی ناز بارنگین تصاویر کی انبوس تک... وہاں خرابات کا ایک انبار پوشیدہ تھا۔ ہر دروازہ اور الماری غیر مقفل تھی۔ بے احتیاطی کا یہ عالم تھا کہ کپڑوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آخر کار میری کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ ایک بڑے تصویری فریم کے دیوار گیر آہنی تجوری کا دروازہ پوشیدہ اور مقفل تھا۔

میں کئی درازوں میں چابیوں کے کچھے دیکھ چکا تھا۔ تجوری کی تلاش میں اتنا وقت صرف نہیں ہوا، جتنا چابی کی تلاش میں ضائع ہوا۔ یہ پنڈت کی فطری بے پروائی کا نتیجہ تھا کہ مجھے اس سے پوچھنے بغیر تجوری کی چابی ہی لگئی اور میں نے تیسری کوشش میں وہ ذلی دروازہ کھول لیا۔

تجوری، نقدی، زیورات کے بسکوں اور تمسکات وغیرہ سے بھری ہوئی تھی۔ اندر ہاتھ مارنے پر مجھے کچھ فالکون کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں نے تجوری کے سامنے ہاتھ حصہ فرشی قالین پر خالی کرنا شروع کر دیا۔ وہ نئی اور پرانی فالکون اور لفافوں کا ایک موٹا سا ڈھیر تھا جو رقم وغیرہ کے پتے سے بھر دیا تھا۔

میرے لیے وہاں رک کر ان تمام فالکون اور لفافوں کا جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے پنڈت منوہر لال کی مسری، بڑے ہوئے ایک فاضل تکیہ کا غلاف اتارا اور اسے الٹ کر وہ پورا ڈھیر اس میں ڈال لیا۔

کمرہ اچھوڑنے سے پہلے میں نے آخری بار تجوری کا جائزہ لیا اور اسے اسی حال میں جھوڑ دیا۔ فرش پر موجود نقدی اور زیورات میرے لیے بے وقت تھے۔

ہلکی روشنی میں سے نکلتے ہی، میں تاریکی میں سلطان شاہ کا ہیولا نہ دیکھ سکا۔ چند ثانیوں بعد ہم دونوں پھر ایک ہو گئے۔

مکان کے اندر موجود ہونے کے سبب ہم آسانی سے کوئی بھی دروازہ کھول کر باہر نکل سکتے تھے مگر میں نے کسی راستے کے خطرات مول لینے پر پرانے راستے کو ترجیح دی۔ اس بار سابق تجربہ ہمارے ساتھ تھا۔ ہم کسی دشواری کے چھتے پر پہنچ گئے۔

میں چھتے سے نیچے کود چکا تھا۔ کودنے کے بعد فالکون تھملا میری گرفت سے نکل کر قدرے اونچی دھمک کے سامنے زمین پر گرا، میں نے تھملا فوراً ہی اٹھالیا۔

سلطان شاہ چھتے سے زمین پر آ رہا تھا کہ کوئی نندہ آواز میں چیخا "اوئے! تم کون ہے۔" اس لکار کے ساتھ ہماری طرف فائر ہوا مگر گولی کافی پابندی پر نکل گئی۔

وہ چوہن بہت خطرناک تھی۔ ہم احاطے کی عقبی سے دور تھے۔ وہاں سے ہمیں گاڑی تک بھی پہنچنا تھا۔ ان فائر

مقصد اپنے مسلح حریف کو خوف زدہ کر کے اپنے سے دور رکھنا تھا۔

فائر کرتے ہی میں نے بچوں کے بل واپسی کی دوڑ لگا دی۔ سلطان شاہ کے لیے وہ صورت حال نئی نہیں تھی۔ ایسے مواقع پر اندھا دھند فائرنگ کے فوائد سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے وقفے وقفے سے دو فائرنگے پنڈت کے چوکیدار کی طرف سے کل تین گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ذرا سی دیر میں ہونے والے ان سات فائروں کی وجہ سے کسی بھی ملازم نے ہمارا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کی۔ عقبی دیوار پھاندے سے پہلے میں نے پھر ایک گولی چلائی۔ اس کے بعد ہم دونوں پچھلی گلی میں دوڑ رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں گاڑی تک پہنچنا ایک کٹھن مرحلہ بن گیا تھا۔

قانون پسند اور معزز شہریوں کی اس آبادی میں ہر گھر امن کا ایک جزیرہ تھا، دوسرے سے بالکل الگ تھلگ اور اپنے ہی گرد پھیلا ہوا۔ آٹھ فائر ہونے کے باوجود کوئی مالک یا ملازم گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اول خان کا ڈرائیور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر گاڑی تکی گلی کے کنارے لے آیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گولیوں کا تبادلہ شروع ہونے کے بعد ہم مقابلے کے بجائے فرار کو ترجیح دیں گے۔ اس نے گاڑی کا ایجن اشارٹ رکھا ہوا تھا۔ دروازے کھول کر ہم جون ہی اندر بیٹھے اس نے گاڑی تیزی سے آگے دوڑا دی اور ذرا سی دیر میں آبادی سے نکل کر مین روڈ پر پہنچ گیا۔ ”صاحب! کھڑکیوں کے شیشے گرا دیں۔ جلد ہونے بارود کی بو ہوا سے اڑ جائے گی۔“ اس کا وہ مشورہ تجربے اور گہرے مشاہدے پر مبنی تھا۔ جیمبرز اور تالوں میں بھری ہوئی بارود کی بو ہمارے نچھوٹوں تک پہنچ رہی تھی۔ اپنا شیشہ وہ پہلے ہی گرا چکا تھا۔ ہم نے بقیہ تین شیشے بھی کھول دیے۔ ”صاحب! سب خیر ہے؟“ سڑک پر نکل آنے کے بعد اس نے ادب سے پوچھا۔

”ہاں، تم بے فکر ہو۔“ اتنا کہہ کر سلطان شاہ نے پشتو میں اسے کچھ بتانا شروع کر دیا۔ گھر پر تینوں بے چینی سے ہماری واپسی کے منتظر تھے۔ کامیابی شاید ہمارے چروں سے تھلک رہی تھی اور پھر ثبوت کے طور پر وزن والا ایک تھملا ہمارے ساتھ تھا۔ کسی سوال کے بغیر انہیں جواب مل گئے۔

میں نے تکیے کے غلاف میں سے ایک کانڈ نکال لیا اور پھر سب ہی ان کے معائنے میں مصروف ہو گئے۔

○☆○

اگلے دن اخبارات میں خبریں ہی خبریں تھیں۔

نئی دہلی میں اوبرائن کی حادثاتی موت کی خبر خاصی نمایاں اور دل دوز تھی۔ اس کی خدمات کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا کی فلاح کے لیے ایک انقلابی منصوبے پر شب و روز کام کر رہا تھا۔ اس کی ناگہانی موت سے وہ منصوبہ کافی پیچھے رہ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

دو الگ الگ خبروں میں موسیٰ اور ملنگ نامی ہسٹری شپرز کی لاشوں کی برآمدگی کی اطلاعات تھیں۔ وہ اپنے اپنے علاقوں میں مارے گئے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کی شدید پیشہ ورانہ رقابت کا نشانہ بنے تھے۔ یہ دو در رس خیال رستم کی ہڈیاں تک سلگا دینے کے لیے کافی تھا۔ ایک خبر عمر کوٹ کے مضافات سے ناجائز ہتھیاروں کی ترسیل اور دہشت گردی کے کیس میں ماخوذ دھن راج کی گرفتاری کے بارے میں تھی۔

پنڈت منو ہر لال اور موہنی پنڈت کے بارے میں صبح کے اخبارات میں کچھ شائع نہیں ہوا تھا مگر اول خان نے فون پر بتایا تھا کہ موہنی پنڈت کو صبح پولیس نے اس کی قیام گاہ سے پکڑ لیا تھا۔ اس کے باپ کے کمرے کی تجوری کھلی ہوئی تھی۔ رستم اور زیورات قالین پر تھے اور پنڈت غائب تھا۔

جسم کو مٹا اور خوبصورت بنانے کی دوا

فریبینا

فریبینا جسم کو مٹا اور خوبصورت بنانے کی یونانی دوا ہے جو قدرتی طور پر ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں بازو، کمر، کولے، گال، انڈھکے اور چہرے کے گالوں پر جھوٹ میں اضافہ کر کے جسم بھر بھر ادا، بصورت، خوبصورت بنا دیتی ہے۔

فریبینا شروع کرنے سے پہلے اپنا وزن نوٹ لیں اور ایک ماہ تک فریبینا کی خوراکیں کھاتے رہیں ایک ماہ بعد اپنا وزن دوبارہ چیک کریں تو آپ کو فرق صاف نظر آجائے گا۔ مکمل طور پر قدرتی اجزاء سے تیار کردہ قطعی بے ہمدرد یونانی مرکب قیمت ۳۵۰/- روپے وزن ایک کلو جبکہ ہائی ملٹل ڈز راک ہے۔

ایک خط لکھ کر بڈریو V.P. منگوائیں۔

2608

حکیم ارشد لیبارٹریز ریپوسٹ بکس اسلام آباد

اپنے باپ کے بارے میں موہنی کچھ بھی نہیں بتا سکی تھی۔ کچھ رات کی فائرنگ کے شور سے بدحواس ہو کر وہ بیدار ہوئی تو پنڈت کا روشن کمرہ خالی تھا۔ سب کچھ تجوری سے فرش پر نکلا جا چکا تھا اور اس کا باپ گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ اتنی بدحواس تھی کہ صبح ہونے تک اس بارے میں پولیس کو اطلاع دینے یا خاموشی سے اپنے باپ کی واپسی کا انتظار کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ موہنی پنڈت نے ایسا سفید جھوٹ بولا تھا۔ فائرنگ کے تبادلے کے وقت نشے کی زیادتی سے پنڈت کا حال کسی مڑے سے بھی اتر تھا۔ یہ مانا ہی نہیں جاسکتا کہ دھماکوں سے ہوش میں آتے ہی وہ سر پر رکھ کر اپنے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا ہو۔

وہ پولیس کی تحویل میں جا چکی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ موہنی اپنی تمام تر برکاری اور مکاری کے باوجود زیادہ دیر تک تفتیشی افسران کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گی۔ وہ عورت تھی اور اس سے لیڈی پولیس افسران ہی کو پوچھ گچھ کرنی تھی مگر خواتین کی پولیس فورس بھی اپنے دوسرے ہم عصروں سے کم نہیں تھی۔

”حالات ایک ہی دن میں چھلانگ لگا کر کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہیں۔“ خبریں پڑھ لینے کے بعد ویرا نے کہا ”ہواؤں کا رخ بدل گیا ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ اب ہم کن مہروں کو آگے بڑھائیں گے۔“

”ایک بساط لہنی ہے لیکن دوسری پھیل گئی ہے۔ تم رات والے تین کاغذوں کو کیوں بھول رہی ہو؟“ سلطان شاہ نے اسے یاد دلایا۔

”اتنے موٹے پلندے میں سے برآمد ہونے والے وہ تینوں کاغذات پنڈت منوہرال کے بغیر ادھورے ہیں۔ ان کو نیا دینا کر تم کن دیواروں سے اپنا سر ٹکراؤ گے؟“ ویرا نے مجھ سے سوال کیا۔

”تمہارے لیے وہ کاغذات ادھورے ہیں مگر مجھے ایک راہ نظر آرہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پنڈت اپنے گھر سے بھاگ کر رستم کے پاس ہی گیا ہو گا۔“

”رستم تمہارے دماغ سے چٹ کر رہ گیا ہے۔“ ویرا نے چکر کہا ”تم نے گا بے گا ہے اس کی جو تصویر کشی کی ہے اس کی بنا پر مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھیرا کو ایسی کسی سرگرمی میں ملوث نہیں کرے گا کہ قانون کے محافظوں کو اس کے پھانک برسک دینے کا موقع مل سکے۔“

”رستم اور بھیرا دو الگ چیزیں ہیں۔ بھیرا اس کا گھر

ہے۔ براہِ وقت آجائے پر اس نے اپنے دوست کو کسی اور ٹھکانے پر بھیج دیا ہو گا۔ اس کا پتا صرف رستم بتائے گا۔“

”اور رستم بھیرا میں رہتا ہے لہذا تم ایک مرتبہ پھر ادھر جاؤ گے۔“ وہ میری بات کاٹ کر غرائی۔

میں اس کے چڑے پن پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا ”مجھے رستم کے مکان پر چڑھائی کرنے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ مجرم جہاں بھی ہو“ اس کی سرکوبی ضرور ہونی چاہیے۔“

”تم جاکر غزالہ کے ساتھ کھانا تیار کرو۔ یہ مسائل ہم خود طے کر لیں گے۔“ سلطان شاہ نے اسے چڑانے کے لیے کہا ”یہ کوشش تمہاری آزادی کے لیے کی جا رہی ہے۔ تمہیں اسٹیشن فور سے رہائی مل چکی ہے“ اب باہر نقل و حرکت کی اجازت بھی ملنی چاہیے۔“

”میں تم لوگوں کی وجہ سے احتیاط کرتی ہوں کہ کہیں میری وجہ سے مفت میں نہ مارے جاؤ۔ مجھے اپنے دشمنوں کا خوف ہے نہ جان کی پروا۔“

اس نے ہلکی سی خشکی کے انداز میں وہیں بیٹھے بیٹھے ایک گھبرٹ ختم کی اور پھر وہاں سے اٹھ گئی۔

”کیا تم واقعی رستم کے خلاف محاذ کھولنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“ ویرا کے چلے جانے کے بعد سلطان شاہ نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اگر وہ پنڈت منوہرال کی پشت پناہی کر رہا ہے تو اسے اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑے گا۔ کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکے گی۔“

”کیسے پتا چلایا جائے گا کہ پنڈت اسی کے پاس پناہ گزیر ہے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔ ذرا سی چھین چھاڑتے وہ کھلے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”تو کیا تم نے دوبارہ اپنے اصل نام سے میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”ضروری نہیں کہ بس ایک نام ہی چلتا رہے۔ کل ملک ممتاز اور ملک افضل نے بھی اس کے دانت کھٹے کئے ہیں۔ فی الحال وہی سلسلہ مناسب رہے گا۔“

میں اسے ساتھ لے کر بیڈروم میں پہنچ گیا اور مسہری کے سرہانے بیٹھ کر رستم کا نمبر ملایا۔

”ملک ممتاز!“ میں نے تحمانہ لہجے میں کہا ”رستم سے میری بات کراؤ۔“

وہ نام شاید بھیرا کے پورے محل میں شرت پانچکا تھا۔ اس نے کوئی سوال کرنے کے بجائے مجھے لائن ہولڈ کرنے کا

دست برداری

نیاز صاحب کی بیگم جو فل ٹائم ملازمت بچوں کی پرورش اور دیگر گھریلو ذمے داریوں سے ایک ساتھ نبھو آتما رہتی تھیں ایک روز جھلا گئیں اور لڑنے لگیں۔ نیاز صاحب نے ان کی دلجوئی کی ”دیکھو بیگم۔۔۔ تم ایک اچھی بیوی، اچھی ماں اور اچھی لیکچرر ہو لیکن انسان ہر وقت ہر محاذ پر کامیاب نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی کسی محاذ پر اس سے کوئی تباہی بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔۔۔ عارضی طور پر۔۔۔ کچھ دیر کے لیے کسی ذمے داری سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔“

مسز نیاز نے کچھ دیر سوچا پھر پولیس ”ٹھیک ہے۔۔۔ میں اچھی بیوی ہونے کی ذمے داری سے دست بردار ہوتی ہوں۔“

اس شریف آدمی کے کانڈوں کا سارا انبار ہمارے لیے بے کار ہے۔ وہ سامنے آئے تو ہم اسے مفت میں لوٹا دیں گے۔ بس تین کانڈ ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے پوچھو کہ وہ ان کی کیا قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہے؟“

”تم اس سے کوئی سودے بازی کرنا چاہ رہے ہو؟“

رستم کی آواز میں دوبارہ اطمینان اتر آیا۔

”کل تک ہم ضرورت مند تھے اور تمہاری شرطیں ماننے پر مجبور تھے۔ آج تم اور پنڈت ہماری جگہ لے چکے ہو۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ دام لگاؤ، خود چل کر ہمارے پاس آؤ اور لین دین کرلو۔“

”تم بھول رہے ہو کہ وہ سارے کانڈات میرے نہیں، پنڈت کے ہیں۔“

”مگر یہ یاد ہے کہ پنڈت تمہارا جگری پار ہے رستم! ملکوں کے منہ مت لگو۔ ایسی مار کھاؤ گے کہ زندگی بھر کے لیے اپانچ ہو جاؤ گے۔“

”تم چل کر میرے در پر آئے تو میں نے تمہیں عزت دی تھی۔ تمہیں تو بات کرنے کی بھی تیز نہیں ہے۔ یہ کراچی ہے۔ یہاں جاگیروں والے قانون نہیں چلتے۔ تمہیں بھی کوئی

مشورہ دیا اور پھر قدرے تاخیر سے رستم فون پر آیا۔
”تم اول درجے کے جھوٹے اور مکار ہو۔“ رستم پر رستم کی دھیمی اور بیانیہ سی آواز ابھری ”چپیلی رات تم نے بلا وجہ میرا وقت برباد کیا تھا۔“

”وہ گفتگو بلا وجہ نہیں تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے تعاقب کی کوشش میں خاک چاٹنے والے کس کے آدمی تھے اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی۔ تم کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہر سیر کو کہیں نہ کہیں سوا سیر ضرور نکراتا ہے۔ اب میں ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے لگ گیا ہوں۔“

”تو کیا تم ابھی تک کراچی میں ہو؟“ اس کا سوال فوری اور بے ساختہ تھا۔

”تمہارا کبھی کسی ملک سے واسطہ نہیں پڑا۔“ میں نے پُر غور آواز میں کہا ”ہم لوگ اپنی آن کے لیے جان بھی گنوا دیتے ہیں۔ تمہاری کسی اندھی بخوری میں پڑے ہوئے دس لاکھ روپے مالیت کے ڈالر اس کا ثبوت ہیں۔ ہماری زمینیں رہیں یا جائیں، آدمی وہاں لڑکھچیا بھوں یا مارے جائیں، ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ تمہاری گردن پر پیر رکھنے کے بعد ہی ہم کوئی دوسری بات سوچیں گے۔“

فلمی انداز میں ادا کئے جانے والے ان مکالموں پر سلطان شاہ حیرت سے میرا منہ تنک رہا تھا۔

”کل تک میرے سامنے بیگلی بلی بنے ہوئے تھے۔“ رستم کی آواز بدستور دھیمی اور پُر سکون تھی۔ ”اس وقت کوئی اور ہی زبان بول رہے ہو۔“

”اپنے بل میں چوہا بھی شیر ہوتا ہے۔ کل ہم تمہارے بل میں تھے۔ آج میدان میں ہیں۔ ہمت ہے تو میرا سے باہر نکل کر دکھاؤ، جو تے مار مار کر تمہیں بھی پنڈت منو ہر لال بنادیں گے۔“

”پنڈت۔۔۔ منو ہر۔۔۔ لال۔۔۔“ رستم نے توڑ توڑ کر حیرت سے وہ نام دہرایا۔ ”تم یہ نام مجھے کیوں سنارہے ہو؟“

”مان لو کہ وہ تمہارا دوست ہے۔ اس کے سارے کانڈ ہمارے پاس ہیں۔ تمہاری بد معاشری کا بدلہ لینے کے لیے ہم نے اسے ذلیل کیا ہے۔ قسمت بھی اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہے کیونکہ پولیس اس کی پٹی کو اٹھالے گئی ہے۔ وہ کب تک تمہارے پاس چھپا رہے گا۔۔۔“

”اوہ!“ رستم کی آواز اس بار بھی تیز زدہ تھی ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ حرکت تمہاری تھی۔ تم نے پنڈت کو تنگ کر کے پست ہمتی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ بہت شریف آدمی ہے۔“

”اگر مہمانوں کو ہتھاکر کے ذیل کرنا اور ان کا پیچھا کرنا عزت میں گنتے ہو تو ہم تمہیں بہت زیادہ عزت دیں گے۔ اتنی عزت کہ تمہیں سنبھالنی دو بھر ہو جائے گی۔“ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

میرے تذیل آمیز رویے کے باوجود اس نے فون بند نہیں کیا تھا۔ کوئی اقرار نہیں کیا تھا تو میری کسی بات سے انکار بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنا وہ داؤ کارگر ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”یہ ضد اور انا پرستی چھوڑ دو۔ کسی بھی وقت میرے پاس آؤ۔ مل بیٹھ کر ہر بات طے کر لی جائے گی۔“ اس نے رسانیت سے پیش کش کی۔

”اب ہم ادھر نہیں آئیں گے۔ تم میں اپنے نام کی ذرا سی بھی خورہ تو ہمارے پاس آؤ۔ اب ہم بات طے کریں گے۔ تم سے بھی اور تمہارے پنڈت سے بھی!“

”آخر تم پنڈت کے دشمن کیوں ہو گئے ہو؟ اس نے تمہارا کیا بکاڑا ہے؟“

”میرے ساتھ چھوٹے ملک صاحب بھی تھے۔ تم نے دو کی بے عزتی کی ہے۔ پنڈت کے ساتھ مل کر تم بھی دو ہو گئے ہو۔ دو کا حساب ایک سے برابر نہیں ہو سکتا۔“

مجھے جاگیروں کی رسوم و رواج سے ذرا بھی واقفیت نہیں تھی۔ میں نے ملک و قوم کے دشمنوں کو نیچا دکھانے کے لیے اضطرابی طور پر اپنے اور سلطان شاہ کے لیے دو نام پٹنے تھے اور موقع محل کی مناسبت سے رستم ایرانی سے تیر بدل بدل کر بات کر رہا تھا۔ میرا عظیم تر مقصد صرف ایک تھا کہ کسی طرح پنڈت منوہر لال کو رستم کی تحویل سے نکال کر اپنی گرفت میں لے سکوں۔

اس وقت تک میری حکمت عملی کامیاب تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ مکالموں کی وہ جنگ کہاں ختم ہوتی تھی۔

”دیکھو! یہ کھوکھلی دھمکیاں ہم دونوں کا وقت برباد کر رہی ہیں۔“

میں نے پھرے ہوئے لہجے میں رستم کی بات کاٹ دی ”تم وقت کی بات کر رہے ہو، ہم دھاوا بھول کر تمہاری جوبلی کو برباد کر دیں گے۔“ میرا کی اینٹ نے اینٹ بجادیں گے۔

”سمان بن کر آنا تو سوار آؤ لیکن کسی بری نیت سے تم نے ادھر کارن کیا تو میرے آدمی تمہیں اور تمہارے حامیوں کو پھانک پر ہی ڈھیر کر دیں گے۔ میں تمہارا کوئی کمزور باری نہیں، کراچی کا ایک طاقت ور شہری ہوں۔ مجھ سے پنجہ لڑانے والے اپنی انگلیاں تڑوا بیٹھتے ہیں۔“

”وہ کاغذ تمہارے نہیں ہیں، تم اپنے چوہے دان سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں ہو تو تم سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم تم سے پھر کسی وقت ملاقات کریں گے۔“

”وہ کاغذ کسی کے بھی ہوں، میں ان کے عوض میں تمہیں تمہاری دی ہوئی رقم لوٹا سکتا ہوں۔“

میں نے تحقیر آمیز ہنکارا بھر کر کہا ”ہم نے وہ رقم ذرا سی ذاتی رنجش کا بدلہ لینے کے لیے خرچ کی تھی۔ تم کراچی کے کوئی سورا ہو تو کوئی بڑی بات کرو۔“

”بارہ، چند رہ۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے نرمی سے فیاضی کا مظاہرہ کیا۔

”پیسہ مرد کے ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ پنڈت کو لے آؤ۔ ہم خود اس سے سودا کر لیں گے۔ تم کو بتانا ہو گا کہ تمہارے آدمیوں نے ہمارا پیچھا کیوں کیا تھا اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی ہو گی۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس بار رستم کی آواز میں ہلکی سی ترشی تھی ”میں نے تمہاری پگڑی نہیں اچھالی کہ تم سے معافی مانگتا پھروں۔ مہمانوں کو خود ہتھیار چھوڑ کر میزبانوں سے ملنا چاہیے۔ رہی پیچھا کرنے کی بات تو دوسری ملاقات میں تمہاری باتوں نے مجھے سبے میں ڈال دیا تھا۔ اسی وقت میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگلی بار تمہارا پیچھا کراؤں گا۔ ان باتوں کو یاد کرو گے تو تمہیں میرا فیصلہ درست محسوس ہو گا۔“

”پنڈت کو کب اور کہاں لارہے ہو؟“ میں ایک دم نرم ہو گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ پنڈت منوہر لال کے بارے میں کہاں تک سمجھو مانا کرنے پر تیار ہے۔

”وہ کہیں نہیں آسکتا۔ تم مجھ سے بات کرو۔ میں ابھی فیصلہ کر دوں گا۔“

”سارے کاغذ لو گے یا صرف تین کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے اسے سلگانے کا ارادہ کر لیا۔

”تم نے تین کی بات کی ہے۔ باقی اس کے کھاتوں کے حساب اور تمسکات ہیں۔ تم نے وہ سب مفت میں لوٹانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”تین کاغذوں کے لیے تین کروڑ کا بندوبست کرلو۔ جگہ ہم بتا دیں گے۔“ میں نے رعونت سے کہا۔

”تین کاغذوں کے لیے تین کروڑ؟“ اس بار رستم اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکا۔ میرے مطالبے نے شاید اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔

”پنڈت سے پوچھ لینا۔ میں پھر کسی وقت فون کر لوں گا۔“

تیسرا کانڈ بھی قلمی تھا۔ اس پر ہاتھ سے چار خانے بنا کر کسی ترتیب کے بغیر سات قطاروں میں انگریزی کے حروف چھپی لکھے گئے تھے۔ ہر حرف کے سامنے ایک نمبر لکھا ہوا تھا جو دو ہندسوں پر مشتمل تھا۔ وہ تینوں کانڈ پنڈت کی تجویز سے برآمد ہونے والی ایک ہی فائل سے نکلے تھے اور باہری النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بچے نے حروف چھپی اور ہندسے لکھنے کی مشق کی ہو۔

”ہو سکتا ہے کہ پنڈت اور رستم کے لیے کوئی اور کانڈ ذات اہم ہوں جبکہ عم نامہل پر زوں کا حوالہ دے رہے ہو۔“ ویرا چند منٹ تک ان کانڈوں میں سرکھانے کے بعد بولی ”مجھے ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ فائلوں کی دوبارہ ورق گردانی کرو گے تو ایسے کئی کانڈ اور بھی مل سکتے ہیں۔“

”سچ بات یہ ہے کہ شروع سے اب تک تمہارا ساتھ دینے کے باوجود میں ابھی تک ان کانڈوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکا۔“ سلطان شاہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

”یہ تم دونوں کی اپنی اپنی رائے ہو سکتی ہے۔ میں موی کے بیان کی روشنی میں ان تینوں کانڈوں کو دیکھ رہا ہوں اس لیے انہیں اہمیت دے رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کوئی کانڈ صرف اس وجہ سے اہم نہیں ہو سکتا کہ اس پر اسرائیلی سیکرٹ سروس یا اس کے دو عام عہدوں کے نام لکھ دیے گئے ہیں۔“ ویرا اپنی عادت کے مطابق پھر بحث پر تلی ہوئی تھی ”یہ نام اور ان کے بارے میں مضامین، معلومات عامہ کی بہت سی کتابوں میں مل جائیں گے۔ انہیں کسی بھی طرح اہم قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

میں نے اس سے بحث جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا ”میں تم کو اپنی رائے قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس وقت رستم سے ہونے والی گفتگو نے میرے اندازے کی تصدیق کی ہے۔“

”وہ سودے پر آمادہ ہو بھی گیا تو تمہیں اس سے مل کر شرمندگی ہوگی۔ وہ ان کانڈوں کو پہلی ہی نظر میں مسترد کر دے گا۔“ ویرا نے فتویٰ دے دیا۔

میں نے اس کے جواب میں خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ بحث کو بڑھانے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔

میرے ذہن میں ان واقعات کی بنیاد پر ایک سنگین خاکہ ترتیب پا چکا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی روشنی میں کام کو کس طرح آگے بڑھایا جائے۔ رستم کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اول خان کی مجبوریاں اور اس کا خفا

ان کانڈوں کے لیے شاید وہ اپنی زندگی بھی گروی رکھانے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

میں فون بند کر کے سلطان شاہ کی طرف مڑا تو ویرا دونوں ہاتھ کمر لٹکائے، دروازے کے وسط میں تنی ہوئی کھڑی تھی۔

”کوئی رستم سے گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”پنڈت کو اسی نے پناہ دی ہوئی ہے۔ تینوں کانڈ بہت اہم ہیں۔“ میں نے مسکرا کر بتایا۔

”کانڈ کے ان پر زوں کے بارے میں کیا اسی نے تمہیں بتایا ہے؟“ ویرا نے بے اعتباری سے پوچھا۔

”میں نے تین کانڈوں کا حوالہ دیا تھا۔ وہ ان کے پندرہ لاکھ دینے پر آمادہ ہے۔“

”چند ہی روز میں تمہاری رقم ڈیڑھ گنا ہو کر واپس مل رہی ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”ہماری رقم تو اول خان لوٹا ہی دے گا۔ اب میرا ہدف صرف پنڈت ہے۔ اسی وجہ سے میں نے تین کروڑ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔“

”بظاہر وہ تمہارا مطالبہ تسلیم کر لے گا مگر کانڈ لے کر تمہاری گردن اڑانے کی کوشش کی جائے گی۔“ یہ کہتی ہوئی وہ خواب گاہ میں آگئی ”تم اس مرتبہ پھر آگ سے ٹھیل رہے ہو۔ ذرا وہ تینوں کانڈ ایک مرتبہ پھر دکھاؤ۔ مجھے پتا تو چلے کہ ان میں کیا راز پنہاں ہے۔“

میں نے سائنڈ ٹیبل کی دراز سے وہ تینوں کانڈ نکال کر ویرا کی طرف بڑھا دیے۔ سلطان شاہ بھی تجسس آمیز انداز میں کرسی سرکا کر آگے آگیا۔

ایک کانڈ کاپی کے پوشیدہ سے صفحے پر مشتمل تھا۔ اس کے اوپر پی گوشتے پر پھینکی قلمی تحریر میں MOSAD کا لفظ تحریر تھا اس کے نیچے خط لگا کر چھ ہندسوں پر مشتمل ایک نمبر لکھا ہوا تھا۔ نیچے شاید چیف اور اس کے سیکریٹری کے فون نمبر درج تھے۔ یہ سب میرا قیاس تھا ورنہ ویرا اس صفحے کو یکسر مسترد کر چکی تھی۔ اس کے نزدیک اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد کا نام بھی اہم نہیں تھا۔

دوسرا کانڈ انگریزی میں چھپا ہوا تھا۔ اس پر کہیں کسی کا نام تھا نہ دستخط اور تاریخ۔ اوپر جیوش انٹرنیشنل سیکرٹ سوسائٹی کا نام اور اس کا مخفف JISS چھپا ہوا تھا۔ متن میں تصدیق کی گئی تھی کہ اس کانڈ کا حامل تمام عملی اور نظریاتی مقاصد کے لیے سوسائٹی کا تاحیات رکن منتخب کر لیا گیا ہے۔ ویرا نے اس کانڈ کو بھی بے معنی اور گراہ کن قرار دیا تھا۔

پر برا بھلا ہو گئی ”میں کبھی کبھی تم سے تکرار کے لیے بھی ایسی باتیں کر لیتی ہوں لیکن ایمان داری سے بتا رہی ہوں کہ اس بار میں تم سے ذرا بھی متفق نہیں ہوں۔“

”تم نے پھر وہی موضوع زندہ کر کے میرا دماغ خراب کرنا شروع کر دیا!“ میں نے اسے گھور کر سختی سے کہا ”میں اسی لیے اس کمرے میں آیا تھا۔“

وہ ا..... اپنے دونوں کانوں کو چھو... کر دل آویز انداز میں مسکرا دی۔

اول خان آیا تو وہ بدستور میرے سر پر سوار تھی۔ غنیمت تھا کہ اس دوران میں اس نے اپنے وعدے کی مکمل پاس داری کی تھی۔

”میں خود بھی دفتر میں آکٹا ہٹ محسوس کر رہا تھا۔“ اول خان نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا ”بس یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ تم چاروں مجھ سے پیچھا چھڑا کر بھاگے ہو۔ میں نے روز یہاں کے چکر لگانے شروع کر دیے تو تم پھر گھبرا جاؤ گے۔“

”لا حول ولا قوت“ میں نے بڑا سمانہ بنا کر کہا ”تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ آکٹا ہٹ تمہاری ذات سے نہیں، وہاں کے سنگاخ اور یکساں مردانہ ماحول سے تھی۔ دیر کو وہاں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ زیادہ دیر تک ایسے خشک ماحول میں نہیں رہ سکتی۔“

”یہ غزالہ کی شکایت تھی۔ بلاوجہ مجھے بدنام مت کرو۔“ وہ بڑے احتجاج کیا۔

”شکایت کسی کو بھی ہو، اس کا وجود ضرور تھا۔“ اول خان بولا ”میری خرابی یہ ہے کہ میں خود کو اپنے ماحول سے الگ نہیں سمجھتا کیونکہ انتھک محنت اور بے لوث کارکردگی کے لیے وہ ماحول میرا اپنا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ میں نے آفرار کیا ”گمانڈر اپنی کمان میں موجود ہر خوبی اور خرابی کا پوری طرح ذمے دار ہوتا ہے۔ کبھی یہ خیال دل میں نہ لانا کہ ہم میں سے کوئی تمہاری ذات سے فرار کا خواہاں ہے۔ اسٹیژن فور میں ہمارے لیے تم ہی تبدیلیوں کی علامت تھے ورنہ ہمارے لیے وہاں کھانے اونگھنے اور پھر سوجانے کے علاوہ کیا مصروفیت تھی؟“

”یہ باتیں چلتی رہیں گی۔“ اس نے کرسی میں پہلو بدل کر کہا ”یہ بتاؤ کہ رات کیا نتیجہ نکلا۔“

”تمسکات، بیک اسٹیٹ منٹ اور پروٹوٹ۔ یہ اس قیلے کی کل کائنات تھی۔ اس پلندے سے اندازہ ہوتا ہے کہ

رو یہ میرے سامنے تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ میرے پاس سرکاری حلقوں تک رسائی کے لیے اول خان کا کوئی متبادل نہیں تھا۔

میں نے اول خان سے رابطہ کیا تو اس کے پاس کوئی خاص کام نہیں تھا۔ میری فرمائش پر وہ فوراً ہی ہمارے پاس آنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

پچھلی رات وہ بھی کافی دیر تک اس پلندے میں سرکھپاتا رہا تھا جو میں پنڈت منوہر لال کی تجویز سے نکال کر لایا تھا لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ واپس چلا گیا تھا۔ اپنے ٹھکانے سے ہماری روانگی کے بعد اسے اپنے گھر کا خیال آ گیا تھا۔ بیوی بچوں کو پشاور سے بلانے سے پہلے گھر کی صفائی ستھرائی اور روزمرہ لوازم کی فراہمی کے لیے اسے تھوڑا سا وقت درکار تھا۔

اول خان کے آنے سے پہلے میں نے تین خصوصی کانڈوسمیت، پورا ریکارڈ فاضل خواب گاہ میں منتقل کر دیا۔ کسی ہنگامی ضرورت کے لیے غزالہ نے وہاں اتنا بندوبست کر دیا تھا کہ اسے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ کھلے ہوئے ڈرائنگ روم کے مقابلے میں، میں وہاں زیادہ سکون سے بات کر سکتا تھا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ اول خان کے ساتھ راز و نیاز کی تیاری ہو رہی ہے۔“ مجھے فالکوں وغیرہ کا ڈیڑھ مغل کرتے دیکھ کر ویرانے طفر کیا۔

”راز و نیاز سے زیادہ یہ تمہاری سہولت کا خیال ہے۔ تم ڈرائنگ روم میں آرام سے بیٹھی ٹیلی وژن پر دو گرام دیکھتی رہو۔“

”اور اگر میں ٹیلی وژن پر دو گرام نہ دیکھنا چاہوں؟“ اس نے سوال کر ڈالا۔

”پھر تمہارے ساتھ شریک ہو سکتی ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کھلے ذہن سے شرکت کرو۔ ابھی تک تم مخالفت برائے مخالفت کرتی رہی ہو۔“

”میں خاموش رہوں گی۔“ وہ اٹھلا کر بولی ”دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم اول خان کو کس طرح شیشے میں اتارتے ہو۔ وہ تمہاری باتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔“

”معقول بات تمہارے سوا ہر ایک کو متاثر کرتی ہے۔ بار بار ایسا ہو چکا ہے کہ ایک بات پر اڑ جانے کے بعد تمہیں اپنا موقف بدلنا پڑا ہے پھر بھی دھڑائی تمہاری فطرت میں شامل ہے۔“

وہ میرے ساتھ ہی خواب گاہ میں چلا آیا اور ایک کرسی

ہوئے میں نے الگ نکالے ہوئے تینوں کاغذ اس کے سامنے ڈال دیے۔

اول خان نے غور سے ان کاغذوں کا جائزہ لیا۔ اس کے سیاہ چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ویرا کی طرح وہ بھی کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

”کیا یہ کاغذ بھی ان ہی فالٹوں میں سے ملے ہیں۔“ خاصے طویل اور فکر آمیز سکوت کے بعد اس نے پوچھا۔
”اس کی کاروباری دستاویزات سے ہٹ کر بس یہی تین کاغذ مختلف تھے۔“

”موساد اور سیکرٹ سوسائٹی کے ناموں کی وجہ سے ان کاغذوں کی کوئی اہمیت ہو تو ہو ورنہ بظاہر یہ بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔“ اس نے تذبذب سے کہا۔

”میری رائے تم سے سو فی صد متفق ہے۔“ ویرا مطالب کی بات سنتے ہی بے ساختہ بول پڑی۔

”غور کرنے والی بات یہ ہے کہ پنڈت منوچر لال کے گھر بظاہر چوری کی واردات ہوئی ہے۔ وہ کچھ دیکھ بھالے یا پولیس سے رجوع کیے بغیر روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کا کیا سبب سمجھ میں آتا ہے؟“ میں نے بنیادی سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔

”میں اس کی روپوشی کو زیادہ اہمیت نہیں دوں گا۔ تم نے خود بتایا ہے کہ وہ نقشے میں مدہوش تھا۔ فائرنگ کے شور سے بڑبڑا کر اٹھا اور گھر سے نکل بھاگا۔“

”نشہ اترنے کے بعد اسے اپنے گھر لوٹ آنا چاہیے تھا۔“ میں نے اول خان کے استدلال پر اپنی جگہ اٹھا کر اظہار کیے بغیر پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ آیا ہو۔ اس وقت تک پولیس اس کی بیٹی کو لے جانے کے لیے وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر اٹل پاؤں نہیں غائب ہو گیا۔ اسے خوف ہو گا کہ کہیں وہ بھی نہ دھریا جائے۔“

اول خان کے منطقی جواب پر ویرا فاتحانہ انداز میں مسکرائے لگی۔

”فکر میں نے اس طرح نہیں سوچا۔“ مجھے اپنا نکتہ نظر بیان کرنا پڑ گیا۔ ”تم شراب نہیں پیتے اس لیے یہ بات نہیں سمجھ سکے۔“ مگر ویرا مجھ سے اتفاق کرے گی کہ عادی شرابی کیسے ہی نقشے میں ہوا شعوری طور پر اپنے مفادات کے بارے میں ہوشیار رہتا ہے۔ وہ فائرنگ سے بدحواس ہو کر نہیں بھاگا۔ یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ نامعلوم چور نقدی اور زیورات کو چھوڑ کر سارا ریکارڈ لے گئے

تھے۔“

”اور تمہارا خیال ہے کہ اسے ریکارڈ سے زیادہ ان تین کاغذوں کی فکر تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”تم ذہین ہو۔ یہ واقعہ بالکل اسی طرح رونما ہوا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پنڈت کو رستم ایرانی نے پناہ دی ہوئی ہے۔ میں رستم سے بات کر چکا ہوں۔“

اول خان کی آنکھوں میں عقاب کی چمک نمودار ہو گئی اور وہ اپنی کرسی میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے رستم کے ساتھ ہونے والی گفتگو دہرائی شروع کر دی۔

تفصیلات سامنے آنے کے ساتھ ساتھ اول خان کے چہرے پر جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ باتیں بہت سیدھی اور واضح تھیں اور خود ایک راہ کا تعین کر رہی تھیں۔

”تم بالکل صحیح سمت میں سوچ رہے ہو۔“ پوری بات سن لینے کے بعد اول خان بولا ”ہو سکتا ہے کہ پنڈت خود موساد کے لیے کام کر رہا ہو۔“

”جیوش انٹرنیشنل سیکرٹ سوسائٹی والا مطبوعہ صداقت نامہ صرف اسی کے لیے ہے۔ چار خانوں میں بنا ہوا الفاویز مرک چارٹ ان کے خفیہ پیغامات کا ڈی کوڈر ہو سکتا ہے۔“

اول خان نے پُر جوش لہجے میں درمیان سے میری بات اچک لی ”یہ بالکل ڈی کوڈر چارٹ ہے۔ اے سے زیڈ تک تمام حروف کے لیے نمبر مقرر کیے گئے ہیں۔ بات میرے ذہن میں چکر رہی تھی لیکن میں اتنے صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔“

”اگر سیکرٹ سوسائٹی کے ارکان نے اپنے لیے ڈی کوڈر اسی طرح ہاتھ سے نقل کیا ہوا ہے تو سوسائٹی بہت یتیم اور مسکین معلوم ہوتی ہے۔“ ویرا نے متفقہ رائے کا بے دردی سے مضحکہ اڑانا شروع کر دیا۔ ”جس سوسائٹی کے پیچھے یہودیوں کا ذہن کار فرما ہو، وہ ہرگز اتنی بے سرو سامان نہیں ہو سکتی۔ دنیا جانتی ہے کہ یہودی اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے دریا ولی سے پیسہ لٹاتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ پنڈت نے کسی مجبوری کی وجہ سے مطبوعہ ڈی کوڈر چارٹ کو نقل کیا ہو۔ یہودی سرگرمیوں کے لیے پاکستان ایک دشوار سرزمین ہے۔“ اول خان میرا ہم لہوا بن چکا تھا۔

”ڈیوڈ اشارز کے تعاقب میں ہم نے امریکا کی خاک چھانی ہے۔“ ویرا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”دیکھو یہ اہم معاہدے کی فائل تم نے خود حاصل کی تھی۔ یہودیوں کی

بھی گھنڈ ہے۔ تمہیں کسی نہ کسی دروازے پر دستک دینی پڑے گی۔“

”معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا ورنہ پنڈت ہاتھ سے نکل بھی سکتا ہے۔“

”کل تک تم رستم کے بارے میں اتنے محتاط تھے کہ پنڈت کے گھر جانے سے بھی گریز کیا۔ ایسا نہ ہو کہ اس گوشش میں تم کی دشواری میں پڑ جاؤ۔“ ویرا ایک مرتبہ پھر بول پڑی۔ اس بار اس کا لہجہ مصالحانہ تھا اس لیے میں نے اسے مداخلت پر ٹوکنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

”یہ اچھا ہوا کہ اب تک میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں اور ڈینی نے اپنے یا کرٹل جمال دتی کے معروف نام کے بجائے ملک ممتاز کے روپ میں رستم کا سامنا کیا ہے۔ ایک انا پرست جاگیردار سے ذاتی خاصیت کے خوف کی بنا پر وہ الزام تراشیاں نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی خاموشی کی وجہ سے میں کسی نہ کسی کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ معاملہ پنڈت منوہر لال تک محدود نہ ہو۔ کچھ اور لوگ بھی اس کے لیے کام کر رہے ہوں۔ اس کی روپوشی طویل ہونے کی صورت میں وہ زر زمین چلے جائیں گے اور ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔“ میں نے کہا۔

”تم مجھے ان تینوں کاغذوں کی نقلیں دے دو۔ میں ابھی اس مشن پر نکلتا ہوں۔“

”میں لے جاؤ، راستے سے فوٹو کاپیاں کروالینا۔“ میں نے وہ کاغذ اسے دے دیے۔

وہ اٹھ رہا تھا کہ غزالہ اس کے لیے چائے لے آئی اور اسے مزید کچھ دیر کے لیے بیٹھنا پڑ گیا۔

اول خان کے جانے کے بعد میرے ذہن پر ایک عجیب سا اضطراب طاری ہو گیا۔ سامنے بہت کچھ نظر آرہا تھا مگر میں بے بس تھا۔ اگلی کامیابیوں یا ناکامیوں کا دار و مدار اول خان کے مشن پر تھا۔

دوسرے کے کھانے کے بعد سلطان شاہ نئے گھر کے لیے خریداری کے مشن پر نکل گیا۔ اس مرتبہ غزالہ کو مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑا کیونکہ گھرداری کی ضروریات کے بارے میں سلطان شاہ کی معلومات کا خزانہ صفر سے کچھ ہی زیادہ تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد گھر میں میرے اور ویرا کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ امریکا سے واپسی کے بعد اسے ایسا موقع پہلی بار ملا تھا۔ میرے ذہن پر اس کی طرف سے ہلکا سا

سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کے باوجود ہمیں کہیں بھی اس سیکرٹ سوسائٹی کا نام سننے کو نہیں ملا اور تم نے اسے پنڈت کی تجویز سے برآمد کر لیا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو مگر میری رائے ہے کہ اس طرح ہم وقت ضائع کریں گے۔“

میں صبر و سکون سے اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے بات پوری کر لی تو میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا ”تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہماری گفتگو میں ایسی دخل اندازی نہیں کرو گی۔ پلیز! اب تم ڈرائنگ روم میں چلی جاؤ تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔“

”سوری!“ وہ فوراً خوشامد پر اتر آئی ”تمہیں معلوم ہے کہ بولنا میری سرشت میں شامل ہے۔ اول خان کو میری رائے سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ میں اب نہیں بولوں گی۔“

”تمہاری بات ادھوری رہ گئی۔“ اول خان نے مجھے یاد دلایا ”موساد والے کاغذ کے بارے میں تم کچھ بتانے والے تھے کہ میں درمیان میں بول پڑا۔“

”اپنے نام کی طرح ”جس“ کوئی خفیہ اور محدود سوسائٹی ہو سکتی ہے۔ فری سینسز کے بارے میں ہم بہت کچھ سنتے اور پڑھتے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ موساد کا چیف براہ راست ”جس“ کی سرگرمیوں کا نگران ہو۔ کاغذ پر چیف اور اس کے سیکریٹری کے ڈائریکٹ فون نمبر بھی ہو سکتے ہیں۔“

”تھیوری مکمل اور بے داغ ہے۔ یہ پاکستان کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کی ایک ٹکون ہے جس میں سی آئی اے، را اور موساد والے ملوث ہیں۔“ اول خان بات سمجھ رہا تھا۔

”اور انہی جو ان سازشوں کا تخلیق کار تھا، رستم کی ایک سازش کے نتیجے میں اپنے انجام سے دو چار ہو چکا ہے۔ مگر بخشی کو ہم نے اپنی سفارتی مصلحتوں اور مجبوریوں کی بنا پر نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی جگہ دھن راج گرفت میں آیا ہوا ہے۔“ میں نے وضاحت کی ”پنڈت منوہر لال جو ہمارا شہری ہے، بظاہر موساد کا آلہ کار نظر آرہا ہے اسے ہماری پوری توجہ کی ضرورت ہے۔“

”یعنی اب رستم براہ راست ہمارا مد مقابل بن چکا ہے۔“ اول خان پر خیال آوازیں بڑھایا۔

”اگر وہ قلعہ بند مکان میں محصور ہو کر نہ بیٹھا ہو تا تو میں خود ہی اسے نکال ڈال سکتا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہاں صحیح محافظوں کا ایک لشکر موجود ہے اور اسے اپنے اثر و رسوخ پر

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار

قیمت ۱۵ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

عظمت کے مینار

قیمت ۱۵ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ایمان کا سفر

قیمت ۱۵ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

پچرا گھر

قیمت ۱۸ روپے ڈاک خرچ ۱۹ روپے

آدھا چہرہ

قیمت ۲۰ روپے ڈاک خرچ ۲۱ روپے

کالی کہانیاں

قیمت ۳۶ روپے ڈاک خرچ ۳۷ روپے

نیکو لوٹ کی چوکیاں

ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

اسلام کے عاشقوں
اولیائے کرام کے دلچسپ
اور شگفتہ واقعات
ضیاء اللہ بک لکھی کے قلم سے

حنیفاء و تسنیم بلگرامی
کے مضامین
کا دوسرا مجموعہ

محی الدین نواب کی
۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ
”وہ فن پارے“
جن کی آپ کو تلاش ہے۔

محی الدین نواب کی
کہانیوں کا دوسرا مجموعہ
جسے آپ انھوں نے نہیں
دل سے پڑھیں گے۔

محی الدین نواب کا پہلا طویل
معاشرتی ناول ابن گولڈن کے لیے
ایک تازہ نوجوان کی زندگی کے بارے
میں اپنا آل چہرہ چھپا کر لکھنے ہیں

جرائم کا دوسرا شیطان آدم اور اح
ظفر و وزاح، اسرار و خوف
سپینس اور تھریسر بر
مبنی ۲۲ کہانیاں

مشہور نیکو لوٹ کی چوکیاں
چیزیں کراں خود مراد خٹہ پر
چسپا ہے۔

قیمت فی جلد ۵۰ روپے

خوف سوار ہونے لگا۔

غیبت یہ ہوا کہ موقع میسر آنے پر وہ میری طرف آنے کے بجائے اپنے کمرے میں جا گھسی اور میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مصروف رہنے کا ایک جیلہ سوچ لیا۔ جہاں گیردن میں اپنی گولڈن فارمیسی چلاتا تھا۔ میں نے اپنے کمرے سے اس کا نمبر ملا لیا۔

دکان میں دو ملازمین کی موجودگی کی وجہ سے وہ فرصت سے بیٹھا ہوا تھا۔ میری آواز سن کر خوش ہو گیا اور جھکنے لگا ”آج تم ہیٹ ٹرک ٹکمل کر رہے ہو۔ پچھلے دو دنوں سے گھر آرہے تھے اور اب فون پر موجود ہو۔ مجھ پر یکایک اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہو؟“

”مہربانی نہیں، بس ایک اطلاع دینی تھی۔ ہم نئے مکان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ چاہو تو یہاں کا فون نمبر لکھ لو۔ ضرورت کے وقت کام آئے گا۔“

”مبارک ہو۔ اب تم دوبارہ صاحب جاکد او ہو گئے ہو۔ نمبر بتاؤ۔ اب روز گپ شب ہوا کرے گی۔“

میں نے اسے نمبر کھوانے کے بعد کہا ”دن کے اجالے میں تم بہت معقول باتیں کرتے ہو۔ شام کو بچنے کے بعد تمہاری عقل پر ایسی خاک پڑتی ہے کہ ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔“

”گھر میں رہ کر عقل استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یہ کام سہل ہی کرتی ہے۔ اسی وجہ سے میں نے آج تک اسے پچھلے تک کی دعوت نہیں دی۔“

”اوہ! تو ایسے امکانات پر بھی غور کرتے رہتے ہو۔“

میں نے اسے ”اب تم دن دیر ماڑے بہک رہے ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا ”دکان تمہاری روزی ہے۔ وہاں بیٹھ کر اپنے ملازموں کے سامنے ایسی باتیں کرنا“

کتابیات پسلی کشن

۱۳ مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

https://gkaksociety.com

شکوہ کیا۔

اسے فون کر کے میں نے خود کو مصروف کرنا چاہا تھا۔ وہ ادھر ادھر کی ہانکنا رہا۔ جب وہ میرے تیز و تند جوابوں سے اکتا گیا تو میں نے اسی کے کہنے پر ریسیور وارکڈ دیا۔

فون پر ہم دونوں میں سے کسی ایک کے مصروف ہونے میں ہی عافیت تھی۔ ویرا کو جتنا گنہگار بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔ اس کی خوشامدائہ تعریفوں سے خوش ہونا اور پھر باتوں کو طول دیتے چلے جانا، ہمیشہ ویرا کے پسندیدہ مشاغل رہے تھے۔ ریسیور اسے دیتے ہی میں مسرے سے اتر کر کمرے سے نکل گیا۔

میں خاصی دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا ٹیلی وژن پر گرام دیکھتا رہا لیکن ویرا میرے کمرے سے برآمد نہیں ہوئی وہ اس وقت جس موڈ میں تھی اس کے لیے جتنا گنہگار اس کے ساتھ موزوں گفتگو کر سکتا تھا۔

ٹیلی وژن پر گرام دیکھتے ہوئے بھی میرے ذہن میں پنڈت، موساد اور ”جس“ کے نام چکوا رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کاپی کے کاغذ پر موساد کے نام کے ساتھ لکھے ہوئے دو نمبروں پر براہ راست ڈائلنگ کر کے یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ وہ واقعی اسرائیل کے کسی شہر کے نمبر تھے یا نہیں کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔

وہ خیال آتے ہی میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ ویرا فون کا ریسیور کان سے لگائے میری مسرے پر نیم دراز تھی اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے گلاس کا آدھا سال اس کے معدے میں اتر چکا تھا۔

مجھے بھر کے لیے مجھے اس کے احمقانہ انشماک پر غصہ آیا مگر میں فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ ویرا کی اس خوجیت میں میرے لیے امان ہی امان تھی۔

ٹیلی فون کی برانی ڈائرکٹریاں میں ڈائلنگ روم کی ایک دراز میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کی پہلی جلد نکالی اور اس کے مخصوص صفحات پر موجود اس فہرست کو دیکھا جس میں دنیا بھر کے مختلف ملکوں اور شہروں کے لیے براہ راست ڈائلنگ کے کوڈ موجود تھے۔ ایک بار پھر دوسری جلد بھی جائزہ لیا لیکن ایران اور اٹلی کے درمیان تو کیا پوری فہرست میں کہیں بھی اسرائیل کا نام یا کوڈ موجود نہیں تھا۔

ڈائریکٹری چھوڑ کر میں نے ایک مرتبہ پھر کمرے میں جھانکا تو ویرا اپنے شغل میں مصروف تھی۔ گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر وہ دوبارہ فون پر مخاطب ہو گئی۔

میرے لیے اسے چھیننا مناسب تھا نہ میں زیادہ دیر مہر

”اونچی آواز ہو تو اس سے کہیں ہلکی باتیں بھی باعث شرم ہوتی ہیں۔ میری آواز بہت نیچی ہے۔“ اس نے مکارانہ لہجے میں کہا ”دراصل ویرا دن رات تمہارے ساتھ رہ رہ کر اپنی قدر کھو بیٹھی ہے ورنہ۔“

اسی وقت ویرا ہاتھ میں اسکاچ کا ایک گلاس لیے، مطلق ہوئی، بہت شوخ انداز میں دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے فوراً ہی جا گنہگار کی بات کاٹ دی ”تم نے اس کا نام لیا اور وہ آگئی۔ کہو تو اسے بلا کر تمہاری بات کروا دوں۔“

”پہلے تم سے باتیں ختم ہو جائیں تو اسے بلا لینا۔ اس سے بات کر کے طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔“

جا گنہگار کا جواب سننے کے دوران میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر فون کال کے بارے میں ویرا کے استفسار کا جواب دیا۔ ویرا جا گنہگار کا نام سن کر بستر پر میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور میں سمٹ کر ایک طرف ہو گیا۔

”مجھ سے تمہیں اور کیا باتیں کرنی ہیں؟“ ویرا کے غیر متوقع نزول نے میرے ذہن کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔ لہجے کے بعد اس کی وہ بے نوشی میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔

”اپنے آس پاس میرے لیے بھی کوئی مکان دیکھ لو۔“ فلیٹ میں کچھ مزہ نہیں آتا۔ اس بہانے ہم ایک دوسرے کے قریب بھی ہو جائیں گے۔“

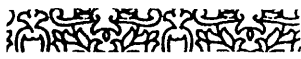
”میرے قرب کے نتائج تم پہلے ہی بھگت چکے ہو۔ اب میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ بہتر یہ ہے کہ جہاں رہ رہے ہو وہیں دل لگانے کی کوشش کرو۔“ ”کس سے دل لگاؤں؟ یہ کام سہلی کے ساتھ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”نی الحال فلیٹ سے ہی دل لگاؤ۔ تمہاری بدینتی کی بنا پر وہ ملازمہ بھی نہیں بد لے گی۔“

”یار انتہا ہے۔ وہ بچی بارہ سو روپے لے رہی ہے۔ بڑی آئے گی تو وہ اتنے ہی پیسوں میں بہت زیادہ کام کرے گی۔ یہ معمولی سی بات تم ہی اس کی کھوپڑی میں ڈال دو تو میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔ میری روکھی پھینکی زندگی میں تھوڑی سی رونق اور بہار آجائے گی۔“

”ویرا اسے بات کر لینا۔“ میں نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی ویرا کو آنکھ مار کر کہا ”ہو سکتا ہے کہ وہ دو چار روز کے لیے تمہاری سہمان نوازی قبول کر لے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔“

”بھی کبھی تم بہت طوطا چشم ہو جاتے ہو۔“ اس نے



صورتِ حال

نرس:- یہ ایمر جنسی آپریشن کس کا ہو رہا ہے؟

اردلی:- ایک غریب آدمی کا۔۔۔ جو گولف کورس کے قریب سے گزرتے ہوئے جمائی لے رہا تھا۔ سیٹھ صاحب نے ہٹ لگائی اور بال سیدھی اس کے پیٹ میں چلی گئی۔

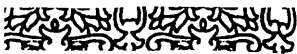
نرس:- اچھا۔۔۔ وہ صاحب جو آپریشن ٹھیکر کے باہر بے چینی سے ٹل رہے ہیں شاید اس آدمی کے رشتے دار ہیں؟

اردلی:- نہیں۔۔۔ وہ تو سیٹھ صاحب ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں آپریشن مکمل ہو تو وہ بال لے کر کھیل مکمل کریں۔

الزام

سیٹھ صاحب کو بھرانہ حملے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ الزام ایک مشہور اداکارہ نے لگایا۔ عدالت میں وکیل صفائی نے پوچھا ”محترمہ! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ سیٹھ صاحب نے کب آپ پر بھرانہ حملہ کیا؟“

”جی ہاں۔ گزشتہ سال اپریل، مئی، جون اور جولائی میں۔“ اداکارہ نے جواب دیا۔



”پہلی بات یہ کہ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ دوسرا اشارہ تم نے خود فراہم کیا ہے۔ اس سے بات کرنے سے پہلے تم بستر میرے اتنے قریب آئیں تھیں کہ میں بوکھلا گیا تھا۔ اس کی ذہر فشانیاں سن لینے کے بعد تم مجھ سے گزروں دور بیٹھی ہو۔“

ویرا سر جھک کر ہنس پڑی ”تم واقعی بہت چالاک ہو اور شاید اٹنی چڑا کے پر بھی گن لیتے ہو۔ اس نے بہت کچھ کہا

کر سکتا تھا۔ میں نے کمرے سے موبائل فون اٹھایا اور ٹیلی وژن کی آواز بند کر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔

ٹیلی فون پر انکوائری کا نمبر ملانا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ متعدد گوشوں کے بعد نمبر ملا تو دیر تک کھنٹی بجتی رہی جس کے بعد آپریشن کی آواز آئی۔

اس سے شکایت بے سود تھی۔ کچھ کہتا تو وہ برہم ہو کر لائن بند بھی کر سکتا تھا۔

میری زبان سے اسرائیل کا نام سنتے ہی آپریشن طعنے لہجے میں پوچھا کہ مجھے اسرائیل سے کیا کام پڑ گیا تھا۔

”اسرائیلی ریاست سے کوئی کام نہیں ہے، بس ایک ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے قہقہے سے جواب دیا۔

”دوبارہ کسی سے یہ دریافت نہ کریں ورنہ فون آبروروشن میں آجائے گا۔“ اس نے ہمدردانہ اور قدرے طعنے پیرائے میں جواب دیا ”اسرائیل دشمن ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہاں کے لیے ڈائریکٹ ڈائلنگ ممکن ہے نہ کال بک کی جاتی ہے۔“ اسی کے ساتھ فون بند ہو گیا۔

ویرا نے گلاس ختم ہونے کی وجہ سے فون بند کیا یا باتیں ختم ہونے کے بعد گلاس خالی کیا، اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ وہ کمرے سے برآمد ہوئی تو گلاس خالی تھا۔

”تمہارا دوست بہت دلچسپ آدمی ہے۔“ اس نے لابی میں رک کر مجھے سنایا ”کاش وہ تمہیں بھی عورتوں سے بات کرنے کا خوب صورت قہر نہ سکھا سکے۔“

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے بننے کا جو ناوقت دورہ پڑا ہے، وہ سرور گرا ہونے سے پہلے ختم نہیں ہوگا۔ وہ ذرا سی دیر میں دوبارہ نمودار ہوئی اور مجھ سے کافی فاصلے پر پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں تھوڑی سی حیرت ہو رہی ہوگی کہ آج میں تم سے دور کیوں ہوں۔“ اس نے نئے گلاس سے ایک کھونٹ لے کر پوچھا۔

”تھوڑی نہیں خاصی حیرت ہے۔“ میں نے پورے خلوص سے اعتراف کیا ”شاید جانتی گئے تمہیں میرے خلاف ورغلا یا ہے۔ عورتوں کے معاملے میں وہ پکا سٹور اور خود غرض ہے۔“

ویرا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ”تم نے کوئی بات نہیں سنی۔ سچ بتاؤ کہ تم اتنے صحیح اندازے کیسے لگالیتے ہو؟ وہ واقعی مجھے اکسا رہا تھا کہ تم میری ذرا بھی قدر نہیں کرتے۔“

ملکوں کے درمیان کسی قسم کا مواصلاتی رابطہ نہیں ہے۔ لندن میں ہمارے ملٹری اتارچی نے ان نمبروں پر بات کرنے کے بعد یہ تصدیق کی ہے۔ صرف ان نمبروں کی وجہ سے بات آگے بڑھی ہے۔ رات تک کوئی نہ کوئی بڑا فیصلہ سامنے آجائے گا۔“

”یہ فیصلہ کون کرے گا؟“ میں نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔

”یہ سوال نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ انتظامیہ کے ذریعے رستم سے پنڈت منوہر لال کے بارے میں بات کی گئی تھی۔ اس نے پنڈت کے ٹھکانے سے مکمل لاعلمی ظاہر کی ہے۔“

”اگر وہ بھیرا میں ہے تو اب وہ اسے وہاں سے نکال دے گا۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”ناممکن!“ اول خان کالج پر یقین تھا۔ ”بھیرا سے نکلنے کے چار راستے ہیں اور اس وقت چاروں کی کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جا رہا۔ پنڈت کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہاں بڑا تصادم شروع ہو جائے گا۔“

”نکلنے والوں سے پوچھ گچھ نہیں ہو رہی تو اسے چھپا کر لے جایا جاسکتا ہے۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ رستم کی بے خبری میں گلیوں تک کی ناکابندی کی جا چکی ہے۔ عارضی چوکیوں پر بھیرا سے نکلنے والی ہر گاڑی کی تلاشی لی جا رہی ہے۔“

میرے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اول خان کی کوششوں سے نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اضطرابی انداز میں نئی سگریٹ سلگانے کے بعد پوچھا ”رات تک کیا فیصلہ ہونے کی امید ہے۔“

”رستم کو پنڈت کے بارے میں رات کے بارہ بجے تک مزید دیکھ بھال کا وقت دیا گیا ہے۔ وہ مکمل تباہی سے بچنا چاہتا ہے تو اسے زبان کھولنی پڑے گی ورنہ بکتر بند گاڑیاں بھیرا کے چاروں پھانک توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گی۔ پاکستان کی سرزمین پر مוסاد کے کسی کارندے کو پھنسنے کی سہلت نہیں دی جائے گی۔“

میرا ذہن اس منظر کی تائید کے تصور میں ڈوب گیا۔ اول خان، میری ذہنی محویت سے بے خبر، اپنی بھاگ دوڑ کی تفصیلات سن رہا تھا۔

ہے مگر میں نے اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بس میرے دل میں اپنی عزت کا احساس جاگ اٹھا ہے۔ تم دنیا کے اگوتے مرد ہونے میں کوئی بد صورت بڑھاپا دیکھو گی کہ گزروں کا یہ فاصلہ طے کرنے میں کون اور کب پہل کرتا ہے۔“

مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود کا کوئی حصہ اچانک خالی خالی ہو گیا ہو۔ مجھے دیر سے کبھی کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ میں اسے خوش ادا اور خوش گفتار دوست ہی سمجھتا رہا تھا شاید میں نے اس کے بارے میں کبھی اپنا دل ٹٹولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے اچانک فاصلے کا احساس دلا کر مجھے شدید ذہنی جھٹکا دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں جہانگیر پر تاؤ کھا کر رہ گیا جس نے باتوں کی روانی میں بہہ کر دیر اکو میری طرف سے بدگمان کیا تھا۔

دیر ادبوت نہیں تھی۔ جذبوں اور امنگوں میں گندھی ہوئی ایک جوان عورت تھی۔ وہ برسوں سے سب کچھ سستی اور حالات میں مگن رہتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے کبھی خود کو مجھ سے الگ کر کے نہیں سوچا تھا مگر وقت کی بات تھی کہ جہانگیر کے چند غیر محتاط الفاظ نے اس کے دل کے نازک آئینے میں بال ڈال دیا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگائی۔ دیر ابوں کو تر کر کے شوخ اور شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔ پہلے وہ بہت بولتی تھی مگر میں اس کی کسی بات پر دھیان نہیں دیتا تھا۔ اس وقت وہ بالکل خاموش تھی لیکن میں اس خاموشی میں ہزاروں شکووں، شکایتوں اور دعوؤں کی بلند آہنگ صدا میں سن رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میرے اعصاب میں چنگاریاں سی بھرنے لگیں۔

میرے لیے وہاں بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا، اٹھنے میں شکست کا اعتراف نہاں ہوتا۔ اسی عالم میں کھنٹی کی آواز نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں دروازے سے نکل کر گیٹ پر پہنچا تو اول خان لوٹ آیا تھا۔

میں اسے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو دیر اپنے گلاس سمیت غائب تھی۔ شاید اس نے باہر سے اول خان کی آواز سن کر کمرے میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”موساد والے نمبرل ایبب کے ہی ہیں۔“ اول خان نے بیٹھتے ہوئے اعلان کیا۔

”یہ کیسے بتا چلا؟“ میں نے اس بارے میں اپنی ناکام کوششوں کا ذکر کے بغیر سوال کیا۔

”پاکستان، اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے دونوں

افسانیت کے دشمنوں کی اس داستان عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے

ہوں۔“

”میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ کیا یہ پورا معاملہ پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا ہے؟“

”ہم نے انٹیلی جنس یورو سے رابطہ کیا تھا۔ قتل ایبب کے نمبروں کی تصدیق ہوتے ہی وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے اب یہ ان کا ٹھیل ہے وہ اسے مقامی پولیس فورس کے ذریعے ٹھیلنا چاہ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس افسران کو یہ نہ بتایا گیا ہو کہ پنڈت کی بجوری سے کچھ مشتبہ کاغذ برآمد ہوئے ہیں۔“

میں ایک گھبراہٹ سے کہہ دیا ”میں سمجھ رہا تھا کہ تم نے از خود مقامی پولیس سے کام لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ پولیس کے ٹھکے میں رستم کے خاٹے ہمدردیائے جاتے ہیں۔“

اول خان مسکراتے ہوئے بولا ”میں تمہاری انجمن کو سمجھ رہا تھا۔ تم لوگ خاموشی سے موسیٰ کو اٹھالائے تھے۔ شہر کے کسی تھانے میں اس کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی لیکن پولیس شہر میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔۔۔ عوام سے بہت قریب رہ کر کام کرنے والے ہر سرکاری ادارے میں ایسی کالی بھیڑیں موجود ہوتی ہیں۔ ان کے باوجود یہ ادارے اپنی کارگزاری دکھاتے رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آج کی کارروائی اتنی ذمہ داری اور رازداری کے ساتھ کی جائے گی کہ رستم کے کسی ہمدرد کو اپنا کام دکھانے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”رستم میں ذرا بھی عقل ہے تو اب وہ پنڈت کو اپنے گھر سے نکال دے گا۔“ ویرا نے پورے اعتماد سے کہا۔ وہ چند منٹ قبل ہمارے درمیان خاموشی سے آہٹھی تھی۔

”یہ نہ بھولو کہ ہم رستم کو نیست و نابود کرنے نہیں جا رہے۔ ہمارا اصل ٹارگٹ پنڈت منور لال ہے۔“ اول خان نے کہا ”اگر وہ کسی خون خرابے کے بغیر ہمارے ہاتھ آجاتا ہے تو ہمارا کام گزرتا ہے؟“

”یہ تمہاری سوچ ہو سکتی ہے۔ میری نظروں میں تو رستم بھی خطرناک بھجور ہے۔ پنڈت کے ساتھ اس کا صفایا ہوتا بھی بہت ضروری ہے۔“ ویرا نے جواب دیا ”وہ اپنے کاموں میں بہت ماہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈت کو کسی ایسی ترکیب سے باہر نکال دے کہ پولیس والوں کو ہوا بھی نہ لگ سکے۔“

”اس امکان کی حتی المقدور پیش بندی کر لی گئی ہے۔“ اول خان نے محل سے کام لیتے ہوئے اسے سمجھایا ”میرا سے آنے والے ہر راستے پر پولیس کی چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں جو ادھر سے آنے والی گاڑیوں کی تلاشی لے رہی ہیں۔ شہر کے بہت سے علاقوں میں عام طور سے ایسی کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ رستم کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اسے علم ہو بھی جاتا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ پنڈت کو غائب کرنے کا ارادہ ملتوی کر دے گا۔“

وہ دونوں اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ویرا پورے

”رستم سے پنڈت کے بارے میں کون پوچھ کچھ کر رہا ہے؟“

اول خان کے خاموش ہونے پر میں نے چرخیال لیجے میں سوال کیا۔

”اس سے کوئی پوچھ کچھ نہیں ہو رہی۔“ اول خان نے دو ٹوک لیجے میں کہا ”کراچی کے ڈی آئی جی نے فون پر اس سے بات کی تھی۔ رستم نے کورا سا جواب دے دیا کہ وہ پنڈت منور لال کے ٹھکانے سے بالکل لاعلم ہے۔ ڈی آئی جی نے اس پر واضح کر دیا ہے کہ وہ رات کے بارہ بجے تک منور لال سے رابطہ کر کے انتظامیہ کو مطلع کرے ورنہ شہر کی ہر اس عمارت کی تلاشی لی جائے گی جہاں پنڈت منور لال کے روپوش ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اب صرف بارہ بجے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔“

”یہ کھلی دھمکی اسے بہت گراں گزری ہوگی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس نے تملنا کوروا ہی آئی جی سے شکایت کی تھی اور یہ کہا کہ وہ کسی بھی وردی والے کو اپنی رہائش گاہ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دے گا۔ ڈی آئی جی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس کی نوبت نہ آنے دے۔ اگر پنڈت منور لال ڈیڈ لائن گزرنے سے پہلے خود کو انتظامیہ کے حوالے کر دے تو ترمذ کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ وقت گزر گیا تو قانون کے مطابق قدم اٹھایا جائے گا۔“

رستم سے فون پر ہونے والی وہ گفتگو اتنی سیدھی اور آسان نہیں رہی ہوگی۔ اول خان مجھے اس گفتگو کے اہم نکات ہی بتا سکتا تھا۔ باقی تکنیکوں کا اندازہ میں نے خود لگایا تھا مگر اس ہندوستان میں پولیس کی شمولیت میرے ذہن میں شہادت پیدا کر رہی تھی۔

”کیا یہ پورا آپریشن پولیس ہی کے ذریعے پایہ تکمیل کو پہنچے گا؟“

”انتظامی سطح پر یہ کام پولیس ہی کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ پولیس کی وجہ سے رستم کو معاملے کی اہمیت اور سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکے گا۔۔۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”اس وقت ساری اہمیت پنڈت کی ہے۔ میری طرف سے دھمکیوں کے بعد پولیس کے عزائم اس کے سامنے آئے ہیں۔ اس گفتگو کے ذریعے اسے بتا دیا گیا ہے کہ بارہ بجے کے بعد پولیس بیرا پر دھاوا بول دے گی۔“

”ڈی آئی جی کے پیغام میں یہ مفہوم پنہاں تھا مگر آئی جی نے بہت نرمی اور مصلحت سے کام لیتے ہوئے رستم کو تسلی دی ہے۔ قانونی مجبوریوں کا ذکر کرنے کے ساتھ اس سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جب پنڈت منور لال بیرا میں نہیں ہے تو اسے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اس نے یہ بھی جاننا چاہا ہو گا کہ پنڈت کس جرم میں پولیس کو مطلوب ہے؟“

”ہو سکتا ہے کہ ایسی بات ہوئی ہو مگر میں اس سے لاعلم

”ایک ڈینی اور دوسری میں۔“ ویرا نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔

”میں کہاں جاؤں گا؟“ اول خان نے پوچھا ”پنڈت منوہر لال کا کیس میں نے ریفر کیا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے ایک آدمی کے ساتھ آپریشن میں شامل ہونے کی باضابطہ دعوت دی ہے۔“ ویرا کا منہ لٹک گیا ”ظاہر ہے کہ تمہارا آدمی ڈینی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔“

”تم خود اپنی سمجھ دار ہو کہ تم نے اپنے نام سے پہلے ڈینی کا نام لیا تھا۔“ اول خان بولا۔

”تم دونوں کو جانا ہے تو تم ہی سرکھپاؤ میں کیوں اپنا دماغ خالی کروں۔“ وہ اٹھ کر چل دی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ پینے کی مزید طلب محسوس کر رہی تھی۔

”ان کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے لیکن میں دانستہ طور پر ویرا کو ان کی نظروں سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔“ ویرا کے چلے جانے کے چند لمحے بعد اول خان نے بتایا۔

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”کیا ان سے ویرا کو کوئی خطرہ ہے؟“

”میری اور ایس ٹی ایف کی ترجیحات ہمارے خفیہ اداروں سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں پھر بھی میں ویرا کو غیر ضروری طور پر منظر عام پر لانا نہیں چاہتا۔ امریکی آج بھی اسے پکڑنے کے خواہاں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آج کے آپریشن میں کسی سفید فام خاتون کی شمولیت کی کوئی خبر پناکی جائے۔“

اس بار میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اول خان روانگی کے لیے اٹھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں گھر میں ایک مرتبہ پھر ویرا کے ساتھ تنہا تھا مگر غیبت یہ تھا کہ وہ اپنی خواب گاہیں محدود تھیں ورنہ اس کی طرف سے فاصلے کے چنچلنے کے بعد میرے لیے اس کا سامنا کرنا خاصا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے وہ کہہنا ٹکیر پر غصہ آ رہا تھا جس نے ویرا کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے بے ضرر سے شوق کو پورا کرنے کے لیے میرے بارے میں پتہ لایا باتیں بھی کہہ ڈالی تھیں جو ویرا کے دل میں نقش ہو گئی تھیں۔

ویرا جب بلیک کونٹن ہوا کرتی تھی تو میں نے اسے ہمیشہ سر تا پا سیاہ لباس میں دیکھا تھا۔ اس کے رنگ و روپ کے بارے میں بس سوچا ہی جا سکتا تھا۔ اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا مگر وہ ہمیشہ مجھے دہمکتی رہتی تھی اور اسی دور میں مجھ پر یوں مہربان ہوئی کہ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔

برسوں کی رفاقت میں وہ بار بار مجھ سے ناراض بھی رہی تھی مگر مصالحت اور رکھیدگی کے کسی بھی دور میں، میں نے اسے اپنی دسترس سے باہر نہیں پایا تھا۔ وہ روٹھی ہوئی تھی تب بھی مجھ سے قریب ہونے کے لیے ہمارے ڈھونڈتی رہتی تھی۔

خلوص کے ساتھ یہ چاہتی تھی کہ پنڈت کے ساتھ ہی رستم کو بھی کیفر کردار تک پہنچانا ضروری ہے دوسری طرف اول خان رستم کے بارے میں قدرے پلک کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رستم نے اور ان ڈی ہنٹ کو نئی دہلی میں موت کے گھاٹ اتار کر ہم لوگوں پر احسان کیا تھا جس کے صلے میں وہ تھوڑی سی مہلت کا حق دار ہو چکا تھا۔

میں خود بھی رستم کے اس کارنامے سے مرعوب تھا لیکن اس کا اعمال نامہ اس قدر سیاہ تھا کہ آخر کار اسے بھی جہنم واصل ہونا تھا۔ ہم اس سے ایک بڑا کام لے چکے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ محاذ آرائی کا آغاز ہونے کے بعد وہ ہمارے لیے ایسا ہی کوئی دوسرا اہم کام سرا انجام دے سکے۔

”وہ خود پنڈت کو پولیس کے حوالے کرے گا نہ اسے بیرا سے نکالنے کا خطرہ مول لے گا۔“ میں نے ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا ”اس سے تصادم ناگزیر نظر آ رہا ہے۔“

”میں تو یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہوں کہ اسے اتنا وقت کیوں دیا گیا ہے۔“ ویرا نے اعتراض کیا ”وہ کوئی امن پسند اور معزز شہری نہیں ہے جسے ڈھیل دی جائے۔ جو کچھ کرتا ہے، ابھی اور اسی وقت ہونا چاہیے۔“

”اسے کوئی ڈھیل نہیں دی جا رہی۔“ اول خان نے فوراً ہی وضاحت کی ”اسے بتا دیا گیا ہے کہ پنڈت منوہر لال کے سلسلے میں اس پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ وہ ہمارے جال میں ہے۔ جتنی اچھل کود کرے گا، جال میں مزید پھنستا ہی چلا جائے گا۔ اس کا نمک کھانکر اپنے فرائض سے غدار کی کرنے والوں کو اس سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔ بظاہر کوئی بھی اس کا بی خواہ اور دوست نظر نہیں آ رہا۔“

”پھر رات کے بارہ بجے تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی کیا تک ہے؟“

”یہ ہماری مجبوری ہے۔“ اول خان نے اس بارے میں پہلی مرتبہ زبان کھولی ”آئی بی کے بعض افسران رات کو دس بجے والی فلائٹ سے کراچی آ رہے ہیں۔ وہی اس آپریشن کی نگرانی کریں گے۔“

”پھر تو یہ پولیس آپریشن نہ ہوا۔“ ویرا ایسے ساختہ بول پڑی ”میں ابھی تک یہ بات ہضم نہیں کر پائی تھی کہ اتنے اہم معاملے کو محض شہری پولیس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔“

اول خان ہنس پڑا ”ٹیکنیکی طور پر یہ پولیس آپریشن ہی کھلائے گا مگر اس کی نگرانی آئی بی والے کریں گے۔ ان کے سوا کسی کو یہ علم نہیں ہے کہ پنڈت منوہر لال کو کیوں تلاش کیا جا رہا ہے۔“

”ایسی صورت میں ہم لوگ بھی کارروائی میں شریک ہو سکیں گے؟“ ویرا نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

اول خان نے اپنے سر کو ٹپٹی میں جھش دیتے ہوئے کہا ”سب لوگ نہیں، صرف دو افراد شریک ہو سکیں گے۔“

تفتیش کرلو۔“

اس کی رکتی ہوئی ہنسی پھر تیز ہو گئی ”یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ مر کر بھی میرے سامنے آپ کی شکایت نہیں کرے گی۔“

”ہر وقت میرے خلاف زہرا لگتی رہتی ہے، بات بات پر بحث کرتی ہے اور تمہیں خوش قسمتی ہے کہ وہ میری شکایت نہیں کرے گی۔“ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”مذاق کی بات اور ہے۔ میں مانتی ہوں کہ مذاق مذاق میں وہ آپ سے بہت زیادہ الجھتی ہے۔ اس بہانے سے اسے آپ سے زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ سنجیدگی سے وہ میرے سامنے آپ کے خلاف زبان نہیں کھولے گی۔“

”آخر تم کتنا کیا چاہ رہی ہو؟“ میں نے حیرت اور قدرے غصے سے پوچھا۔

”مجھے گھر سے نکلنے ہی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا۔“ اس نے مسہری چھوڑ کر تالین پر ٹپکتے ہوئے، دھیمی آواز میں کہا ”میں اسے بھی اپنے ساتھ لے جاتی تو شاید کسی بد مزگی کی نوبت نہ آتی۔“

اس کی قیاس آرائی نے مجھے حیران کر دیا مگر میں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے تیزی سے پوچھا ”سہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو؟ محل کر کو کہ تمہارے ذہن میں کیا اندیشے پروان چڑھ رہے ہیں۔“

ٹپکتے ٹپکتے وہ تیزی سے پٹی اور میرے قریب بیٹھ کر سر دنگی کے انداز میں اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا ”میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ بات بس اتنی سی ہے کہ میں بھی دیر کی طرح ایک عورت ہوں اور اس کے ذہن کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیتی ہوں۔۔۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ آپ کے بارے میں سوچ یا بول رہی ہوتی ہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔“

وہ ایسے دالمانہ انداز میں میرے بدن سے چپک کر بیٹھی تھی کہ میرے ذہن پر چھانے والا چڑچڑاہن فوراً کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ، میرے دل میں غزالہ کے لیے زری اور ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھے اور میں نے ہولے ہولے اس کا سر سلٹانا شروع کر دیا۔

”غلطی میری تھی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں دھیرے دھیرے بولے جاری تھی ”جہاں انگارے دھک رہے ہوں وہاں تیل نہیں ڈالا جاتا۔ وہ تمنا کی بلکہ اکیلے پن کا شکار ہے۔ مجھے اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہیے تھا۔ آپ کو تمنا یا ک شاید اس نے کسی امتحان میں ڈال دیا ہو گا۔ آپ کے حوصلہ شکن رد عمل نے اسے مایوس کر دیا۔ اس طرح ٹھکرانے جانے پر ہر شخص اپنی نظروں میں گر جاتا ہے۔ اب وہ ہم سب سے ناراض اور منہ چھپائے اپنے کمرے میں کھسی بیٹھی ہے۔۔۔۔“

جب تک وہ بات پوری نہ ہوئی، میں نے غزالہ کی بات کاٹنے کی کوشش نہیں کی لیکن کام کا منٹن پورا ہوتے ہی میں نے اسے

اس نے از خود دوستی کی ابتدا کر کے مجھے کبھی اپنے دل کو ٹٹولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ آسانی سے ہاتھ آجانے والی کسی بھی شے کی طرح شاید میں کبھی اس کی قدر نہ کر سکا لیکن جھانگیر کے چند فقروں نے اس کے وجود میں اتنی چنگاریاں ساگرا کر میرے لیے ایک امتحان پیدا کر دیا تھا۔

غزالہ اور سلطان شاہ کی واپسی تک ویرا دوبارہ میرے سامنے نہیں آئی۔ اپنے کمرے میں کھسی رہی۔

وہ دونوں خاصے سامان سے لدے پھندے گھر آئے۔ ان کی غیر حاضری میں حالات میں نمایاں تبدیلیاں آئی تھیں۔ انہیں خوشی ہوئی کہ امید افزا پیش رفت کے نتیجے میں رات ڈھلتے تک بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

غزالہ نے آتے ہی متحس ننگا ہوں سے رادھارادھ کا جائزہ لیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی بے چین نگاہیں ویرا کو تلاش کر رہی تھیں مگر میں نے از خود کوئی بات نہیں کہی۔ ان دونوں کی آوازیں سن کر بھی ویرا اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی۔

”فٹنگو کے اختتام پر میں اپنے کمرے میں گیا تو غزالہ بھی میرے پیچھے پیچھے اندر پہنچ گئی۔“

”کیا ویرا اسے آپ کا کوئی جھگڑا ہوا ہے؟“ تخیلے میں پہنچتے ہی اس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے مزکر حیرت سے اس کی چپکتی ہوئی آنکھوں میں بھانکا اور اپنے سر کو ٹٹی میں جھنڈ دیتے ہوئے پوچھا ”تمہیں یہ خیال کیوں ہوا؟“

”گھر میں غیر فطری سی خاموشی ہے۔ میرے حساب سے ویرا کو آپ کے آس پاس ہی موجود ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے کسی طنز کے بغیر سادگی سے کہا۔

”ہر وقت ایسا نہیں ہوتا۔“ میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا ”وہ اپنے موڈ کی مالک ہے۔“

وہ میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ ہی بستر پر بیٹھ گئی اور مٹھاس سے بولی ”میں اس کے موڈ کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ آپ نے یقیناً اس کے ساتھ زیادتی کی ہوگی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے لیے وہ بہت فراق دلی کا مظاہرہ کرتی ہے اور آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانتی۔ اگر وہ آپ سے ناراض ہو کر اپنے کمرے میں کھسی ہوئی تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہو گا۔“

”بھی تم کو اس سے سنگین شکایتیں پیدا ہونے لگتی ہیں، کبھی اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔“ میں نے چڑ کر کہا ”ایسا ہی شبہ ہو رہا ہے تو جا کر خود اس سے پوچھ لو۔“

وہ دلاؤیز انداز میں اٹھلا کر ہنس پڑی ”اگر جھگڑا نہیں ہوا تو آپ میرے سوال پر چڑکیوں رہے ہیں؟“

”میں ہرگز نہیں چڑ رہا۔“ میں نے اپنی جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا ”میں تو تمہیں دعوت دے رہا ہوں کہ جا کر خود اسی سے

”یہ موضوع بہت پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے۔“ میں نے چپچپے ہوئے لہجے میں کہا ”اگر اب نغزوں پر غور و فکر کرنے کا کوئی ارادہ ہو تو غزالہ سے رجوع کر لیتا۔ تمہیں خاصا اتفاق ہوگا۔“

سلطان شاہ نے برا سامنہ بنالیا ”ویرا کی فکر میں، میں کون سا بیمار ہو گیا ہوں جو مجھے اتفاق ہوگا۔ اس کی ساری فکریں تم ہی کو مبارک ہوں۔“

وہ کھسیا کر لا جواب ہو گیا تھا۔ میں نے اس پر مزید کوئی فقرہ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اول خان نے رخصت ہوتے وقت یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کب واپس لوٹے گا اور میں آپریشن میں اس کے ساتھ کیسے شریک ہو سکوں گا۔ رات اتر آئی، کھانے کا وقت ہو گیا مگر اس کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملی تو میں نے اسٹیشن فور فون کیا۔ وہ اپنے دفتر میں موجود نہیں تھا۔

اس کی مصروفیات کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنا بے سود تھا۔ اپنے پچھلے تجربے کی بنا پر مجھے معلوم تھا کہ جب تک اول خان میرے لیے کوئی خاص پیغام نہ چھوڑے، اس کے آدمی اس کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کرتے ہیں۔ دفتر میں اول خان تھا اور نہ اس کا کوئی پیغام۔

میرے لیے وہ انتظار بہت صبر آزما تھا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ اندیشہ سرا ہمارا رہا تھا کہ کہیں اول خان کسی گورکھ دھندے میں پھنس کر مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا پروگرام ہی منسوخ نہ کر دے۔ اسے کوئی بھی ناگزیر مجبوری پیش آسکتی تھی۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس آپریشن میں اسٹیشن نمائک فورس کا کوئی فعال کردار نہیں تھا۔ آئی بی والوں کی نگرانی میں سارے مراحل مقامی پولیس کو طے کرنے تھے۔ یہ امکان بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ لوگ اپنی حکمت عملی میں کوئی تبدیلی نہ کر لیں۔

میرے ذہن میں اندیشوں اور وسوسوں کے وہ ہمارا بھانک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے کہ معاً مجھے یہ یاد آیا کہ انٹیلیجنس بیورو والے پوری کارروائی کے نگران تھے۔ انہیں دس بیگے والی پرواز سے کراچی پہنچنا تھا۔ ان کی آمد سے پہلے پروگرام میں کمی ردوبدل کی گنجائش نہیں تھی۔

وال کلاک کی سوئیاں دس سے آگے بڑھ چکی تھیں۔ دروازے میں تاخیر نہ ہونے کی صورت میں آئی بی والوں کو اتر پورٹ پر پہنچا دونا چاہیے تھا۔

گیمارہ بجے سے زرا پہلے اول خان آ پہنچا۔ تھکن کے باوجود بہت پر جوش نظر آ رہا تھا اور جگمگاتے ہوئے تھا۔

”ذہنی شام سے تمہارے انتظار میں پریشان ہو رہا ہے۔“ سلطان شاہ نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کر ڈالا ”دیر ہو رہی تھی تو کہیں سے فون ہی کر دیتے۔“

اول خان نے خفگی سے اسے گھورا اور اپنے لہجے پر قابو پا کر

خاموش کر دیا ”اس کے بارے میں اتنا نہ سوچا کرو۔ یہ بھی ویرا کا ایک دیرینہ مرض ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کے ارد گرد جو لوگ موجود ہوں وہ ہمیشہ اسی کے بارے میں سوچتے رہیں۔ تمہیں تشویش میں مبتلا دیکھ کر اسے ذہنی راحت ملے گی۔“

میں نے غزالہ کی مفروضہ کہانی کی تردید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ موضوع جاری رہتا تو بات سے بات نکلتی رہتی اور مجھ سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہو ہی جاتی۔

سلطان شاہ مرد تھا۔ وہ ویرا کی غیر موجودگی کے بارے میں ذرا بھی فکر مند نہیں ہوا تھا لیکن غزالہ کی پھٹی جس نے اسے گڑبڑ کی خبر دے دی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ گڑبڑ کے بارے میں اس کا اندازہ سرا سر غلط تھا۔ اس روز ویرا نے میرے ذہن میں در آنے والے اندیشوں کے بالکل برعکس، یکایک ہی گریز کا رویہ اپنایا تھا۔ وہ اپنی فطرت میں بہت عجیب عورت تھی اور مجھے اکثر یہ ان کرتی رہتی تھی۔

ایک چھت کے پینچہ رہ کر ہم دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں سے زیادہ دیر تک او جھل نہیں رہ سکتے تھے۔ بعد میں اس سے سامنا ہوا تو دوسروں کے لیے اس کا رویہ بالکل نارمل تھا وہ مجھ سے ہنس بول بھی رہی تھی مگر اس کے لب و لہجے میں مجھے لاطعلقی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ابتدا میں ویرا کا بیگانگی کا وہ رویہ مجھے بہت تکلیف دہ محسوس ہوا مگر پھر میں نے اس تبدیلی کو قبول کر کے خود بھی ذرا سا بے رحمانہ جوالی لہجہ اپنایا۔

ویرا نے اس روز دن کے اجالے میں ہی خاصی سہ نوشی کر ڈالی تھی جس کا گہرا سرور اس کی آنکھوں میں تیرنے والے سرخ ڈوروں سے جھلک رہا تھا۔ زبان بوجھل تھی اور الفاظ کا توازن قدرے بگڑا ہوا تھا۔ اس نے بچن میں غزالہ کی مدد سے اپنی عکس پر ہی کا اہتمام کیا اور پھر سرشام ہی سوجانے کے ارادے سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سلطان شاہ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر اسے دیکھتا رہا۔

”آج میم صاحبہ کے تیر کچھ بگڑے بگڑے نظر آ رہے ہیں۔“ ویرا کی خواب گاہ کا دروازہ بند ہونے کے بعد سلطان شاہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

سلطان شاہ کا وہ ذوق معنی سوال سن کر غزالہ کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے سلطان شاہ کے چہرے پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا ”متم نہایت گامگاہ شخص ہو۔ اتنی واضح بات کئی گھنٹوں کے بعد تمہاری سمجھ میں آئی ہے۔“

اس نے بوکھلا کر غزالہ کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب رو مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔

”دو... دراصل میں زنانہ نغزوں پر زیادہ غور تمہیں کرتا۔“ اس نے مدافعت کرنے کی کوشش کی ”غزالہ عورت ہے۔ اس نے ضرور کوئی اندازہ لگالیا ہوگا۔“

جواب دیا ”میں کہیں بیٹھا گپ شپ نہیں لڑا رہا تھا“ کاموں میں مصروف تھا۔ ذہنی کو معلوم تھا کہ دس بجے بیرون شہر سے کچھ مہمان آئے تھے۔ ان کی بریفنگ کیے بغیر میں ادھر نہیں آ سکتا تھا۔“
اول خان کا پیش کیا ہوا وہ اکلوتا جواز ہی ہر شکایت کا مسکت جواب تھا۔ میں نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

”وقت کم رہ گیا ہے۔“ اس نے اضطراری انداز میں اپنی رست واپس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ”ہمیں آپریشن کے آغاز سے پہلے بھرا کا بیرونی طواف بھی کرنا ہے۔۔۔“
”کیا ایک پیالی چائے پینے کا وقت بھی نہیں ہے؟“ غزالہ نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

اول خان لمحہ بھر کے لیے متردد نظر آیا پھر صوفے کے کنارے پر گئے ہوئے بولا ”جلدی سے لے آؤ۔ اس وقت چائے کی طلب بھی محسوس ہو رہی ہے۔“

غزالہ لپک کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ میں موقع غنیمت جان کر خواب گاہ میں جا گھسا۔

میں نے بہت تیزی سے کپڑے تبدیل کیے جو تپنے اور نیم گن جیب میں ڈال کر واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو غزالہ چائے لائچل تھی۔

”خوب!“ اول خان نے اپنی پیالی سے ایک گھونٹ لے کر تو صوفی لیجے میں کہا ”چائے کے بہانے تمہیں لباس بدلنے کا موقع مل گیا۔ میں صبح سے ان ہی کپڑوں میں بندھا ہوا ہوں۔“

”میں نے صرف نیم گن لی ہے۔۔۔“ میں نے اسے بتانا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

”کافی ہے۔۔۔ ویسے اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تیاریاں کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہیں۔“

چند منٹ میں چائے کی پیالیاں خالی کر کے ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر اول خان کی جیب میں موجود بھی جس میں ڈرائیور نہیں تھا۔

”کیا بات ہے اس وقت ویرا نظر نہیں آئی۔“ اول خان نے جیب کا انجی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی غیر حاضری ہر ایک محسوس کر لیتا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا ”آج اس کی طبیعت نامسا ز ہے۔“

”وہ تو ہوتی ہی تھی۔ میں اسے ساتھ لے جانے کا وعدہ کر لیتا تو وہ ہشاش بشاش رہتی۔“

”مزے صاف ہیں۔ ہم ذرا سی دیر میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ یہ تاؤ کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ ہم آہزور کے طور پر جا رہے ہیں۔ میری جیب پر ایک ششختی اسٹیکر موجود ہے۔ کوئی بھی ہماری نقل و حرکت میں مداخلت نہیں ہوگا۔“

”پھر بھیرا کا طواف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بھیرا کے چار بھانگ ہیں۔ ان میں سے دو چھوٹے اور عملاً متروک ہیں مین گیٹ رستم کے دوستوں اور ملاقاتیوں کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بہت پر شکوہ ہے۔ شاید تم اسی راستے سے وہاں آتے جاتے رہے ہو۔ چوتھا راستہ رابٹھی عمارات سے قریب ہے۔ گھر والے اور ملازمین اسی طرف سے آتے جاتے ہیں۔“

”تم نے وہ عمارت دیکھے بغیر بہت کچھ معلوم کر لیا۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”اہل خانہ کے استعمال میں رہنے والا راستہ بھی بہت کشادہ ہے اور گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پولیس فورس کی زیادہ توجہ ان ہی دو راستوں پر مرکوز رہے گی۔ اندر سے مزاحمت کی گئی تو ان بھانگوں کو توڑ دیا جائے گا۔“

”وہ متروک راستوں سے بھی فرار ہو سکتا ہے۔“ میں نے شبہ ظاہر کیا۔

”ادھر بھی نفری موجود رہے گی۔“ اس نے یقین دلایا ”آپریشن کو پوری طرح فول پروف بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف ایسے کوئی آثار نہیں ہیں کہ رستم نے بھاگ نکلنے کا کوئی منصوبہ بنایا ہو۔ گاڑیوں کی تلاشی کا سلسلہ جاری ہے۔ بھیرا سے کسی غیر معمولی نقل و حرکت کی خبر نہیں ملی ہے۔“

”اگر وہ مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے تو اسے کسی غیر معمولی نقل و حرکت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر میں محصور ہو کر کافی دیر تک فورس کو دور رہنے پر مجبور کر سکے گا۔“

”آج رات مجھے ویرا کی خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔“ اول خان کو جیب چلاتے چلاتے ایک مرتبہ پھر ویرا یاد آ گئی۔

”وہ تو خواہشوں اور ارادوں کی شہزادی ہے۔ تم اس کی کس خواہش کا ذکر کر رہے ہو؟“

”پنڈت منوہر لال کے ساتھ رستم کی سزا پالی۔ آج وہ بری طرح مار کھائے گا۔“

”مجھے رستم کی اتنی زیادہ پروا نہیں۔ وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس پر کسی بھی وقت ہاتھ ڈالا جاسکتا تھا۔ میری بس ایک ہی آرزو ہے کہ اتنی بڑی کارروائی کو ناکام نہیں ہونا چاہیے۔ پنڈت منوہر لال اسی عمارت سے ہاتھ آنا چاہیے۔“

”یہ خیال تم نے پیش کیا تھا۔ اس کے ملنے یا نہ ملنے کا انحصار ہم سب کی قسمتوں پر ہے لیکن اتنا ضرور بتا دوں کہ رستم کے اطمینان نے مجھے دوسو سے زائد دیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ رستم کی اتنا کوپاش پاش کرنے کے بعد ہم پنڈت کی گرد بھی نہ پا سکیں۔“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ دل ہی دل میں اول خان کے اس اندیشے کے غلط ثابت ہونے کی دعا مانگتا رہا۔ میں نے رستم

سے گفتگو کے بعد جو رائے قائم کی تھی وہ پوری ایمان داری کے ساتھ سب کے سامنے پیش کر دی تھی۔ میرے نزدیک یہ بات ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی کہ رستم پنڈت کا پشت پناہ تھا اور اس کے مسائل سے پوری طرح باخبر تھا۔

ڈرائیونگ کے دوران میں اول خان بار بار اپنی رست و راچ پر نگاہ ڈالتا آیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جلد از جلد رستم کی رہائش گاہ تک پہنچنے کی فکر میں ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اول خان نے بار بار گھڑی دیکھنے کے باوجود جیب کی رفتار تیز نہیں کی تو میں اس سے سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”ڈیلیں بورڈ کا نچلا خانہ کھول کر اپریش نکال لو۔“ اس نے مشورہ دیا ”اسے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے آن کرنا ہے۔ آج کے آپریشن میں حصہ لینے والے تمام بوٹ ایسے ہی انسپریٹر ز پر ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔“

میرے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنے سامنے والا خانہ کھول کر ممبرل فون سے قدرے بڑا اپریش نکال لیا اور کہا ”میرے ذہن میں ایک بے نام سی خلیش تھی۔ اپریش دیکھتے ہی مجھے اس خلیش کا سبب معلوم ہو گیا ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمارا رابطہ ضروری تھا۔ اس کے بغیر ہم کسی کئی ہوئی چنگ کی طرح خطرناک ماحول میں بھٹکتے رہتے۔“

”آج رات کے لیے میرا پاس ورڈ چابی ہے۔ ضرورت پیش آنے پر مجھے الفانائی کسی اتھارٹی سے رابطہ کرنا ہوگا۔“ اس نے ہنس کر تجھے آگاہ کیا۔

اس رات درپیش مہم کے بارے میں بیشتر نکات واضح ہو چکے تھے۔ ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے ہی سیرا کے نواح میں پہنچ گئے۔

ہم جس سڑک پر تھے، اس پر پولیس کی کئی بکتر بند گاڑیاں روٹیاں گل کیے سڑک کے کنارے ٹھہری تھیں۔ اول خان نے کسی پوچھ گچھ کے خیال سے جیب کی رفتار کم کی تھی کہ دیویدیکل آہنی گاڑیوں میں سے ایک ٹالرج چکی۔ تیز روشنی کا ہالہ ہماری آنکھوں کو چکا چوند کرتا ہوا لمحہ بھر کے لیے ونڈا اسکرین کے بائیں سرے پر کارکھور روشنی بند ہو گئی۔

”رکنے کی ضرورت نہیں۔ چلے جاؤ!“ اندھیرے میں ایک بھاری اور تھکسا نہ آواز گونجی۔

اول خان نے فوراً ہی جیب کی رفتار قدرے تیز کر دی۔ اس ڈیلی سڑک پر پیش آنے والے تجربے سے میں نے اندازہ لگالیا کہ سیرا کی طرف جانے والی ہر سڑک اور گلی میں مسلح مشینی دستوں کی بالادستی قائم ہو چکی تھی۔

میں اس سے پہلے بھی اسی راستے سے دو مرتبہ سیرا آچکا تھا اور دونوں بار میرا سفر رات میں ہی ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس رات وہ راستہ زیادہ تاریک تھا۔ رستم کے خلاف ایکشن کی

رازداری کے لیے اسٹریٹ لائٹس روشن نہیں کی گئی تھیں۔ جیب کے ہیڈ لمپس کی روشنی میں رستم کی رہائش گاہ کے احاطے کی تفصیل جیسی دیوار نظر آنے لگی۔ اس کا پچانک بند تھا۔ داہنا موڑ کاٹنے ہوئے ہم دونوں نے ہی محسوس کیا کہ اندر سناٹا تھا۔ کچھ دیر کے لیے گیٹ پر پرنے والی روشنی کو اندر والوں نے معمول کا ایک حصہ سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

بیرا کے احاطے کے ساتھ ساتھ اول خان کی جیب بائیں طرف ایک شگنتہ سڑک پر مڑ گئی۔ چند ثانیوں بعد اس عمارت کا ایک چھوٹا اور متروک پچانک گزرا۔ جیب بڑھتی رہی۔ اس عمارت نے علاقے کا ایک برا رقبہ گھیرا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف نیم پختہ یا پختہ راستے موجود تھے۔ عقب میں گھریلو استعمال والا راستہ تھا۔ دوسری بلی دیوار میں چھوڑا ویران پچانک بند تھا۔ رستم کی وسیع رہائش گاہ کا طواف کر کے ہم دوبارہ مین گیٹ کے سامنے سے گزرے اور اول خان نے تاریکی میں ایک جگہ جیب روک کر انجین بند کر دیا۔

”بظاہر سب انتظامات مکمل ہیں۔“ اول خان نے اپنی رست و راچ کے روشن ڈائل پر ایک نظر ڈال کر پراطمینان لہجے میں کہا ”لیکن وہ سب اصل ہدف سے دور ہیں۔ عمارت کے آس پاس کسی کاسایہ تک نظر نہیں آ رہا۔“

”اپریش آن ہو تو پتا چلے کہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔“ میں نے پہلا بدل کر کہا۔

”چاہو تو اسے آن کر لو۔ سسٹم ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے کام شروع کرے گا۔ اس ڈیلی لائن میں اب ایک منٹ سے قدرے زیادہ وقت رہ گیا ہے۔“

میں نے اپریش آن کر دیا۔ جیب کے کیبن میں ہلکا ہلکا ریڈیال شور گونجنے لگا۔ اس شور میں کوئی بھی انسانی آواز شامل نہیں تھی۔ ”سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے۔“ میں نے تعریفی لہجے میں کہا ”وقت کی اتنی کڑی پابندی کا تصور عام شہری اداروں میں مفقود ہے۔“

”ہدف اہم ہو تو وقت کی پابندی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مختلف سمتوں سے پیش قدمی کرنے والوں کو اپنی ٹائمنگ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”الفانائک فار میٹنر۔“ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اپریش ایک پر سکون آواز ابھری ”منتظر الفاظ میں نمبر وار ہر مکناڈر ایملی رپورٹ دیتا چلا جائے۔۔۔ اور!“

پہلی رپورٹ لیڈنگ گروپ کی طرف سے تھی۔ باری ہادی مختلف آوازوں نے الفا کو پیغامات دیے۔ وہ اپنی اپنی جگہ بالکل چاہ اور اگلے حکم کے منتظر تھے۔

ایک موڑ سے آگے پیچھے دو تیز رفتار گاڑیاں نمودار ہوئیں۔ ان کی تمام نشانیں آباد تھیں۔ ان کے اگلے پھروں پر وائرلس

اشارت ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”میں نے انفراریڈ دوربین سے سب دیکھ لیا ہے۔“ فضا میں رستم کی مانوس اور نرم آواز گونجی تو میں بری طرح چونک پڑا۔ وہ اپنی آواز پہنچانے کے لیے کوئی طاقت ور میگافون استعمال کر رہا تھا۔ اس کی بات جاری تھی۔ ”میرے گھر کا محاصرہ کیا جا چکا ہے۔۔۔ میں ایک معزز اور شریف شہری ہوں۔ کسی نے بھی یہی چار دیواری کا تقدس پامال کرنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

ہماز حکام کی طرف سے بارہ بجے کا وقت مل جانے کے بعد وہ مسلسل خاموش تھا مگر غافل نہیں تھا۔ شاید اس کے آوی پہلے عام دور میں استعمال کر رہے تھے۔ اسے ذرا تاخیر سے خیال آیا کہ انفراریڈ دوربین اندھیرے کا تو ذکر کرتی ہے۔ اس نے اندھیرے میں پوشیدہ نفی اور گاڑیوں کو دیکھتے ہی اپنے گھر کا مرکزی برقی نظام معطل کر دیا اور مزاحمت کا فیصلہ کر لیا۔

چار میسج بکٹر بند گاڑیاں رستم کے مکان کے مین گیٹ پر پہنچ گئیں ان کے پیچھے دو دو گاڑیاں تھیں جو کچھ دیر قبل پراسرار تیز رفتاری سے متحرک نظر آتی تھیں۔ ان ہی میں سے کسی گاڑی میں الفا اپنی پوری تیاریوں کے ساتھ موجود تھا۔ انسانی مزاحمت کی صورت میں وارننگ دینے کے لیے اس کے پاس بھی میگافون موجود تھا۔ دروازے پر گاڑیاں رکتے ہی الفا کی سواٹ ٹیم آواز ہر طرف پھیلنے لگی۔

”رستم! تمہارے فرار کی ساری راہیں مسدود کی جا چکی ہیں۔ اپنی انفراریڈ دوربین گھما کر خود یہ سب دیکھ لے۔“ اپنی چار دیواری کا تقدس بچانے کے لیے خود کو قانون کے ڈالے کر دو۔۔۔

”میں ہتھیار ڈال دوں!“ رستم کی آواز بند اور استہزائیہ ہو گئی۔ ”اسد ام کا یقین اس کے آہنی اعصاب میں نشتر بن کر اترتا تھا۔ یہ کام میں نے نہیں سیکھا۔ تم جیتے جی مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکو گے۔ مجھے اکیلے آوی کے لیے تم اتنا لشکر لے کر آئے ہو لیکن پھر بھی ناکام رہو گے۔“

اپریس یا میگافون پر الفا کی کوئی آواز نہیں مانی دی۔ بکٹر بند گاڑیوں کے انجنوں کی غراہٹیں تیز ہو گئیں اور لٹاؤنے آہنی پھانک کی جھنجھٹا ہٹ سے لرزا اٹھی۔

پھانک کے دونوں ستون بہت مضبوط تھے مگر اندرونی قابضے اور کھینک اس حملے کی تاب نہ لاسکے۔ لوہے سے لپاٹنے اور پھر لوہا چرنے کی آوازیں بیدار ہوئیں، دونوں پھانک ایک پر شور مچانے کے ساتھ اندر کی طرف کھینک چلے گئے۔ دو بکٹر بند گاڑیاں اچھل کر اس راستے میں داخل ہو گئیں۔

پھانک آخری حد تک کھینک کے بعد تیزی سے واپس ہونے اور پھر گاڑیوں کے اگلے حصے سے ٹکرا کر رک کے بیڈ بکس کی روشنی میں بھرا کی پختہ روش ویران نظر آتی تھا۔ ہڈیاں کوئی بھی مسلح یا غیر مسلح فرد موجود نہیں تھا۔ نہ ہی اندر کے کیوں کی کوئی

انشینا کے اونچے تار لہرا رہے تھے۔ دونوں گاڑیاں اس خم دار سسرک پر آگے جا کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

”نقل و حرکت شروع ہو چکی ہے۔“ میں نے خاموشی سے زبانی کے لیے تبصرہ کیا۔

”بس کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا ہے۔ پنڈت منوہر لال سکھو زندہ ہاتھ آنا چاہیے۔“

”آئے گا۔۔۔ ضرور آئے گا۔“ میں نے اضطراب کے عالم میں ہتھیلیاں ملستے ہوئے کہا ”اپریس پر سنا ہے۔ کیوں نہ تم بھی۔“ الفا کو اپنی موجودگی کی اطلاع دے ڈالو۔“

”نہیں!“ اس نے انکار کر دیا ”مجھے صرف ضرورت پیش آنے پر رابطہ کرنا ہے۔ اس وقت ان کے انتظامات میں ٹانگ اڑانے سے کوئی بد مزگی بھی ہو سکتی ہے۔“

میں نے بد مزگی کے سخت لفظ پر کوئی اعتراض کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میری طرح وہ بھی ذہنی انتشار اور دباؤ میں مبتلا تھا۔ ایسی صورت میں روشن امکانات بھی مخدوش اور متنی فکرسے آئے لگتے ہیں۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ جب میں ہم دونوں ہی خاموش اور اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس دوران میں وقفے وقفے سے اپریس پر بیانات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ جن میں سے بیشتر احکام الفا کی جانب سے تھے یا پھر اس کے آدمی اس کی ہدایت کے مطابق اپنی پوزیشنوں میں ردوبدل کے بارے میں اطلاعات دے رہے تھے۔

بھیرا کے احاطے کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ باہر سے ان کے درمیان بنی ہوئی کوئی ممانعت نظر نہیں آ سکتی تھی لیکن ہمیں رات کی تاریکی میں اس عمارت کی بالائی فضا میں ایک روشن ہالہ نظر آ رہا تھا جس کا سب اندر جگمگانے والی روشنیاں تھیں۔ باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں وہ ان کا کچھ زیادہ ہی نمایاں تھا۔

پھر اچانک فضا میں اندھیرا پھیل گیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ آپریشن کی نگرانی کرنے والوں نے بجلی سپلائی کے تعاون سے بھیرا کی روشن فضاؤں پر وار کیا ہے مگر وہ خیال خاصا کمزور تھا۔ ہر مقابلے میں خود تاریکی کی آڑ لے کر روشنی میں نمائے ہوئے دشمن پر وار کرنا زیادہ سہل اور سودمند ثابت ہوتا ہے۔ وہ لوگ ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے کہ بھیرا میں رہنے والوں کو تاریکی کی پناہ فراہم کرتے۔

مجھے اس بارے میں زیادہ دماغ سوزی نہیں کرنی پڑی۔ لمحہ بھر بعد ہی اپریس پر الفا کی اضطرابی آواز ابھری ”پورا مارگٹ یکایک اندھیرے میں ڈوب گیا ہے۔ شاید دشمن کو شبہ ہو گیا ہے۔۔۔ کاؤنٹ ڈاؤن ختم۔۔۔ اصل پلان کے مطابق سب ایڈوانس کرو۔“

رات کی میٹھی آنکوش میں سویا ہوا ماحول یکایک متعدد انجنوں کے شور سے گونج اٹھا۔ قرب و جوار کی ہر سمت سے گاڑیاں

باڑھ ماری گئی تھی۔

”تم نے میری سلطنت تباہ کر دی، میرا پندارتو ڈیرا۔“ میگا فون پر رستم کی رندھی ہوئی اور کرب آلود آواز ابھری ”آج مجھے بتا چلا کہ اب تک میں اپنی آستین کے سانپوں کو دودھ پلا کر پروان پڑھاتا رہا تھا۔ یہ سب نہ ہوا ہوتا تو بہت اچھا تھا.... ہو گیا ہے تو مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں اپنی گردن تمہارے ہاتھوں میں نہیں دوں گا۔ اسی بے یقینی کے عالم میں مرجانا پسند کروں گا۔“

میگا فون پر ایک فائر کے ساتھ کسی معصوم بچے کی دل دوز چیخ گونجی اور میرا دل اچھل کر حلق میں اٹھیا۔ اس سفاک درندے نے شاید اپنی انا کی جتا پر اپنے لاڈلے نواسے کی پہلی بیہوشی دی تھی۔ اس کا میگا فون آن تھا۔ دوسری گولی چلی اور اس بار رستم کی دہلی دہلی کراہ سے فضا لرزا گئی۔

خودکشی کرتے ہوئے اس انا پرست کو شاید چیخنا پسند نہیں تھا۔ اس نے بہت کامیابی کے ساتھ اپنی چیخ کو آخری کراہ میں سمیٹ دیا تھا۔

جو کچھ ہوا، وہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ ہم دونوں ہی لنگ ہو کر رہ گئے۔

”الفا کالنگ چلائی!“ اپریٹس پر بو جھل اور تھیر زدہ آواز ابھری ”یہ کیا ہوا؟ اس نے تو کوئی مقابلہ کیے بغیر خودکشی کر لی۔ وہ پہلی چیخ کس بچی یا عورت کی تھی....؟ اور اور!“

”شان و شوکت کے ساتھ جینے والے بڑے مجرم شاید اسی طرح مرتے ہیں.... وہ اپنے اکلوتے نواسے کو بہت چاہتا تھا۔ جاتے جاتے شاید اسے بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے اور اور!“ اولیٰ خان، رستم کے اس انجام پر خوش نہیں تھا۔ اس کی آواز افسردہ تھی۔

”رستم نے ہار مان کر خودکشی کر لی ہے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد میگا فون پر الفا کی آواز ابھری ”اندرو کی تمام روشنیاں آن کر دو اور غیر مسلح ہو کر باہر آ جاؤ۔ میں گنتی شروع کر رہا ہوں۔ دس کا ہندسہ پورا ہونے کے بعد کسی کو امان نہیں ملے گی۔“

میں گیٹ پوری طرح کھول دیا گیا۔ وہاں کوئی تنفس نہیں تھا۔ چاروں بکتر بند گاڑیوں کے پیچھے کمان کرنے والی دونوں گاڑیاں بھی احاطے میں صرف اس حد تک اندر داخل ہوئی تھیں کہ پیچھے والی گاڑیاں اندر سما سکیں۔ ان سب کی ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ ان کی روشنی میں کھڑکیوں، اور سوراخوں سے ملک آفتیں ہتھیاروں کی نالیں باہر جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ اولیٰ خان نے اپنی جیب ان کے پیچھے لگا دی۔

الفانے میگا فون پر رک رک کر گنتی شروع کر دی۔ وہ صرف تین تک پہنچا تھا کہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی عمارت یکایک جگمگا اٹھی۔ باغ میں اور روشوں کے اطراف بھی لیپ پوسٹ روشن ہو گئے۔ ان سب کو یقینی طور پر کسی مرکزی سوچ کے ذریعے ہی بند کیا گیا تھا۔

وہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ بئیرا کے باسیوں نے میگا فون پر اپنے کانوں سے اپنے آقا کی آخری کراہ یا پگلی سنی تھی۔ ان کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے۔ رستم نے مایوسی اور بے بسی کے شدید جذبات سے مغلوب ہو کر ایک ایسا قدم اٹھایا تھا جس نے آپریشن فورس کا کام بہت آسان کر دیا تھا۔

گنتی پانچ تک پہنچی تو مختلف ستنوں سے متعدد سادہ پوش اور باوردی ملازمین اپنے ہاتھ سروں سے اوپر اٹھائے نمودار ہونے لگے تھے۔

عارضی طور پر گنتی کا سلسلہ موقوف ہو گیا اور الفا اپریٹس پر آگیا۔ وہ لیڈیز پولیس کی انسپکٹر کو اپنی ففری کے ساتھ بئیرا کے رہائشی حصے میں داخل ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ دوسرے گردو پوں کو مردوں کی تلاش کے ساتھ یہ ہدف بھی دیا گیا تھا کہ جلد از جلد رستم کی لاش تک پہنچ کر رپورٹ کر دیں۔

پانچ کے بعد چھ کی باری آتی دیر میں آئی کہ عمارت اور احاطے کے مختلف حصوں سے نمودار ہونے والوں کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

ان کی تعداد کسی طرح چالیس سے کم نہیں تھی۔ وہ سب مغموم اور نڈر حال نظر آ رہے تھے لیکن ان میں کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جسے رستم کا قریبی عزیز سمجھا جاسکے۔

بکتر بند گاڑیوں سے مسلح افراد نیچے اترے اور انہوں نے ان سب کو چار قطاروں میں صف آرا کر کے ان کی جامہ تلاشی لینی شروع کر دی۔ وہ مرحلہ بہت تیزی سے مکمل ہو گیا۔ اس کارروائی کے بعد اگلی دونوں گاڑیوں سے چار افراد اتر کر قیدیوں کی کھپ کی طرف بڑھے۔

اولیٰ خان نے مجھے اشارہ کر کے جپ چھوڑ دی۔ ہم دونوں کی طرف کئی نگاہیں انھیں مگر کوئی معترض نہیں ہوا۔ ہم تماشہ دیکھنے کے لیے سب سے آخر میں جاکھڑے ہوئے۔

”تم میں رستم کا وارث کون ہے؟“ الفا کو میں نے اس کی آواز سے پہچانا۔ اس نے چند ثانیوں تک صف آرا افراد کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا تھا۔

”اس کی کوئی اولاد حریزہ نہیں تھی۔“ ایک ادھیڑ عمر شخص نے روہاٹی آواز میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ”مردوں میں صرف اس کا نواسہ اس کا وارث تھا جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اب بئیرا میں سرکوت کوٹ کر بین کرنے والی عورتوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

رستم کے عبرت ناک انجام کے بعد وہ کمائی بھی لرزہ خیز تھی۔ وہ جرائم کی دنیا میں لمبے سودے کر کے کس کے لیے خزانہ اکٹھا کر رہا تھا؟

اسے صرف ہوس کا نام دیا جاسکتا تھا۔ اس کے نواسے کے بہتر مستقبل کے لیے بئیرا جیسی عالی شان رہائش گاہ اور رستم کی کمائی کا عشر عشر بھی میری کافی ہو سکتا تھا۔

”پنڈت منوہر لال کے بارے میں تم میں سے کون جانتا ہے؟“
الفا کے ساتھ کھڑے ہوئے شخص نے تھیکے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لکے ہوئے اداس چہرے اس اہم نام پر پیاٹ رہے تھے۔
ایک مرتبہ پھر اپریٹس پر آواز آنے لگی۔ لیڈی پولیس انسپکٹر پر جوش آواز میں بتا رہی تھی ”سرا“ عورتوں کے ایک کمرے کی فہرستی کے نیچے سے ایک سمر اور مٹھنی سا شخص برآمد ہوا ہے جو بہت زیادہ خوف زدہ ہونے کے باوجود زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہے.... اور!“

”زمانہ حصہ فوراً خالی کر دو اور اسے لے کر مین گیٹ کی طرف چلی آؤ۔ اور اینڈ آل۔“ الفا کا وہ فیصلہ بروقت اور صحیح ترین تھا۔
رستم کی پس ماندہ عورتوں سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان کا مٹی اپنے ہاتھوں اپنے برے انجام سے دوچار ہو چکا تھا۔ انہیں اس کی موت کا سوگ منانے کی آزادی ملنی ضروری تھی۔

لیڈی انسپکٹر کے پیغام میں میرے لیے بے پایاں خوشی پناں تھی۔ اس نے زمانہ حصے سے برآمد ہونے والے کا جو حلیہ بتایا تھا وہ پنڈت منوہر لال کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔

دراکی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ پنڈت کی بازیابی کے ساتھ رستم کی گرفتار کو پہنچ چکا تھا۔ مجھے دکھ تھا تو اس معصوم جان کا رستم نے اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ وہ معصوم خوب صورت، سرخ و سفید اور شرارتی پتہ اس وقت رہ رہ کر میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔

رستم کا المیہ یہ تھا کہ اسے اپنے سوا کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ اسے اپنی برتری پر گھمنڈ تھا۔ اسی رو میں برہ کر اس نے میرے ساتھ اور ابراہن ڈی ہنٹ کے قتل کا سودا طے کیا تھا۔ ذاتی معاملات میں بھی اسے دوسروں پر بھروسہ نہیں تھا۔

اسے ڈر تھا کہ اس کی موت کے بعد اس کا چیتا نواسا بھری دنیا میں بالکل اکیلا رہ جائے گا، کوئی اس کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکے گا اور وہ زمانے کی ٹھوکروں میں رہ کر اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ ایسے ہولناک اندیشے تھے کہ اس نے اپنی زندگی سے پہلے اپنے نواسے کی زندگی کا چراغ گل کیا اور خود بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

رستم سے ملاقاتوں میں، میں نے رائے قائم کر لی تھی کہ وہ آسانی سے شکست نہ ماننے والا ایک مضبوط آدمی ہے جس سے ٹکرانے والوں کو دانتوں پینہ آسکتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو حالات کی ذرا سی خرابی کی بنا پر پوس اور دل گرفتہ ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔

اگر اس پر ہلکا ہاتھ ڈالا جاتا تو وہ یقیناً مزاحمت کرتا اور اس

انجام سے دوچار نہ ہوتا جو اس کا مقدر بنا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جیسے بارشوخ شخص کے گھر پر اتنے بڑے پیمانے پر بغاوت کی جائے گی۔ یہ آپریشن فورس کی بھرپور طاقت ہی تھی جس کے مشاہدے نے رستم کا حوصلہ توڑ کر رکھ دیا اور اس نے ذرا سی دیر میں خود ہی اپنے خلاف ایک فیصلہ کر لیا۔

آئی لی اور پولیس افسران ایک جا ہو کر قطار بند ملا زمین کے بارے میں مشورے کر رہے تھے اور میرا ذہن سوچ کی اتھارہ وادوں میں بھٹک رہا تھا کہ سامنے سے مردانہ اور زنانہ پولیس فورس کے جلو میں وہ شخص نظر آیا جس کے لیے وہ سارے باپ بیلے گئے تھے۔ اس کے خضاب میں رنگے ہوئے مخمّر سے سیاہ بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی معلوم ہو رہی تھیں اور

چہرے پر کئی دن کا بے داغ، سفید شیوہ بڑھا ہوا تھا۔

”یہی پنڈت منوہر لال ہے۔“ اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اول خان نے اعلان کر دیا۔ الفا نے پیچھے مڑ کر فضا میں ہاتھ کی جنبش سے اول خان کا شکریہ ادا کیا اور پھرتے والے مسان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ہماری صفوں میں شامل ہر شخص گہمی دلچسپی سے پنڈت کی طرف متوجہ تھا۔

”سنا ہے تم نے اپنی زبان سختی سے بند کی ہوئی ہے۔“ الفا نے پنڈت کے سر پر سختی سے ہاتھ تھاکر جھپٹے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ پنڈت نے الفا کے ہاتھ کی گرفت سے نکل جانے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا تو بھڑکی ہوئی آواز میں ہوا ”میرے ساتھ بد تمیزی مت کرو.... میں اپنے وکیل سے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کہوں گا۔“

”رستم کو بھی یہی گھنڈ تھا جو اسے لے ڈبا۔ زیادہ ضد کرو گے تو تمہاری نہی سی کھوپڑی کو کچے ہوئے خروڑے کی طرح چٹکا دیا جائے گا۔“ الفا نے اس کی چند پراپی انگلیوں کا دباؤ بڑھا دیا۔

”تم سب بہت سفاک ہو۔ رستم ایک ہیرا تھا۔“ اس کی آواز رندہ لگی ”وہ زندہ رہتا تو تم میری بچھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔“

”ہم سب سمیت کوئی بھی ہمیشہ زندہ نہیں رہتا۔ تم نے دیکھ لیا کہ اس کے مرتے ہی تم کتنی آسانی سے تارے ہاتھ آگے۔ اب ذرا اپنی زبان سے اپنا پرانا نام بھی دہراؤ۔“

”میں وکیل سے ملے بغیر ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔“ اس نے رٹا مٹا جملہ دہرایا۔

”اگر تمہارا نام وکیل کو معلوم ہے تو اپنی ولایت ہی بتا دو۔ یہ نہ کہنا کہ اس بارے میں بھی وکیل ہی روشنی ڈال سکے گا۔“ الفا کے ساتھی کے الفاظ میں ڈر گھلا ہوا تھا۔

پنڈت منوہر لال کوئی جواب دے بغیر خالی خالی نظروں سے اس کا منہ لٹکے گا۔

”اسے گاڑی میں ڈال دو۔“ الفانے اپنے آدمیوں سے کہا پھر رستم کے ملازمین کی طرف متوجہ ہو گیا ”تم میں سے کس کس نے اسے یہاں آتے دیکھا تھا؟“

”یہ سیٹھ کا دوست ہے۔ اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔“ رستم کے ادھیڑ عمر اور پرانے خدمت گارے سب کی ترجمانی کا فرض ادا کرتے ہوئے جواب دیا ”میں اندر رہتا ہوں مگر مجھے بھی پتا نہیں کہ یہ یہاں موجود ہے۔“

”کیا رستم نے تم لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ پولیس اسی پنڈت کی تلاش میں یہاں آنے والی ہے؟“ الفانے درشت لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں صاحب!“ وہ روہینے والی آواز میں گڑگڑایا ”سیٹھ آج دس بجے سے پریشان ضرور تھا۔ تین آدمیوں کو دور نہیں دے کر چھت پر بھیجا ہوا تھا۔ اس کے لیے ہم سب پریشان تھے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ سیٹھ کے لیے یہ آخری رات ثابت ہونے والی ہے۔“

”اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا؟“ الفانے بے اعتباری سے پوچھا۔

”دس بجے سے تمام محافظ مسلح اور تیار تھے۔ یہ سیٹھ کا حکم تھا۔“ وہ باقاعدگی سے زار و قطار رونے لگا ”ساڑھے گیارہ بجے وہ اپنی دور بین لے کر چھت پر گیا۔ پتا نہیں اس نے وہاں کیا دیکھا کہ سب کو نیچے بھیج کر اپنے نواسے کو چھت پر بلوایا اور سارے محافظوں کو ہتھیار خالی کر کے اپنے کمروں میں جانے کا حکم دے دیا۔ ہم سب بہت فکر مند تھے۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ میرا کے پھانگ پر دوچار ہتھیار بردار دن رات موجود نہ رہے ہوں۔ آج اس نے تمہارے لیے سارے راستے خالی کر دیے تھے۔“

رستم کے انجام کی کہانی کا ہر باب دل و دوا اور افسوس ناک تھا۔ اس کے باوجود یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ وہ اپنے وقت کا ایک شفاک قاتل اور چالاک مجرم تھا جو مکافات عمل کا شکار ہو کر بہت آسانی سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کے لیے رستم کی لاش کا دیدار ضروری نہیں تھا۔

پنڈت منوہر لال کی گاڑی میں منتقلی کے بعد مشن پورا ہو چکا تھا۔ ملازمین سے مزید باز پرس کے لیے کچھ نفزی کو وہاں چھوڑ کر واپسی کا پروگرام بنے لگا۔ اول خان جیسے ساتھ لے کر خاموشی سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ بیرا نے رخصت ہوتے ہوئے اس نے کسی سے ملاقات نہیں کی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ اس بار ہم صرف ناشائی رہے، کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔“ راستے میں اول خان نے مستاف لہجے میں کہا ”ایک عرصے کے بعد ایسی جے کی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“

میں دھیرے سے ہنس دیا ”یہ بتاؤ کہ آج کس نے کیا کیا ہے۔“

تیاہیاں بہت کچھ تھیں لیکن رستم نے کسی کو کارکردگی دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ پوری بساط خود لپیٹ دی۔“

”یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بس لیڈر پولیس فورس نے زنان خانے سے پنڈت کو برآمد کر کے کام دکھایا ہے۔ پتا نہیں رستم نے اس جیسے رنگین مزاج بڈھے کو اپنی عورتوں کے درمیان رہنے کی اجازت کیسے دے دی۔ اس کے بیویوں سے پورا نہیں تو ادھا شہر ضرور واقف ہے۔“

”وہ گھر کے کسی اور حصے میں روپوش رہا ہو گا۔۔۔ آخری لمحات کی افرا تفری میں اپنے ٹھکانے سے نکل کر عورتوں میں جاگھا ہو گا۔“

”تمہارا نظریہ قرن قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اصل متن تو اسی وقت کھلے گا جب پنڈت اپنے وکیل سے مشورے کے بغیر بولنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔“

”اگر وہ ہماری تحویل میں ہو تو زیادہ آسانی سے کام آگے بڑھ سکے گا۔“

”مجبوری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی وقت فیڈرل کسٹڈی میں چلا جائے۔“

”اس کے تینوں اصل کاناہ کہاں ہیں؟“ میں نے چونک کر دریافت کیا۔

”وہ آگے چلے گئے۔ میرے پاس ان کی فوٹو کاپیاں محفوظ ہیں۔“ اس نے اطمینان دلایا۔

واپسی پر اول خان تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ رکا تاکہ غزالہ کے ہاتھ کی چائے اور دیگر لوازم سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس وقت تک ویرانہ مل ہو چکی تھی اور ڈرائنگ روم میں بیٹی ٹیلی وژن پر وگرام دکھ رہی تھی۔ مجھے نظر انداز کر کے اس نے پسلا سوال اول خان سے کیا۔

”آج کل ستارے ہماری یادری کر رہے ہیں۔“ اول خان نے ہنستے ہوئے جواب دیا ”ب کچھ اسی طرح ہوا ہے جس طرح تم نے آرزو کی تھی۔“

”تو کیا وہ دونوں ہی ہاتھ آگئے۔“ سلطان شاہ نے اپنی جگہ سے اچھل کر پوچھا۔

”ایک ہاتھ آگیا، دوسرا ہاتھ سے نکل گیا۔“ میں نے اول خان سے پہلے سلطان شاہ کو جواب دیا۔

”کون ہاتھ سے نکل گیا۔“ ویرا نے وہ سوال بھی اول خان سے کیا۔ وہ کایاں آ رہی تھا۔ دن میں ویرا کے موڈ کی خرابی کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اس نے بات خوب صورتی سے میری طرف ٹال دی۔

”اپنی باتوں کو ذہنی خودی سمجھا سکتا ہے۔ اسی سے پوچھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔“

”میری آرزو پوری کرنے کی بات تم نے کی تھی۔“ ویرا اسی

کے گلے پڑ گئی۔

”معلوم ہوتا ہے کہ آج ذہنی سے تمہاری بول چال بند ہے اسی لیے میرے سر ہو رہی ہو۔“

”ہاں“ تو تم کیا کہہ رہے تھے۔ ”اول خان کے اٹھائے ہوئے نکتے کی تردید کے لیے ویرا مجھ سے مخاطب ہو گئی۔

”جذبت ہاتھ اٹایا، رستم ضائع ہو گیا۔ اس نے اپنے کم سن نواسے کو قتل کر کے خود کشی کر لی۔“

ویرا کا چوکھل اٹھا ”اس کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ سانپ کا بیٹا سنپولیا ہوتا ہے۔ اس کا نواسا بھی بڑا ہو کر اپنے نانا کے نقش قدم پر چلتا۔ اچھا ہوا کہ آنے والے دنوں کا پاپ ابھی مٹ گیا۔“

”یقین نہیں آ رہا کہ رستم نے اس شریر بچے کو بھی مار دیا ہو گا۔“ سلطان شاہ نے اسے دیکھا ہوا تھا اس لیے وہ ویرا کے جذبات کی تائید نہیں کر سکا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ بچ گیا ہو۔“ اول خان نے پرامیدی کا مظاہرہ کیا ”ہم نے میگانون پر فائر اور چیچی کی آوازیں ضرور سنی تھیں لیکن لاشیں دیکھنے بغیر وہاں سے لوٹ آئے۔“

”وہ رستم کی چلائی ہوئی گولیاں تھیں۔ دونوں میں سے کوئی نہیں بچا ہو گا۔“ میں نے اول خان کی نکتہ آفرینی پر اسے گھورتے ہوئے کہا ”ہنگری ہوئی لاشوں کو دیکھنا کوئی خوش گوار فعل نہیں ہوتا۔“

”صبح کے اخباروں میں سب کچھ سامنے آ جائے گا۔“ ویرا نے بے پروائی سے کہا۔

”سب کچھ بہت تیزی سے رونما ہوا۔ پہلے بات ملک ممتاز اور ملک افضل سے شروع ہوئی تھی پھر انتظامیہ درمیان میں آ گئی اور پولیس ایکشن بھی ہو گیا۔ رستم کو مرتے مرتے یہ گتھی ستاتی رہی ہو گئی۔“ اول خان بولا۔

سوچنے کے لیے وہ بھی ایک نکتہ تھا۔ رستم کے بدحواس اور مایوس ہونے کی متعدد وجوہ میں ایک وجہ وہ بھی ہو سکتی تھی مگر اس پر سرکھانا بے سود تھا۔ سب کچھ بھی رہا ہو، اصل اور اہم ترین بات یہ تھی کہ رستم کے خاتمے کا ہدف حاصل کر لیا گیا تھا۔

چائے نوشی کے دوران میں اول خان کے آپریشن پر اشارہ موصول ہوا اور اس نے ہٹن دیا کہ اسے آن کر دیا۔ اپنی داست میں آپریشن کی تکمیل کا اندازہ لگا کر اس نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا تھا۔

دوسری طرف سے الفاسی کے لیے پیغام نشر کر رہا تھا۔ اول خان نے فوری طور پر اسے لائن پر اپنی موجودگی کی اطلاع دے ڈالی۔

”چارلی! تمہیں وہ تینوں کانفد کس ذریعے سے ملے تھے؟ اور اور! الفاسی نے سوال کیا۔

”میرے معروف دوست کے ذریعے۔“ اول خان نے مہمانانہ

لے بغیر کہا ”میں یہ بات پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اور اور!“

”معلوم کو اسلام آباد منتقل کرنے سے پہلے ہم اس سے جوائنٹ انٹرو گیشن کریں تو بہت سی باتیں واضح ہو کر سامنے آجائیں گی۔ کل تم دونوں دستیاب ہو سکتے ہو؟“

وہ ہم دونوں کے دل کی آواز تھی۔ اول خان نے کال اور اور ہوتے ہی ہم دونوں کی دستیابی کا عندیہ دے دیا۔

”گھڑو! الفاسی نے جواب دیا ”میں کل صبح تمہیں پروگرام سے آگاہ کروں گا۔ اور اور۔“

”میں منتظر رہوں گا۔۔۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بسرا کی چھت سے ملنے والی دو لاشیں کس حال میں تھیں۔ اور اور!“ اول خان نے موقع ملتے ہی اپنا سوال پیش کر دیا۔

”دونوں فائر کنٹینوں پر کیے گئے تھے۔ گولیاں کھوپڑیوں کا ایک حصہ ساتھ لے کر دوسری طرف سے نکل گئیں۔ اچھا ہوا کہ تم نے وہ لاشیں نہیں دیکھیں۔ کیا تمہیں اس بارے میں کوئی شبہ تھا۔ اور اور!“

”نہیں لیکن تصدیق ضروری تھی۔ اور اور!“ اول خان کے پاس اس سوال کا جواب تیار تھا۔

الفاسی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ کوئی بات جاننے کے لیے ہمیں اخبارات کھنگالنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

مگر اخبارات شہری زندگی کے لیے ایک لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی قابل ذکر خبر ہو یا نہ ہو، لوگ ناشتے پر اخبار پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ سلطان شاہ نے ایک ہار کے ذریعے گلشن اقبال کے نئے مکان میں بھی اس روزانہ چاٹ کا بندوبست کر لیا تھا۔

رستم کے گھر پر ہونے والی کارروائی کی خبر اگلی صبح صرف تین کالمی سرخی پر مشتمل تھی۔ اس منصوبے کو ذرائع ابلاغ سے پوشیدہ رکھا گیا تھا اس لیے کسی کو بھی اس ایکشن کی وسعت کا صحیح انداز نہیں ہو سکا تھا۔ بات صرف اتنی رہ گئی تھی کہ ایک پولیس پارٹی کسی تقشیر کے سلسلے میں بسرا گئی۔ رستم نے ملاقات سے انکار کر دیا اور پولیس کا سامنا کرنے پر خود کشی کو ترجیح دے چیتا۔ خبریں زیادہ اہمیت اس بات کو دی گئی تھی کہ رستم نے اپنی جان لینے سے پہلے اپنے اکوٹے نواسے کو بھی مار دیا تھا۔

خبر میں پنڈت منوہر لال کے بارے میں دور کا بھی کوئی حوالہ نہیں تھا۔ شاید پولیس اہلکاروں نے بسرا کے بے یار و مددگار ملازمین کو پنڈت کے بارے میں سختی سے اپنی زبانیں بند رکھنے کی ہدایت کی تھی جس کے نتیجے میں اخباری نامہ نگاروں کو بسرا سے کوئی مواد نہیں مل سکا تھا۔

رستم شہر کے باغجور بے خبر حلقوں میں اپنے رسوخ اور مالی استحکام کی بنا پر خاصا معروف تھا۔ اس کے بے باق ہونے کی وجہ سے

شخص اس پر تنقید کرنے سے گھبراتا تھا۔ اس کے خلاف کسی

”دوست بھی اچھے اور برے ہوتے ہیں۔ دیکھنا ہو گا کہ ہم کہاں کھڑے ہوتے ہیں۔“
وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ میں نے متبادل شغل کے طور پر سرگرمی لگائی۔

گھبراہ بجے اول خان کا فون آگیا۔ الفانے اس کے ساتھ مجھے بھی صدف بنیشن میں بلایا تھا جس کی ٹیلی منرل پر اس کا ماضی فیلڈ آفس قائم تھا۔ اول خان نے اپنی سولت کے مطابق الفانکو ساڑھے بارہ بجے کا وقت دیا تھا تاکہ مجھے اپنے ساتھ لے کر صدف بنیشن پہنچ سکے۔

اول خان نے اسٹیشن فور سے فون کیا تھا۔ اسے طبرچاؤنی سے صفورا کا کٹھ اور ریس کورس کے راستے ہمارے گھر تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے تھا۔ میں فوراً ہی تیاری کے ارادے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں غزالہ شاید میری ہی منتظر تھی۔

”کل سے وہ بہت آپ سیٹ ہے۔“ مجھے دیکھتی ہی غزالہ نے کسی تنہید کے بغیر اپنی بات شروع کر دی ”ذہنی کرب کی حالت میں اس کی سوچ پر پابوسی مسلط ہو جاتی ہے۔۔۔“

میں نے غزالہ کی بات کا ٹ دی ”وہ اپنی اپنی حرکتوں سے تمہارے اوپر اپنی مظلومیت کا رعب کاٹھتی ہے۔ دو چار روز میں اس کا دماغ خود بخود درست ہو جائے گا۔ میرا وقت خراب مت کرو۔ اول خان مجھے لینے کے لیے اپنے دفتر سے چلی پڑا ہے۔ مجھے تیار ہونا ہے۔“

”میری بات مانیں اور موقع محل دیکھ کر اس سے ملنا کر لیں۔ زیادہ بے زار ہو گئی تو وہ کسی بھی دن چپکے سے دنیا کے کسی بے نام گوشے کی طرف نکل جائے گی۔“

مجھے غزالہ کو کوئی موزوں جواب دینے کا موقع نہیں ملا کہ وہ اپنی بات پوری کرتی ہوئی، تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی چلی گئی۔ میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اس وقت پوری طرح تنہید تھی۔

غزالہ کی پچھلی گفتگو کے حوالے سے اس کی نئی سفارش میرے لیے بہت اہم تھی۔ میرے من کا چور اپنی جگہ پر تھا مگر یہ بات ایک اعزاز سے کم نہیں تھی کہ غزالہ کے سامنے میرا بحرم قائم تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے جس راستے چلنے کا مشورہ دے رہی تھی وہ کسی وقت خود اسی کے لیے سوانہ دل بن سکتا تھا۔ یہ میری اپنی خطا روی تھی کہ میں نے ویرا کی وجہ سے غزالہ کو کبھی بھی نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے بحال میں وہی درجہ دیا تھا جس کی وہ حق دار تھی۔

تھوڑی دیر بعد اول خان آگیا اور مجھے ساتھ لے کر منرل کی طرف روانہ ہو گیا۔

عدالت میں کوئی جرم ثابت نہیں کیا جا سکا تھا اس لیے واقفان حال بھی سرگوشیوں سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ اس کی ناگمانی خود کشی پر اخباری رویہ بھی ہر تنقید سے عاری تھا۔

میں ناشتے کے بعد بھی اخبار کے مطالعے میں مصروف رہا۔ مجھے اول خان کی طرف سے الفان کے پروگرام کے بارے میں کسی اطلاع کا بے چینی سے انتظار تھا۔

”اگر اخبار حفظ کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو وہ کامیاب نہیں ہوگی۔“ ویرا کی چیپتی ہوئی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اخبار کے انتظار میں اس کے صبر کا پیمانہ لبرز ہو گیا تھا۔

ویرا کی طرف سے فاصلہ برقرار رکھنے کے پہنچ کے سوا ہم دونوں کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی پھر بھی مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اپنے مخصوص اور تیکھے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔ میں نے کوئی عذر کیے بغیر خوش دلی سے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، میں وقت گزاری کے لیے بازار کے کھانڈ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم میری بے خبری میں یہاں آ بیٹھی ہو۔“

”آئندہ آنے سے پہلے ڈھول بجا کر آگاہ کر دیا کروں گی۔“ ویرا نے بے رخی سے کہا۔

”مشرقی شرفا یہ کام ڈھول کے بجائے گلے سے لیتے ہیں۔

کھنا رنے سے بھی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔“
”تم بھول رہے ہو کہ میں مشرقی نہیں، مغربی لڑکی ہوں اور تمہارے معیار سے شاید شرفا کی صف میں شامل ہونے کی شرائط پوری نہیں کرتی۔“ میری نرمی سے فائدہ اٹھا کر وہ کڑی سیلی بائیں کرتی رہی۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ گفتگو ختم کر کے اخبار کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

”اخبار دیکھو گی تو تمہیں حیرت ہوگی کہ رستم بھی شرفا میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں تم اس منصب کے لیے زیادہ بہتر امیدوار ہو۔“

میرا وہ مشورہ مضرت ثابت ہوا۔ ویرا نے فوراً ہی اپنی کود میں اخبار پھیلایا ”اب دیکھنا پڑے گا کہ تم لوگوں میں شرافت کا کیا معیار مقرر ہے۔ رستم شریف تھا تو دنیا میں کوئی بھی رذیل نہیں ہو سکتا۔“

”ہماری اس رسم کا خیال رکھنا کہ ہم مرجانے والوں کو برا نہیں کہتے۔ وہ عمل کی قوت سے محروم ہو کر خود ہی مکافات عمل کے گھیرے میں چلے جاتے ہیں۔“

اس نے ترجمانی نظروں سے میری طرف دیکھا اور قدرے بے اعتباری سے پوچھا ”کیا بات ہے؟ آج تمہارے لب و لہجے سے عداوت کے بجائے دوستی کا اظہار ہو رہا ہے۔“

”تو کیا ہم دوست نہیں ہیں۔“ میں نے جھوٹے ختم کرنے کے لیے

سے سامنا ہو گا؟“ راستے میں میں نے پوچھا۔

”وہ میرے لیے نئی جگہ ہے۔ دونوں افراد بھی اجنبی ہیں۔ رات کو میں نے بیدار میں آواز کی بنا پر الفا کو پچانا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہی پتا چلے گا کہ کون کون ملاقات کے لیے موجود ہے۔“

”ان سے مذاکرات کے لیے کیا پروٹوکول اپنانا ہو گا؟“ سرکاری افسروں کے لیے مراتب کا لحاظ ضروری تھا۔

”میری بات مختلف ہے۔ تم میرے دوست ہو۔ جب تک وہ کوئی واضح مخاطب اختیار نہ کریں، انگریزی سے کام چلا لیتا۔ اس زبان میں آپ اور تم کا فرق پتا ہی نہیں چلتا۔“

انہیت اور بے یقینی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ہم مقررہ وقت سے پہلے شتر روڈ کے عقب میں واقع صدف میٹشن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پتھروں سے بنی ہوئی اس تین منزلہ پرانی عمارت میں اپنے نازک نام کا کوئی بھی وصف موجود نہیں تھا۔ بادی النظر میں وہ کوئی آسیب زدہ عمارت نظر آتی تھی۔ اس کی اوپری منزلوں تک رسائی کے لیے باہر سے کوئی زینہ نہیں تھا۔ اکلوتا چوبی دروازہ بند تھا جس پر کال بٹن قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

پتھروں سے بنے ہوئے تین زینے چڑھ کر ہم دروازے کے سامنے پہنچے اور اول خان نے کوئی متبادل نہ پا کر لوہے کا وزنی کنڈا بجا کر اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ ایک شخص شاید دروازے سے لگا بیٹھا تھا۔ اس نے احتیاط سے ذرا سا دروازہ کھول کر اشتباہ آمیز نظروں سے سر تاپا ہمارا جائزہ لیا۔

”چالیں... ہم الفا سے ملنے آئے ہیں۔“ اول خان نے نیچی آواز میں کہا۔

پاس ورڈ سنتے ہی دروازہ مزید کھلا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ وہ کراچی کی ایک چمکیلی دوپہر تھی مگر اندر ملکی سی تاریکی کا راج تھا جس میں سیلن کی بو بچی ہوئی تھی۔ دروازہ بند ہے پر ہم ایک اونچے مگر قد رے مختصر مال میں تھے جس میں سے چوبی زینے اوپر کی منزلوں کی طرف جارہے تھے۔

بظاہر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس عمارت میں ہم تینوں کے سوا کوئی اور موجود نہ ہو۔

”ادھر سیدھے چلے جائیں۔ راستہ ایک دروازے پر ختم ہو گا۔ دستک دے کر اندر چلے جائیں۔“ دربان نے منہ ب انداز میں ہماری رہنمائی کی اور ہم چوبی زینوں سے متصل راہداری میں مڑ گئے۔ اس راہداری میں اس قدر اندھیرا تھا کہ ان کے وقت بھی رہنمائی کے لیے چھت سے لٹکے ہوئے دو بلب روشن تھے۔

عمارت کے گھسے ہوئے زینوں اور نیلی رنگی دیواروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی زمانے میں اسے نہایت فراخ دلی سے استعمال کیا گیا ہو گا مگر اس وقت وہاں پر ہول ویرانی کا راج تھا۔ وہاں کا ماحول کسی بھی کمزور دل آدمی کو

پنختہ فرش پر ہمارے قدموں کی آواز خاصی گونج پیدا کر رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے میزبان کو ہمارے پہنچنے کا پیشگی علم ہو گیا۔ ہم دستک دیے بغیر کھلے ہوئے دروازے سے اندر پہنچ گئے۔ دروازہ کھولنے والا کوئی خدمت گار تھا جو ہمارے پیچھے ہی باہر نکل گیا۔

اس کمرے میں دفتری کوئی علامت نہیں تھی۔ فرش پر گرد آلود اور بوسیدہ قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ سات نشیمن کی گھنٹاؤں والے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ان ہی کی مناسبت سے چٹنی میزیں تھیں۔ شیشے کی ایک الماری میں مختلف ضخامت کی فائلیں قریب سے جکی ہوئی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کمرے میں بھی کتنی کتنی چیزیں ہٹنے کا کام بھی ہوتا ہو گا۔

صوفوں پر پہنچنے کے دو صحت مند افراد بیٹھے سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔ ان چروں کی جھلک میں پچھلی رات دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر کفایت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیے۔ اس وقت پتا چلا کہ الفا نامی صاحب کا نام جلال اور دوسرے کا رحمان تھا۔ انہوں نے اپنے عہدوں کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

”اچھا ہوا کہ تم چند منٹ پہلے آ گئے۔“ جلال نے کسی رمی گفتگو کے بغیر براہ راست بات شروع کر دی ”ہم پنڈت کا سامنا کرنے سے پہلے کچھ وضاحتوں کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔“

”اپنی معلومات کے مطابق ہم ہر وضاحت پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ اول خان نے جواب دیا۔

جلال نے شفاف شیشوں کی ٹینک ناک پر ذرا نیچے سر کالی اور نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں ”تم ذہنی ہو۔ ماضی میں تمہارا نام بہت کثرت سے سننے میں آتا رہا ہے۔“

وہ مختار انداز میں شاید میری ستائش تھی۔ میں سر ہلا کر رہ گیا۔ جلال نے اپنی بات جاری رکھی ”وہ تین کاغذ تم نے پنڈت کے محفوظ ریکارڈ سے اڑائے تھے۔ کیا تم یہ بنانا پسند کرو گے کہ تم پنڈت کی طرف کیوں متوجہ ہوئے تھے جبکہ عیاشیوں کے سوا اس کا نامی بے داغ ہے۔“

تفتیش کے انداز میں کیا جانے والا وہ سوال بہت ٹیڑھا تھا مگر ان لوگوں نے ملک کے لیے پچھلی رات جو کارنامہ انجام دیا تھا اس کے پیش نظر میں نے بڑی نرمی سے کہا ”اس کے ماضی کے سارے سیاہ داغ اس کی عیاشیوں میں ہی پوشیدہ تھے۔ اس کے لئے بننے والوں میں مشکوک افراد شامل تھے جو سرکاری اہل کاروں کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر کے ناراضگی میں انہیں اپنا آلہ کار بنانے تھے۔ دھن راج جو حال ہی میں پکڑا گیا ہے، نہ صرف اس کا دوست تھا بلکہ اس کی بیٹی موہنی پنڈت کا بھی بوائے فرینڈ ہے۔ وہ خود ان سب باتوں کا اعتراف کرے گا۔“

خود ان سب باتوں کا اعتراف کرے گا۔

تقلید کی۔

سین زہد راہداری سے گزرتے ہوئے میں اس عمارت کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار سے باز نہ رہ سکا۔ میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا ”یہ عمارت باہر سے اندر تک خاصی ڈراؤنی اور ویران لگتی ہے۔۔۔“

رحمان نے ہنس کر میری بات کاٹ دی ”ان ہی خوبیوں کی وجہ سے یہ عمارت حاصل کی گئی ہے اور یہاں کا ماحول برقرار رکھا گیا ہے۔ بعض حصوں میں تمہیں چمکادڑیں بھی مل جائیں گی۔ یہاں صرف چار گن مین ہوتے ہیں۔ تمہارے لیے چائے لانے والا بھی گن مین تھا۔ ہم آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”شاید یہ عمارت خطرناک مجرموں سے تفتیش کے لیے مخصوص ہے؟“ اول خان نے پوچھا۔

”یہاں لائے جانے والے قیدیوں کا کافی مورال خود بخود ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ رات کو اندر سے کمروں میں چمکادڑیں چینی مار کر پھینچائی ہیں تو یہ ماحول اور ڈراؤن ہو جاتا ہے۔“

صدف نیشن ان کے خاص خاص مزمروں سے تفتیش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک کراچی ٹیلی منزل پر تھا۔ اوپر کے کمرے کبھی کبھی ہی کام میں لائے جاتے تھے۔

وہ دونوں اسی راہداری کے ایک دروازے پر رے۔ فوراً ہی وہ دروازہ خشک آگنی قبضوں کی پر شور آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر جاتے ہوئے ہم اس کمرے کے سامنے سے گزرتے تھے تو وہاں ایسا گہرا سکوت چھایا ہوا تھا جیسے اندر کوئی موجود نہ ہو۔ دروازہ کھلتے ہی گن مین نے اپنے افسروں کو سلام کیا اور اپنی جیب سے چابیاں نکال کر اندرونی دروازے کا تالا کھولنے کے لیے بڑھ گیا۔

آہٹوں اور تالا کھلنے کی آوازیوں پر اندر سے بڑبڑاہٹیں سنائی دینے لگیں۔ مقتول دروازہ کھلا تو وہ کرا دو طاقت ور قسموں کی تیز روشنی سے دمک رہا تھا۔ پنڈت منوہر لال کمرے کے وسط میں ایک چارپائی پر بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

وہ گہرا خامصا رہا لیکن سامان سے خالی تھا تاکہ قیدی مایوسی کے عالم میں اپنی زندگی کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ ایک گوشے میں اینٹوں سے بنی ہوئی کونفری تھی جو شاید ہاتھ روم کے طور پر قیدیوں کے لیے بعد میں بنائی گئی تھی۔

پنڈت نے ہم چاروں کو وحشت زدہ متورم آنکھوں سے دیکھا اور چارپائی سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا ”تو اب پتا چلا کہ میں یہاں اکیلا نہیں ہوں، درندوں میں گھرا ہوا ہوں۔“

اس کی آواز کمزور تھی لیکن الفاظ بتا رہے تھے کہ اس کا دم خم باقی تھا۔

جلال بڑھ کر اس کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ چند ثانیوں تک اسے قہر بار نظروں سے گھورنے کے بعد جلال نے اس کے بائیں رخسار پر زبانی دار تھمڑا دیا۔ پنڈت کے حلق سے ایک غراہٹ آزاد

کے میجر بخشی سے گھرے میل بول کی وجہ سے اس کا نام ہماری لہٹ پر موجود ہے۔“ اس مرتبہ رحمان نے میری بات کی تائید کی۔

”حیرت ہے کہ موہنی کا باپ ہونے کے باوجود پنڈت منوہر لال ہماری نظروں سے بچا رہا!“ جلال نے متاثرانہ لہجے میں کہا۔ اس کے استفسار پر میں نے موہنی اور ملنگ کا ذکر کیے بغیر پنڈت کی سرگرمیوں کے بارے میں ہر بات ان کے سامنے اگل دی۔

اس کی مخصوص پاریوں میں غیر ملکیوں اور بعض صیہونی ایجنٹوں کی شرکت کا انکشاف ان دونوں کے لیے چشم کشا ثابت ہوا۔ قیمت یہ ہوا کہ خفیہ اداروں کی مروجہ اخلاقیات کی وجہ سے اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میری معلومات کے ذرائع کیا تھے۔

”یہ سب جان لینے کے بعد تم اس کی راہ پر لگ گئے اور اس کے گھر سے کچھ کاغذات اڑا لانے میں کامیاب ہو گئے۔“ اس نے تائید طلب لہجے میں کہا ”ان ہی میں وہ تین کاغذ بھی شامل تھے۔“

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس دوران میں اول خان سوال کر بیٹھا ”ان کاغذوں کے بارے میں پنڈت خود کیا کہتا ہے؟“

”ابھی تک اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔“ جلال نے کہا ”بچپنی رات سے اسے بھوکا اور بیدار رکھا گیا ہے۔ اب تک اس کے اعصاب کمزور پڑ چکے ہوں گے۔ ہم تمہارے سامنے اس سے ملیں گے۔“

”وہ ڈھلتی ہوئی عمر کا آدمی ہے۔“ اول خان نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”بھوک، پیاس اور بے خوابی کی کیفیات اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گی۔“

جلال ایک مرتبہ پھر میری طرف متوجہ ہو گیا ”ان تینوں کاغذوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”قل ایب میں موساد کے فون نمبروں کا معاملہ ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا ”دوسرا مطبوعہ سرٹیفکیٹ یہ ثابت کرتا ہے کہ پنڈت جیوش انٹرنیشنل سیکرٹ سوسائٹی کا رکن ہے اور یہ سوسائٹی پاکستان کی ذرا بھی خیر خواہ نہیں ہو سکتی۔ تیسرے کاغذ پر ان لوگوں کا کوئی سا فگر کوڈ ہو سکتا ہے۔“

”ظاہری امکانات یہی ہیں مگر الفانیو مرک سسٹم پر مشتمل وہ کرپوزر گرائیوٹ دشوار ہے۔ اس میں انگریزی کے ہر حرف کے دو ہندسے مخصوص ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس زبان میں ایک چار حرفی لفظ آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہوگا اور اسے اسی طرح ڈی کوڈ کیا جاسکے گا۔“

”دشوار نہیں، عملی طور پر ناممکن۔“ رحمان نے اپنے ساتھی کی بات میں ٹکڑا لگایا۔

ان کا خدمت گار ایک ٹرے میں چائے کی چار پیالیوں کے ساتھ کچھ میٹھے اور نمکین بکٹ لے آیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ان دونوں افسروں کو کام کے ساتھ مدارات کا بھی خیال ہے۔

چائے کا دور ختم کرتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہوئی اور وہ لڑکھاتا ہوا کئی قدم پیچھے چلا گیا ”ہم درندے نہیں، تم سے بہتر انسان ہیں۔ اگر تم نے اپنی زبان کو لگام نہ دی تو ہم درندگی بھی دکھا سکتے ہیں۔ یہ نہ بھولو کہ اس وقت تم ہمارے قیدی ہو۔“

”میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم مجھ سے کچھ نہیں اگلا سکو گے۔“ وہ مٹھایا بھینچ کر نفرت بھری آواز میں چیخا ”میرے وکیل کو بلا دو۔ پھر دیکھنا کہ میں کیا کرتا ہوں۔“

”تم ٹھہرو۔ اسے میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے جلال سے کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ اس کے سر پر بالوں کی قلت تھی مگر جو بال تھے وہ خاصے لمبے تھے تاکہ ان کے ذریعے کھوپڑی کے بجر حصوں کو چھایا جاسکے۔ میں نے جاتے ہی اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کے جیزے پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا اور اس کے دہانے کے ایک گوشے سے خون کی ہلکی سی لکیر بہہ نکلی۔

پنڈت کے ہاتھ غیر ارادی طور پر ہونٹوں تک گئے۔ چیخا ہٹ محسوس کر کے اس نے اپنی انگلیوں کو دیکھا اور چیخ پڑا ”خون.... تم نے مجھے زخمی کیا ہے۔“

وہ دیوانہ وار میری طرف لپکا تھا لیکن اسی جیزے پر پڑنے والے دوسرے گھونٹے نے اسے زمین بوس کر دیا۔ اس کا وجود بخشنی تھا مگر وہ حیرت ناک قوت برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”تمہارے تینوں کانڈہ ہمارے پاس ہیں۔ بتاؤ! تم ان کی کیا قیمت دے سکتے ہو؟“

میرے وہ فقرے اس کے ذہن پر بجلی بن کر گرے۔ وہ اپنی چونٹوں کو بھول کر میرا چہرہ دیکھنے لگا ”اب تم مجھے بلیک میل کرو گے۔ میرے کانڈہ میرے ہی ہاتھ بنتے گے۔“

”خیر دینا چاہو تو سودا بھی ہو سکتا ہے ورنہ وہ ریکارڈ کا ایک حصہ بن جائیں گے۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہے۔ ہم زیادہ دیر تک تمہیں اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔“ اس کی مزاحمت کا ادراک کرتے ہی میں نے ہتھکڑی کا رخ یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ شاید جلال اور رحمان اس تبدیلی پر بری طرح جکے ہوں لیکن انہوں نے درمیان میں دخل انداز ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

”کک.... کیا تم یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ میں پولیس کی نہیں، تمہاری ذاتی تحویل میں ہوں؟“ اس کی سرخ آنکھوں میں امید کی ایک نئی چمک نمودار ہوئی۔

”ہم میں سے کوئی اپنی وردی میں نہیں ہے اور تم لاٹھ اپ میں بند نہیں ہو۔“

”اگر میں تم سے کوئی سودا نہ کروں تو تم میرا کیا لٹو لٹو گے؟“ اپنی جبلت کے تحت وہ میری باتوں پر یقین کرنا چاہ رہا تھا مگر بے اعتباری میں جھٹکا تھا۔

”تمہیں آزادی یا موت میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا ”تم بھرا سے پکڑے گئے ہو۔ تمہاری گرفتاری دکھانی پڑے گی۔ تم سودا کر لیتے ہو تو وہ کانڈہ تمہیں مل

جائیں گے۔ تم سے نرم سلوک کیا جائے گا۔ تمہاری فائل بہت بلی بلکہ کمزور ہو جائے گی اور تمہارا وکیل تمہیں جلد ہی رہا کرالے گا۔ تم نے سودے سے انکار کیا تو وہ کانڈہ تمہاری فائل میں جا بنیں گے۔ تم جانتے ہو کہ وہ تمہاری موت کے پروانے ہیں۔ غداری کی سزا ہر عدالت سے ایک ہی ملتی ہے اور وہ ہے سزائے موت!“

”مجھے سوچنے کے لیے وقت درکار ہے۔“ وہ کراہا ”تم نے مار مار کر میرے اوسان خطا کر دیے ہیں۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ اپنا مطالبہ بتاؤ اور مجھے تھما چھوڑ دو۔ ایک دو روز میں کوئی فیصلہ کرلوں گا۔“

اس کی مکاری پر میں دل ہی دل میں ہنسا پھر سخت لمبے میں کہا ”میں کہہ چکا ہوں کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ تمہیں اسی وقت فیصلہ کرنا ہے کیونکہ آج شام تک تمہاری گرفتاری دکھانی ہے۔ وہ کانڈہ ایک مرتبہ فائل میں چلے گئے تو انہیں واپس نہیں لیا جاسکے گا۔“

اس مکار بیڑھے نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں، ”بائیں ہاتھ کی پشت سے دہانے سے رواں خون صاف کیا“ ”مگر وہ کانڈہ تمہارے پاس کہاں سے آگئے؟“ ”بھرا میں میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ تم مجھے چمکادے کر لوٹنا چاہ رہے ہو۔“

”لحہ بھر کے لیے میں پتلا کر رہ گیا۔ مار کھانے اور بددعا ہونے کے باوجود اس کی عقل پوری طرح کام کر رہی تھی۔ کانڈہ اس کے گھر سے چوری ہوئے تھے پھر وہ پولیس کے پاس کیسے آسکتے تھے۔ میں نے بس لحہ بھر کے لیے سوچا اور کہا ”رستم ان ہی کانڈوں کی وجہ سے مارا گیا ہے۔ تمہارے گھر سے وہ سارے کانڈہ ملگ ملگناز نے اڑائے تھے۔ وہ رستم سے ان کا سودا کر رہا تھا مگر ممتاز بیڑھا آوی ہے۔ وہ کانڈوں سمیت ہمارے ہاتھ لگ گیا اور اب تم بھی ہمارے قبضے میں ہو۔“

میری زبان اس وقت مشینی انداز میں چلتی گئی اور کمانی خود بخود موزوں ہو گئی۔

”تم جھوٹے ہو۔ میں کانڈہ دیکھنے بغیر تمہاری کسی بات پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“ وہ مجھ سے حیلہ سازی کر رہا تھا لیکن اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ میں اپنے دل میں پیشان تھا کہ میں نے پنڈت کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں اس قدر سنگین غلطی کیسے کی تھی۔

پنڈت کے اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ اول خان کے ذریعے آئی بی والوں کی تحویل میں جا چکے تھے۔ میں نے باری باری رحمان اور جلال کی طرف دیکھا۔ جلال نے اپنی جیب سے ایک خاک لٹافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

”ورا ہو شیار رستا۔“ اول خان نے مجھے لقمہ دیا ”پنڈت ان کانڈوں کو ضائع کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔“

میں نے لٹافہ کھول کر وہ تینوں کانڈہ نکالے اور فضا میں ہل

میں نے دونوں ہاتھ جیبوں سے نکالے اور اس کے چہرے کو اچانک مکوں پر رکھ لیا۔ کمراس کی چیخوں سے لرزے لگا۔ وہ کمرے کے فرش پر ایک ہی جگہ کھڑا ہوا، کسی شرابی کی طرح جھومتا اور اپنے چہرے کو میرے طوفانی مکوں سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ آخر کار تورا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گرتے تک سب خاموش کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس کے گرتے ہی جلال قریب آکر محبت آمیز نرمی سے مجھے اپنے پلو میں لے کر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ جاتے جاتے میں نے عمارت سے پنڈت پر تھوک دیا ”حرام زادہ.... سو رک جا۔.... ہر شخص کو اپنی طرح کوڑیوں کا غلام اور بکاؤ مال سمجھتا ہے۔“

پنڈت کے بدن پر تشیح کی سی کیفیت طاری تھی، اس کے کئی دانت ٹوٹ چکے تھے، چہرہ جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا تھا۔ اس کا خون آلود چہرہ دیکھ کر میرے دل میں گویا ٹھنڈک سی اترنے لگی۔ ”میں حیران رہ گیا تھا کہ ڈینی نے اس کے ساتھ کاغذوں کی سووے بازی کا کیا چکر شروع کر دیا ہے۔“ پنڈت کے کمرے سے نکلتے ہی رحمان نے ہر ٹکف کو ہالائے طاق رکھ کر بے تکلفی سے بولنا شروع کر دیا ”بعد میں متنب کھا کہ اس طرح اس سے اعتراضات کروائے گئے ہیں۔“

جلال نے مجھے بدستور اپنے پلو میں لیا ہوا تھا۔ اس نے میرے بدن پر دیاؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا ”یہ ملک ممتاز کون ہے؟ تم اس کا ذکر نہ کرتے تو پنڈت ہرگز قایم نہیں نہ آتا۔“

”تم کل رات الفاتحے، آج جلال ہو، کل نہ جانے کیا بن جاؤ۔ اسی طرح کاغذ چراتے ہوئے میں ڈینی تھا اور رستم کے گھر میں پنڈت کی روپوشی کا سراغ لگاتے ہوئے ملک ممتاز بن گیا تھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”رستم ان کاغذوں کے تین کروڑ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا؟“ جلال نے حیرت سے پوچھا۔

”آمادہ نہیں ہوا تھا، مطالبہ سن کر حیران ہوا تھا۔ بات آگے بڑھتی تو آمادہ بھی ہو جاتا۔ تم نے دیکھا کہ پنڈت کتنی آسانی سے اس سووے کے لیے تیار ہو گیا۔“

”اور تم نے وہ موقع ٹھکرا دیا۔“ رحمان نے رشک آمیز لہجے میں کہا ”کاش! اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ تم جیسے ایک عالم پاکستانی نے وطن کی محبت کے لیے کتنی بڑی دولت کو لات ماری ہے۔ صاف اور سچے ضمیر کے بغیر ایسے فیصلے نہیں کیے جاسکتے۔“

پنڈت منوہر لال سے پوچھ گچھ کے دوران میں درنما ہونے والے ڈرامائی موڑ کے نتیجے میں ہمارے اور آنٹی بی والوں کے درمیان حائل ٹکف کی دیوار ٹکایک ہی گر گئی اور ہمارے درمیان ختم ہوا۔

دور سے پنڈت کو دکھائے۔ اول خان کی واضح وارننگ کے باوجود وہ حلیصانہ انداز میں میری طرف لپکا اور رحمان نے پل بھر میں اپنے بظنی ہولسٹر سے ریو اور نکال کر اس پر تان لیا ”رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

پنڈت منوہر لال جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اس کی نگاہیں کاغذوں پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ کاغذ اپنے سامنے کر لیے ”موساد کے چیف اور سیکریٹری کے فون نمبر جو مل ایب کے ہی ہو سکتے ہیں، جس کی تاحیات رکنیت کا تصدیق نامہ اور تمہاری کرپٹو گرانی کا کوڈ چارٹ.... پاکستان میں یہ تین کاغذ تمہاری سزائے موت کے لیے کافی ہوں گے۔“

”تم بہت چالاک ہو۔“ اس کی آواز پر پہلی مرتبہ شکست کے آثار غالب ہونے لگے ”تمہارا ہوم ورک مکمل ہے۔ بتاؤ، ان کاغذوں کی کیا قیمت مانگتے ہو؟“

میں نے وہ تینوں کاغذ موڈرک اطمینان سے لفافے میں ڈالے اور لفافہ جلال کو لوٹا دیا۔

”میں کچھ نہیں مانگا۔ تمہاری بولی وہاں سے شروع ہوگی جہاں ملک ممتاز نے چھوڑی تھی۔ تین کاغذوں کے تین کروڑ سے آگے کی بات کرو۔“ ذہنی طور پر اسے پوری طرح زیر کرنے کے بعد میں نے کہا۔

میری زبان سے تین کروڑ کے ذکر نے اسے پوری طرح قائل کر دیا ہو گا کہ ملک ممتاز واقعی ہمارے قبضے میں آگیا ہو گا کیونکہ میں نے ملک ممتاز کے روپ میں رستم سے تین کروڑ کا ہی مطالبہ کیا تھا۔

”اتنی تو میری جمع پونجی بھی نہیں ہوگی۔“ پنڈت نے جھجھی ہوئی آواز میں کہا۔

”ملک ممتاز نے تمہاری تجوری دیکھ لینے کے بعد ہی منہ کھولا تھا۔“ میں نے جواب دیا ”وہ ذرا بھی سیانا ہوتا تو کاغذ چھوڑ کر تمہاری تجوری سے اس سے زیادہ رقم اور زیورات لے جاسکتا تھا۔“

”بس پھر بات تین کروڑ پر ہی ختم کرو۔“ پنڈت کسی جیل جھٹ کے بغیر آمادہ ہو گیا۔

میں اپنے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال کر ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے پیچھے گھٹیا ”تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ یہ کاغذ تمہارے ہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اپنے کاغذ خوب پہچانتا ہوں۔“ وہ یک بیک پرسکون نظر آنے لگا تھا۔

میری ذرا سی چال بازی کے نتیجے میں وہ سب کچھ نہیں تو بہت کچھ اگل بیٹھا تھا۔ کاغذ اسی کے تھے، بہت اہم تھے اور اس نے ان کے بارے میں میری جتنی بات کہی تھی۔

کے گناہوں کا اعتراف کرایا ہے مگر ہم اب بھی ایک بندگی میں ہیں۔“ میں نے کہا ”ہمیں اگلوں کا ہو گا کہ یہاں اس کے کیا روابط ہیں۔“

”ملک سے باہر بھی وہ معلومات فراہم کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو جواب دہ ہو گا۔“ رحمان نے کہا۔

”یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے پاس موساد کے چیف اور سیکریٹری کے فون نمبر کیوں تھے۔“ جلال نے سگریٹ ساگ کر پر خیال لہجے میں کہا ”پاکستان سے وہ نمبر ملائے نہیں جاسکتے۔“

”پنڈت کثرت سے بیرون ملک جاتا آتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے خفیہ طور پر، کسی فرضی پاسپورٹ کے سہارے اسرائیل کا سفر بھی کیا ہو۔“ اول خان نے شبے کا اظہار کیا۔

”میں ڈینی کے رائے سے متفق ہوں۔“ جلال نے کہا ”اس بند گلی سے نکلنے کے لیے ابھی ہم کو پنڈت پر خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ یہ کام کراچی میں رہ کر بہتر طور پر آگے بڑھ سکتا ہے۔“

”اسلام آباد میں لوگ پنڈت کے فحش ہیں۔ ہم اسے کب تک یہاں روک سکیں گے؟“ رحمان نے پوچھا۔

جلال نے سگریٹ کا گھرا کش لے کر دھوئیں کے دائرے فضا میں بکھیرے اور کہا ”میں بات کروں گا۔ اگر ہم اسے یہاں روک رکھنے میں کامیاب نہ ہوئے تو ان دونوں کو بھی ہیڈ کوارٹر بلانا پڑے گا۔“

کفایت کے بغیر ہمارے کردار کو سراہ رہے تھے۔ دفتر کے طور پر استعمال ہونے والے کمرے میں واپس پہنچ کر جلال نے کہا ”پنڈت کے بارے میں میرے اندازے بالکل غلط ثابت ہوئے۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ سخت جان اور ضدی ہے۔“

”گلو خلاصی کے لیے بدحواسی کا غدر پیش کرتا رہا، جنوں ہی ڈینی نے ان کاغذات کے حوالے سے بات گھمائی اور اسے یقین ہو گیا کہ وقت نہیں مل سکے گا تو اس کی حاضر دماغی قابل رشک تھی۔“ اول خان نے ہنستے ہوئے کہا ”ہمارے پاس کاغذوں کی موجودگی پر شبہ ظاہر کر کے اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔“

”اس میں کوئی نہ کوئی وصف ہے جو ایک بین الاقوامی مبینہ تنظیم نے اسے اپنا تاحیات رکن بنایا ہوا ہے۔“ میں نے انہیں یاد دلایا ”مقتصد یسودی اپنی صفوں میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو کم ہی شامل کرتے ہیں۔“

”آج تم نے ثابت کر دیا کہ میں نے تم دونوں کو بلا کر بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا۔“ جلال نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”ہمیں ان تینوں کاغذوں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ تم اندر کی کمائیوں کا حوالہ نہ دیتے تو شاید وہ ان کاغذوں سے اپنا تعلق تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیتا۔“

”ابھی ہم نے صرف ایک مرحلہ سر کیا ہے کہ اس سے اس

تاقائم شدہ 1956
T.M. Reg. 7635

فیروپائرین (رجسٹرڈ)

فیروپائرین میں لگے ہوئے سب کپڑوں کو جز سے بالکل ختم کر دیتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈا اور گرم پانی لگتا ہے۔
فیروپائرین پائوریکی خطرناک بیماری دور کر کے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے گندہ اور بادی پانی خارج کر کے نرم اور سوزش اتارتا ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے خون لگتا ہے کر کے مسوڑوں کو مظلوم اور سخت بناتی ہے۔
فیروپائرین منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیمڑا بنانے کا سبب بنتے ہیں۔
فیروپائرین منہ میں گندگی اور بدبو دور کر کے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔
فیروپائرین جراثیم کش ہے زخموں پر لگائی جاسکتی ہے۔

Packing
10 ml Rs. 12.00.
25 ml Rs. 24.00

ہر اچھے گھر کی ضرورت

تیار کردہ فیروپائرین OI1084، غازی روڈ، راولپنڈی۔ فون (051-451631)

”جہیں علم ہے کہ میں اپنے ڈسپلن کا پابند ہوں۔“ اول خان نے مسکرا کر کہا ”اوپر کی اجازت کے بغیر اپنا اسٹیشن نہیں چھوڑ سکو گا۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ جلال نے بے پروائی سے جواب دیا ”تمہارے چیف کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تم اور ڈینی آئی بی کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہو۔ عام طور پر ہم دوسری ایجنسیوں سے دور اور الگ تھلک رہ کر اپنے انداز میں کام کرتے ہیں لیکن پنڈت بنیادی طور پر تمہارا کیس ہے۔“

”ہم تمہارا بچہ تم سے جھیننا نہیں چاہتے۔“ رحمان کے اس فقرے پر فضا فقروں سے گونج اٹھی۔

”پنڈت ہم میں سے کسی کا نہیں، سور کا اور وہ بھی ناجائز بچہ ہے۔“ تھکتے تھکتے پر میں نے تلخی سے کہا ”اس سے معلومات نچوڑنے کے بعد ہمیں جلد از جلد اسے اس کے انجام کو پہنچا دینا چاہیے۔“

جلال کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری ”ہم اس کے مجاز نہیں ہیں۔ ہمارے مضمون کو عدالتیں ان کے انجام تک پہنچاتی ہیں جو کام چل پڑا ہے“ اس میں رکاوٹ نہیں آئے گی۔ اسے بہت جلد قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کارروائی کا انحصار ہماری تفتیش پر ہے۔“

”ہم اعتبار کی فضا میں مل بیٹھ کر قانون کی باتیں کر رہے ہیں تو میں یہ جانتا چاہوں گا کہ اس وقت ڈینی کی پوزیشن کیا ہے“ سکوت کا وقفہ آتے ہی اول خان نے ایک اہم سوال اٹھادیا۔

”ہمارے ریکارڈز پر ڈینی ایک مفروضہ آسیب کا نام ہے جو کہیں نہیں پایا جاتا۔“

”لیکن کچھ عرصے پہلے آئی بی کو بھی اس کی تلاش رہی ہے۔“ اول خان نے ماضی کا حوالہ دیا۔

”آئی بی ایک آئینی ادارہ ہے۔ کچھ دوستوں کی خوشنودی کے لیے ان کی شکایات پر کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کی حیثیت ریکارڈز تک محدود رہتی ہے۔ فیلڈ میں کام کیا جاتا تو ان کی اشتہاری مہمات کا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکل سکتا تھا جو نہیں نکلا اور تم دونوں یہاں موجود ہو۔“ جلال نے جواب دیا۔

”میں سمجھ گیا۔“ جلال نے بین السطور جو کچھ کہا، وہ بہت واضح اور اطمینان بخش تھا۔

”لیکن میرا ایک مشورہ ہے۔“ جلال نے مجھ سے کہا ”وہ جب بھی سرگرم ہوں، تیس روپوش ہو جانا چاہیے، وطن دوست قوتوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ یہ پالیسی اپنے نفاذ کی ایک خاص سطح پر جا کر فائلوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ پالیسی سب سے ٹکلی سطح تک نہیں پہنچائی جاسکتی۔ بے خبری، غیر ضروری کارکردگی دکھانے کے شوق یا انعام کے لالچ میں اس سطح کا کوئی بھی اہل کار تمہیں گزند پہنچا سکتا ہے۔“

وہ کھل کر براہ راست کوئی بات نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کا پیغام جواب میں پناہ تھا۔ اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کی بنا پر وہ ایک خاص حد سے تجاوز کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے آنکھ سے اشارہ کر کے اول خان کو وہ موضوع وہیں ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔

صدف سینشن کے اس کمرے میں چائے کا ایک الوداعی دور چلا اور پھر ہم دونوں اٹھ گئے۔ واپسی پر جلال اور رحمان نے صدر دروازے سے ہمیں رخصت کیا تھا۔

راستے میں مجھے خیال آیا کہ ہم نے ان دونوں کو دھن راج کے بارے میں خصوصی توجہ کا احساس نہیں دلایا تھا۔ وہ ہتھیاروں کی غیر قانونی ترسیل کے چکر میں پکڑا گیا تھا لیکن کئی سازشی حوالوں سے اس کے ہاتھ پیر کافی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اول خان کی رائے بہت مختلف تھی۔ اس کی دانست میں جلال اور رحمان آئی بی کے سینئر اور تجربے کار افسران تھے اور سیکڑوں فقروں میں سے کام کی بات چن لینے کی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے پنڈت اور اس کی بیٹی مومئی کے حوالے سے دھن راج کا نام سننے سے بھی لیا تھا کہ وہ اس معاملے میں کارآمد ثابت ہو سکے گا۔

گھر پر سلطان شاہ بے زاری کے عالم میں چوکی داری کے فرائض انجام دے رہا تھا اور ڈرائنگ روم میں ٹیلی وژن آن کر کے اپنا دل ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ دونوں عورتیں قرب و جوار کے بازاروں کا جائزہ لینے کے ارادے سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔

غزالہ پر اس روز دیرا سے ہر دردی کا جو شدید دورہ پڑا ہوا تھا، اس کی بنا پر میرے لیے یہ جھنڈا دشوار نہیں تھا کہ غزالہ اسے دل ہلانے کے لیے ساتھ لے کر گھر سے نکلی ہوگی۔

”دونوں عورتوں کے بغیر گھرویران اور خالی خالی سامحوس ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”نکلر صدف سینشن سے کم۔“ اول خان دھیرے سے ہنسا پھر بولا ”یہ مجھ سے پوچھو۔ پچھل رات میں نے خالی گھر میں گزاری تھی۔ بیوی بچوں کے بغیر رو دیوار کھانے کو آرہے تھے۔“

”ہمیں گھر پہنچتے ہوئے تھوڑی سی دیر ہوئی تھی کہ وہ دونوں واپس آ گئیں۔“

سلطان شاہ پنڈت کے کانڈو کے بارے میں پہلے ہی میرا ہم خیال ہو چکا تھا۔ اس کے لیے صدف سینشن کی کمائی میں کوئی سنسنی نہیں تھی لیکن جب اول خان نے اس بارے میں دیرا کو بتایا تو وہ متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ ابتدا سے میرے قائم کردہ نظریے سے متفق نہیں تھی۔

”اب آئی بی والے خود ہی اس سے ٹنٹے رہیں گے۔“ یہ قصہ

اب ختم ہی سمجھو۔ وہ بولی۔

کوہلا رہا تھا۔ ان کے سروں پر کون سے مہرے موجود تھے اور وہ خود کس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا؟“ اول خان نے کہا۔

”مسئلہ تو ضرور چلے گا مگر اس سے تمہیں کیا لینا ہے۔ ملزم ثبوت سمیت آئی بی والوں کے پاس ہے۔“

”پنڈت بہت سخت جان ہے۔ وہ اس سے کچھ بھی نہیں وگھوا سکتے تھے۔ ڈپٹی نے اپنے کتب سے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ پھنس چکا ہے۔“

”کوئی مجرم کتنا ہی سخت جان کیوں نہ ہو، تھوڑا ڈگری کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ تم دونوں اپنے کتب نہ دکھاتے تو وہ دو چار دن بعد بولنے پر مجبور ہو جاتا۔“ ویرا نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”تم رابن مائر کے بارے میں کیوں نہیں بتا رہیں؟“ غزالہ نے اسے ٹوکا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ویرا نے اپنے تبصرے کے ذریعے میری کارکردگی گھٹانے کی کوشش کی تھی۔

وہ ویرا کا ذاتی رد عمل تھا۔ اسے اپنے بطلے دل کے پھپھو لے پھوڑنے کا پورا حق حاصل تھا۔ میرے لیے اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔

”یہ رابن مائر کا کیا قصہ ہے؟“ اول خان نے پوچھا اور ویرا سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گئی۔

”صبح تم بہت باریک بینی سے اخبار چاٹ رہے تھے۔“ سگریٹ سلگا کر اس نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا ”اس کا نام تو تمہاری نظروں سے بھی گزرا ہو گا؟“

”میں اس نام کی اہمیت سے لاعلم ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے اسے نظر انداز کر دیا ہو۔“

”وہ امریکی وزارت خارجہ میں مشرق وسطیٰ کے معاملات کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔“ اس بار وہ اول خان سے مخاطب ہو گئی ”کل وہ چند روز کے دورے پر اسلام آباد جانے کے لیے کراچی پہنچا ہے۔“ ”ایسے ماہر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس کے آنے میں کیا خاص بات ہے؟“

”وہ یروشلم کا بہت متعصب یہودی ہے۔ اس کا خاندان دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ آج بھی اسرائیلی مفادات کا بہت بڑا علم بردار سمجھا جاتا ہے۔“

”اس کے بارے میں تمہاری معلومات قابل رشک ہیں۔“ اول خان نے تعریف کی ”اس وقت اس کی کراچی میں موجودگی واقعی متنی خیز ہے۔ براہ راست اسلام آباد جانے کے بجائے وہ یہاں کیوں رکھا ہے؟“

”بس۔“ میں یہی نکتہ واضح کرنا چاہ رہی تھی۔ پنڈت منوہر لال کے ستارے گردش میں آئے ہوئے ہیں۔ اس سے رابطہ ٹوٹ جانے پر موساد اور ”جس“ والوں کو تشویش ہے۔ حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوئی اسرائیلی اہل کار پانچان لال میں سرحد پر

ڈسے داری شاید رابن نے اپنے سرے لی ہے۔“ ”اس کی سرگرمیوں پر صرف نظریہ رکھی جاسکتی ہے۔“ اول خان نے باپوسی سے کہا ”سفارتی مراعات کی آڑ میں کی جانے والی بد معاشیوں کا کوئی سدباب نہیں کیا جاسکتا۔“

”جب تم میجر بخشی کے کرتوتوں سے واقف ہوتے ہوئے اس کا کچھ نہیں ٹانگ سکتے تو رابن ایک بڑی طاقت کا نمائندہ ہے۔ بے بسی سے تماشا دیکھتے رہو۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔“

”وہ میجر بخشی کی طرح یہاں ٹکا نہیں رہے گا۔ خاموشی سے حالات کا جائزہ لے کر واپس چلا جائے گا۔“ میں ویرا کی سرد مہری پر خاموش نہیں رہ سکا۔ اس سے میں ویسے بھی کوئی سروکار نہ ہوتا چاہیے۔ اگر اس کا قیام طول پڑتا ہے تو پھر ہمیں اس کو دیکھنا پڑے گا۔“

”تم اسے اتنی آسانی سے نہیں دیکھ پاؤ گے۔“ ویرا نے مضحکہ اڑایا ”مریکا نے اس علاقے کو اپنے شہریوں کے لیے محفوظ قرار دے کر انہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ سخت حفاظتی بندوبست کے بغیر کہیں بھی نہیں جائے گا۔“

پھر تو اس کی آمد کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔“ میں نے اس کی بات پکڑ لی ”گھر اور دفاتر کی چار دیواریوں میں محدود رہ کر وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔“

”اس کی یہ مجبوری ہمیں کوئی نہ کوئی موقع فراہم کر سکتی ہے۔“ غزالہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ ہمارے معاملات میں بہت کم دخل انداز ہوتی تھی مگر جب بھی بولتی تھی، دور کی کوڑی لاتی تھی۔

سب کی نگاہیں اپنے چہرے پر مرکوز یا کر اس نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی ”اگر اس کے عوام نیک نہیں ہیں تو خفیہ طور پر باہر نکلتا اس کی مجبوری ہے۔ ہماری انتظامیہ اس کے تحفظ کی کوئی ذمہ داری ہی نہ لے۔ اپنی حکومت کی ہدایات کے برعکس وہ شہر کی خاک چھانتا ہے اور کسی بڑے انجام سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے لیے کسی کو بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکے گا۔“

”گڈ! یہ تجویز قابل عمل ہے۔“ اول خان نے ستائشی لہجے میں کہا ”ہمیں اس کی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی کرنی ہوگی۔ مشورہ پروگرام ہمارے راستے سے انحراف کرتے ہی وہ ہمارے نشانے نہ ہوگا۔“ ”اس کے خلاف کسی بھی کامیابی پر مجھے دلی مسرت ہوگی امریکا میں“ میں نے اس کی وجہ سے ”دراستیں ایک حوالہ میں گزاری تھی۔“ ویرا نے تلخ لہجے میں انکشاف کیا۔

”شاید اسی وجہ سے تم اس کے بارے میں بہت کچھ باتیں ہو۔“ سلطان شاہ نے کہا۔

”اس نے تمہیں حوالہ میں کیوں پہنچا دیا تھا؟“ غزالہ نے

”پھر مجھے جانا ہو گا۔“ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”فون کے مقابلے میں میرا جانا زیادہ موثر رہے گا۔“
”بس جاؤ اور رابطے میں رہنا۔“ میں نے اسے فوراً ہی رخصت کر دیا۔

○☆☆○

شام تک اول خان اپنے مورچوں پر تیا ریاں مکمل کر چکا تھا۔ رابن مار نے اسلام آباد روانگی کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا اور اپنے مقامی قونصل خانے کے گیٹ ہاؤس میں مقیم تھا۔ ایس ٹی ایف کے دو سادہ پوش اہل کار اس کی نگرانی پر مامور کر دیے گئے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس رابن مار کو شناخت کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کا صرف سفید فام ہونا کسی دھوکے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

میں نے اس کے بارے میں دیر اسے استفسار کیا تو وہ بھی رابن کی کوئی خاص شناخت نہیں بتا سکی۔ وہ بہت عام سے چہرے مہرے کا مالک تھا۔ گوروں کی بھیڑ میں اسے الگ پہچانا مشکل تھا۔ کامیابی کی کوئی امید نہ ہونے کے باوجود اول خان نے اپنا کام پورا کر دیا تھا۔

اسی طرح پنڈت منوہر لال کے گھر پر موجود ٹیلی فون لائنیں نگرانی میں آگئی تھیں۔ اپنے باپ کی طویل روپوشی اور دھن راج کی گرفتاری سے خوف زدہ ہو کر موہنی اپنے گھر میں ہی محصور تھی اور وقفہ وقفے سے مختلف لوگوں کو فون کر رہی تھی۔ اول خان نے متعلقہ ٹیلی فون ایجنسی میں اپنا آدمی بھادیا تھا جو

”وہ اس وقت بھی کسی اہم عہدے پر تھا۔ ایک پارٹی میں اس نے مذہبی کے عالم میں مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹائی پیکل کر دو پتھروں سے نواز دیا تھا۔ بھری پارٹی میں اپنی اس تیز دل کی کابلہ لینے کے لیے اس نے مجھے بند کر دیا۔“
”اپنی بے گناہی کے باوجود تم نے خاموشی سے ودن کی قید سہی؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”بے گناہی اس لیے ودن بعد آزاد ہو گئی۔ اس سے آگے اس کا رسوخ کام نہیں آسکا۔“

”حیرت ہے کہ امریکا میں بھی ذاتی اثار رسوخ کے سارے اس طرح شخصی آزادیاں تباہ کی جاتی ہیں۔“ سلطان شاہ انہی آواز میں بڑبڑایا ”تا تو یہ ہے کہ امریکا آزادیوں کی جنت ہے۔“

”امریکا میں بھی انسان ہی رہتے ہیں۔ انسان جہاں بھی رہے گا، وہاں خرابیاں ضرور پیدا ہوں گی۔ یہاں یہ خرابیاں بہت زیادہ ہیں“ امریکا میں بہت کم۔“ ویرا نے وضاحت کر کے بات وہیں ختم کر دی۔

وہ لوگ اپنی باتیں کرتے رہے اور میرا ذہن واقعات کی کڑیاں ملائے کی کوشش میں الجھا رہا۔ میں ان کی ہر بات سن رہا تھا لیکن ذہنی طور پر ان کے ساتھ نہیں تھا۔

پنڈت منوہر لال، موساد اور رابن مار۔ وہ ایک خطرناک مثلث تھی جو مسلسل میرے ذہن میں پکڑا رہی تھی لیکن کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ اگر رابن مار پاکستان کا دودھ پنڈت کے بارے میں تھا تو وہ خطرات سے اپنا دامن بچا کر کیا قدم اٹھا سکتا تھا اور کہاں جاسکتا تھا۔

معا میرے ذہن میں موہنی پنڈت کا نام ایک کوندے کی طرح پکا۔ رابن کو اسی سے پنڈت کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ ویرا نے اس کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھی تھی جس کا مطلب تھا کہ رابن شرمیں ایک رات گزار چکا تھا اور شاید موہنی سے ابتدائی رابطہ بھی کر چکا ہو۔ بیان قلم بند کرنے کے بعد پولیس نے موہنی کو رہا کر دیا تھا۔

”کیا تم پنڈت کے گھریلو فون پر فوری طور پر آہرویشن لگوا سکتے ہو؟“ میں نے اول خان سے پوچھا۔

”پنڈت کے پکڑے جانے کے بعد بھی تم اس کی ضرورت سوچ کر رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”رابن اس کی بیٹی سے رابطہ کر سکتا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”بزدوست ہو جائے گا لیکن فون کی نگرانی شروع ہونے میں کچھ وقت لے گا۔“

”جتنا بھی وقت لے، گے، یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ موہنی رات اور رابن کی نقل و حرکت اور رابطوں پر نگاہ رکھ کر ہم جلد ہی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔“

بزرگ خواتین حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لیگنڈ کورس	ایئر سٹریٹ فائبر آپٹک کورس	بیوٹی پارلر کورس
یوتیک سرونک	ڈانسمین	ایئر کنڈنگ
یوٹیوٹی وی کی ٹیکنیشن	ایئر مشین	اسکول ٹیچنگ میٹھڈ
ایئر بیئر ڈیکوریشن	فوتو گرافی	صحافت
سنگ	پیپرٹ	حکمت کورس
ایئر بیٹنگ	میڈیکل ایڈ	ڈیٹل ٹیکنیشن
ایئر بیٹنگ	ایئر بیٹنگ	ایئر بیٹنگ
ایئر بیٹنگ	ایئر بیٹنگ	ایئر بیٹنگ

یہ تمام کورسز اردو میں کیوں تصدیق اور ڈاٹا گرام کے ساتھ پریزیڈنٹ کتب کی ضرورت میں ہندوؤں کو گھر پر کر کے ہیں کورس کے دوران اور سنڈے کے بعد بھی مکمل رہائشی کے تھے تین ایک کورس میں داخلہ پا جاتا ہے۔ جوابی اٹلے کیساتھ خط لکھیں

1237 پلوٹ بکس اسلام آباد

ریکارڈ ہونے والی کالز کو ساتھ ساتھ مانیٹر کرتا جا رہا تھا۔ اول خان نے اہم نکات کے بارے میں اسے خود بریفنگ دی تھی۔ اسے توقع تھی کہ کسی بھی جانب سے کوئی اہم پیغام ریکارڈ ہوتے ہی اس کا آدمی اسے اطلاع دے دے گا۔

وہ خود اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اس کی دانت میں یہ بات کافی اہم تھی کہ رابن نے اسلام آباد کے لیے اپنی روانگی کو اتوار میں ڈال دیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کراچی میں رک کر کوئی اہم کام نمٹانے کا ارادہ کر لیا ہو۔

وہ خبریں دینے کے بعد ہی اول خان کا پھر فون آیا۔ میں نے پہل گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھالیا۔

”ابھی اپریش پر جلال نے رابطہ کیا تھا۔ ہم بالکل صحیح ٹریک پر چل رہے ہیں۔“ اس کی آواز میں جوش اور تینان کی کیفیت نمایاں تھیں۔

”کیا وہ پنڈت سے کچھ اور اگلوانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”کانڈوں کے بھید کھل جانے کے بعد اس کا حوصلہ ٹوٹ چکا ہے۔ وہ دونوں دوبارہ اس کے کمرے میں گئے تھے۔ اس نے کسی مزاحمت کے بغیر ہر سوال کا جواب دیا۔ اس بائرس کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ وہ اپنی جمع کی ہوئی ساری اطلاعات ہندوؤں والے کوڑے میں یک جا کر کے رابن مائر کو فیکس کرتا رہا ہے۔ امریکا سے وہ مواد قتل ابیہ منتقل کرنے کی ذمہ داری رابن کی ہوتی تھی۔“

”اسے بھی اسی ذریعے سے ہدایات ملتی ہوں گی؟“

”یوں سمجھ لو کہ واشنگٹن میں رابن کا دفتر پنڈت اور موساد کے درمیان پوسٹ آفس کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ ویرانے آج بالکل صحیح خبر کی نشان دہی کی تھی۔ غیبت یہ ہے کہ وہ مردود اسلام آباد جانے کے بجائے یہیں بیٹھا ہوا ہے۔“

”یہ غیبی اشارے ہیں۔“ سی ایس ڈی آن ہونے کی وجہ سے میں نے بے فکری سے کہا ”ہو سکتا ہے کہ اس کی موت ہی اسے امریکا سے کھینچ کر لائی ہو۔“

میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ رابن کے بارے میں پنڈت کا وہ بروقت اعتراف اس کی موت کا وارنٹ بننے والا تھا۔ اس کی کوئی بھی لغزش ہمارے لیے کامیابی کا سبب بن سکتی تھی۔

”میں تمہاری اس نیک خواہش کے لیے بس دعا ہی کر سکتا ہوں۔“

”بس وہیں جے رہو۔ کسین نہ کسین سے کوئی اچھی خبر بھی آئے گی۔ پنڈت اس قدر باپوس ہو گیا ہے تو اس نے اپنے مقامی ذرائع کی بھی نشاندہی کردی ہوگی۔“

”صرف تین آدمی اس کے لیے معاوضے پر کام کرتے ہیں۔

بقیہ معلومات وہ گہری دوستیوں کے ذریعے حاصل کرتا رہا ہے۔ اس بارے میں اس کے گھر پر منعقد ہونے والی پرنٹیش محفلیں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔“

”یہ سب گھر کے معاملات ہیں۔ انہیں بعد میں بھی سلجھایا جاسکتا ہے۔ اس وقت ہمیں اپنی ساری توجہ صرف اور صرف رابن پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ وہ اپنا نامعلوم مشن پورا کرتے ہی یہاں سے بھاگ نکلے گا۔“

”کل رستم کا صفایا ہوا۔“ آج کس کی باری ہے۔“ سلطان شاہ نے خواب گاہ کے دروازے پر رک کر پوچھا۔

”وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا لیکن قرائن رابن کی نشان دہی کر رہے ہیں۔“ فون بند کرنے کے بعد میں نے اسے اندر ہلاتے ہوئے کہا ”وہ کراچی اور قتل ابیہ کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دیتا تھا۔“

”اب میں گھر پر نہیں رکن گا۔“ اس نے کرسی سنبھال کر شکایتی لہجے میں کہا۔

”ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ یہ ہماری توقعات ہیں۔ ضرورت پڑی تو تم ہی سے کام لیا جائے گا۔“

وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، میں مسہری پر نیم دراز تھا کہ دیر ابھی کھلے ہوئے دروازے پر آگئی۔ وہ بس لمبے بھر کے لیے ہاں رکی اور کچھ کہے بغیر آگے آئے کہ اس کے کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ کل سے کچھ بھڑکی ہوئی ہے۔“ سلطان شاہ نے آگے جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ روٹنا اور خود ہی سن جانا اس کی عادت میں شامل ہے۔“

”پھر بھی کچھ تو چٹا چلے کہ قصہ کیا ہے۔“ ویرا کے بارے میں وہ بھی تجسس میں مبتلا رہتا تھا۔

”اس کے خوش یا ناراض ہونے کے لیے کسی قصے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بات تمہاوتے ہو۔“

وہ سہلرا کر احقانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ ہنسنے ہنسنے وہ راکا اور پھر سوال کر بیٹھا ”رستم کی موت کے بارے میں تمہارے کیا جذبات ہیں؟ کیا وہ واقعی پنڈت کے ساتھ موساد کے لیے کام کر رہا تھا؟“

”ایک قاتل اور مجرم کی موت کے بارے میں کسی کے کیا خیالات ہو سکتے ہیں؟“ میں نے اتنا اسی سے سوال کر ڈالا پھر کہا

”موت بھی ایسی جو حرام موت ہو۔ اسے کسی نے نہیں مارا۔ میرا خیال ہے کہ وہ موساد والے پکڑ میں لوٹ نہیں تھا۔ اس نے اپنی آن پچانے اور پنڈت سے دوستی بنانے کی خاطر ایک ناکہ فیصلہ

کیا۔ وہ گرفتاری دے دیتا تو شاید معاملہ سزا سے آگے نہ بڑھ پاتا۔

اس کے حق میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔“

”میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ اگر وہ پنڈت کا ساتھی نہیں تھا تو اس نے تم سے وہ کانڈ حاصل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ اسے علم تھا کہ وہ کانڈ کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ان کا ایسا کے لیے بے چین تھا۔“

”اس کا قصہ ختم ہو گیا۔ اس کا زندہ رہنا ناممکن میں سے

میں ایکس چیج میں رک کر چند منٹ ضائع کرنے کے بجائے سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔ اس وقت ایک ایک منٹ اہم...“
کیسٹ چل پڑا۔ اول خان سمیت سب نے خاموشی اختیار کر لی۔

گھنٹی بجی اور پھر ایک مترنم نسوانی آواز ابھری ”ہیلو! موہنی اسپیکنگ!“

”ہائے موہنی! یا رکھا حال ہیں تیرے۔“ دوسری نسوانی آواز بھی بہت جان دار اور خوشی سے بھرپور تھی ”اخبار میں تیرے ڈیڑی کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا، وہ آئے ابھی بھی غائب ہیں۔“

”رخشی! وہ ابھی تک نہیں لوٹے۔“ موہنی کی آواز بھرا گئی۔
”میں تجھے فون کر کے تھک گئی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ کیا تیرا فلیٹ بند پڑا ہوا تھا، تو تھی کہاں؟“

”سوری! ایک فریڈ کے ساتھ لمبی ڈیٹ پر تین دن سے مری گئی ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان پورٹ سے آئی ہوں اور آتے ہی بلا فون تجھے کیا ہے۔“

”تجھے معلوم ہے کہ میں اپنے دل کی بات بس تجھ سے ہی کر سکتی ہوں۔ میں تجھے بہت مس کر رہی ہوں۔“
”اب میں آگئی ہوں۔ کل تیرے پاس آؤں گی۔ مجھے اندازہ ہے کہ تو کتنی پریشان ہوگی۔ یہ پولیس والے کہاں جھک مارتے پھر رہے ہیں۔ تیرے ڈیڑی کا پتا کیوں نہیں چلاتے؟“

”میں ان ہی سب باتوں سے پریشان ہوں۔ تجھ سے مشورے

ہے۔ ویسے تمہاری دیکل وزنی ہے۔ اس بارے میں کسی وقت پنڈت ہی کو ٹوٹنا پڑے گا۔ کس بل نکل جانے کے بعد وہ ہر بات بتاتا جا رہا ہے۔“

”اس کا نام شاید اس وجہ سے میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے لاڈلے نواسے کو بھی مرن پڑا۔ وہ اکیلا مرا ہوتا تو مجھے بھول کر بھی اس کا نام یاد نہ آتا۔“

”اب میں تمہاری زبان سے یہ تذکرہ نہ سنوں۔“ میں نے اسے گھور کر کہا۔

”اس نے خاموشی اختیار کر لی مگر وہیں کمرے میں جا رہا۔ اسے بھی اول خان کی طرف سے کسی مثبت اطلاع کا بے چینی سے انتظار تھا۔

ہمارا وہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا لیکن اول خان کی طرف سے کوئی نیا پیغام نہیں ملا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعات برق رفتاری سے آگے بڑھتے بڑھتے اچانک ایک مقام پر ٹھہر گئے ہوں۔

آٹھ بجے کے قریب کال بیل جچ اٹھی۔ سلطان شاہ کمرے سے نکل کر تقریباً دو ٹوٹا ہوا باہر چلا گیا۔ میں بھی بستر چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ گھنٹی کی ناوقت آواز نے مجھے پریشان کر دیا تھا کیونکہ وہاں ہمارے کسی ملاقاتی کی آمد متوقع نہیں تھی۔ اس گھر کا فون نمبر جہانگیر کے پاس تھا، پتا اسے بھی معلوم نہیں تھا پھر وہ اس کی فارمی بند ہونے کا وقت تھا۔ دکان بند کر کے وہ اتنی جلد گلشن اقبال نہیں پہنچ سکتا تھا۔

وہ بس ذرا سی دیر کی تشویش تھی۔ چند منٹ بعد ہی غیر متوقع طور پر اول خان اندر آگیا۔

”موہنی کی ایک بہت اہم کال ریکارڈ ہوئی ہے۔ میں فون پر پیغام دینے کے بجائے اس چیج سے ٹیپ لیا ہوا سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔ ذرا لپٹا کیسٹ پلیئر منگوا لو۔“ اس نے آتے ہی کہا۔

گھنٹی کی آواز پر ویرا اور غزالہ بھی لابی میں آ موجود ہوئی تھیں۔ سلطان شاہ لپک کر ویرا کے کمرے میں سے کیسٹ ریکارڈر لے آیا اور ہم پانچوں ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔

”کیسٹ کے اسے سائڈ پر گھس خرافات ہیں۔ اس کا سائیڈ لی چلاؤ۔“ اول خان نے ہدایت کی۔

”کیسٹ بھی چل جائے گا۔ یہ تو بتاؤ کہ اس کال میں کیا بات اتنی اہم ہے کہ تم اسٹیشن فور سے دوڑ لگا کر خود یہاں چلے آئے۔“ ویرا نے اول خان کے رویے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”چاہتا تو یہ ہوں کہ کال سننے سے پہلے جتنس دور نہ ہو لیکن اس پیغام کا خلاصہ تباہی میں جرج بھی نہیں ہے۔ شاید آج رات رابن نے موہنی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”اس میں شاید وہی کیا بات ہے؟ تم نے کال نہیں سنی؟“ ویرا نے پوچھا۔

”میں نے جو سنا، وہ بتا دیا۔ کیسٹ تمہارے ساتھ سنوں گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرفِ شہید

ڈاکٹر اشفاق شکر • ڈاکٹر نرگس معین

تھمیل پور • جمعۃ المبارک

افاقِ ملاقات: صبح ۱۱ بجے

۶/ مئی ۲۰۱۷ء

افاقِ ملاقات: شام ۶ بجے

مزید معلومات کیلئے فون: 4966698

چاہ رہا ہے کہ میں بھی ڈیڈی کی طرح گھر چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں۔ ”موہنی کی آواز بھرائی۔

”تو فکر مت کر۔ میں ضرور فون کروں گی۔“ رختی نے اسے یقین دلایا اور مادر پدر آزاد معاشرت کی دلدل دوڑکیوں کی وہ گفتگو دہیں ختم ہو گئی۔

”میں نے کیسٹ ریکارڈر آف کر دیا“ اس وحشت ناک گفتگو میں کام کی بات بس اتنی ہی ہے کہ دس بجے کے بعد رابن یا اس کا کوئی آدمی پنڈت منوہر لال کے گھر پہنچے گا۔۔۔“

”رابن کو میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا“ اس لیے میری وہاں موجودگی ناگزیر ہے۔“ ویرا نے خوشی سے کہا۔

میں اس کی خوشی پر دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔ آخر کار اس کے میدان میں اترنے کا حلیہ پیدا ہو ہی گیا تھا۔

”یہ رابن کو گھبرانے کا بہترین موقع ہے۔“ سلطان شاہ بولا۔

”تمہاری پیش گوئی پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔“

”ضروری نہیں کہ رابن ہی آئے۔“ اول خان نے کہا ”وہ یا اس کا آدمی آئے گا۔“

”رختی درمیان میں نہ کودی ہوتی تو معاملہ بہت سل ہو جاتا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا ”ملازموں کے بیٹے ہی ہم موہنی کو بے بس کر کے گھر پر عارضی قبضہ کر لیتے۔“

غزالہ اس کی جگہ لے لی اور ہم چھپ کر آنے والے کا انتظار کرتے۔ وہ بے خبری میں بہت آسانی سے زیر کیا جاسکتا تھا۔

”رختی نے وہاں پہنچنے سے انکار کر دیا ہے۔“ سلطان شاہ نے بے ساختہ کہا۔

”مگر وہ پرندہ منہ بعد فون کرتی رہے گی۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ”اس کی موہنی سے بات نہ ہوئی تو وہ فوراً پولیس کو پنڈت کے گھر کی طرف دوڑ لگوا دی گئی۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم موہنی کے ہمدردین کراسے اعتماد میں لے لیں۔“ میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور فوراً اس خیال کو مسترد کر دیا۔

”موہنی بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ اپنے سائے سے بھی بڑک سکتی تھی۔ اس سے یہ امید عبث تھی کہ وہ ہمارے اجنبی چہلوں پر اعتماد کر کے رختی کو ہمارے بارے میں آگاہ نہیں کرے گی۔ اس کوشش میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی کہ میں کارروائی سے

بالکل باہر ہو جاتا کیونکہ موہنی مجھے کرل ہمال دستی کے ردپ میں میجر بخشی کے ساتھ بہت قریب سے دیکھنے کے بعد ایک لمحہ تجربے سے دوچار ہو چکی تھی۔

”کسی لمبی چوڑی سوچ و بچار کی ضرورت نہیں۔“ اول خان نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ”مجھے یقین ہے کہ رابن

ماڑ کی قیام گاہ سے محفوظ فاصلے پر مٹلانے والے میرے آدمی اپنے شکار کو پہچاننے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

”گنگرائی کرنی چاہیے۔“

کرنے تھے مگر تو لاٹ صاحب کی بچی ہے۔ کل آئے گی میرے پاس۔ دراصل میں نے ابھی تک ڈیڈی کی ایف آئی آر نہیں

لکھوائی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔“

”یہ کیا غضب کیا تو نے۔ ایف آئی آر تو فوراً کٹوائی تھی۔“ رختی تقریباً چیخ پڑی۔

”دراصل ڈیڈی ایک دوست کا بول کر خود گھر سے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے ایف آئی آر سے منع کر دیا تھا۔“

”وہ خود گئے تھے مگر کیوں؟ ان کا دوست کیا کہتا ہے؟“ رختی نے کئی سوال کر ڈالے۔

”لمبی کہانی ہے۔ گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ کچھ رقم وغیرہ کے ساتھ اہم کاغذ بھی لے گئے۔ جاتے جاتے گولیاں چلائیں۔

میں ابھی تو ڈیڈی ڈرک اور بدحواس تھے۔ انہوں نے کاغذ غائب دیکھے تو نشہ اڑ گیا اور وہ گھر سے چلے گئے۔ کل تک وہ اسی دوست کے پاس تھے۔ رات ادھر پولیس ایکشن ہو گیا۔“

”وہ تو رستم ایرانی کی بات تو نہیں کرتی؟ اس نے تو سوسائیز کر لیا۔“

”ہاں رختی! اور ڈیڈی ابھی تک گھر نہیں لوٹے۔ آج صبح ان کے ایک دوست کا فون آیا تھا۔ وہ امریکا سے آیا ہے اور اکیلے میں

مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ ڈیڈی کے سلسلے میں۔“

”اکیلے میں۔۔۔ پھر وہ تیرے پاس ضرور کسی بری نیت سے آئے گا۔ کیا کوئی فائر ہے؟“

”ہاں،“ خالص امریکن۔۔۔ تجھے معلوم ہے کہ میں ایسی چھوٹی موٹی باتوں کی پروا نہیں کرتی۔ بری نیت سے آ رہا ہے تو میرا تھوڑا سا وقت ہی خراب کرے گا؟“

آئی یو رمانڈ۔ میں ڈری ہوں کہ کوئی اور گھپلا نہ ہو جائے۔ وہ بولا ہے کہ گھر میں کوئی نوکر بھی نہ ہو۔ وہ بالکل اکیلے میں ملنا چاہتا ہے۔“

”ڈیڈی غائب، رستم ڈیڈ اور اب یہ ڈیڈی کا نیا دوست!“ رختی کی آواز بڑبڑاتھویش ہو گئی ”تو اس کو جانتی ہے؟ اور کیا بولتا تھا وہ؟“

”میں اسے نہیں جانتی۔ کوئی سالہ رابن تھا۔ وہ یا اس کا آدمی دس بجے کے بعد آئے گا۔ وہ ڈیڈی کے بیڈ روم میں ایک دفعہ

سارے کاغذ دیکھنا چاہتا ہے۔ پتا نہیں یہ کاغذوں کا کیا چکر ہے۔“

”مائی پور بے!“ رختی نے اسے پکارا ”تو واقعی مشکل میں ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تیرے پاس پہنچتی ہوں۔ ہم مل کر سب ٹھیک کر لیں گے۔“

”وہ تجھے دیکھ کر ناراض ہو جائے گا۔“ موہنی کی سہمی ہوئی آواز ابھری ”اس نے کئی بار بولا کہ گھر میں کوئی نہ ہو، یہ بہت

ضروری ہے۔ کہیں وہ تجھے شوٹ ہی نہ کر دے۔“

”ہائے لاؤڈ!“ رختی کی آواز میں خوف سمٹ آیا ”پھر میں نہیں آئی۔ پندرہ پندرہ منٹ بعد تجھے فون کروں گی۔ کوئی گریز ہوئی اور تو نے جواب نہیں دیا تو پولیس ایمرجنسی فون کروں گی۔“

”پلیز رختی! فون۔“

تھا۔ راہن یا اس کا آدمی اس مقررہ وقت کے بعد کسی بھی لمحے وہاں پہنچ سکتا تھا۔

ہمارے پاس خاصا وقت تھا۔ کھانا تیار تھا۔ طے یہ ہوا کہ روانگی سے پہلے غم پر ی کر لی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ راہن دس بجے کے بعد گیارہ یا بارہ بجے تک وہاں پہنچتا اور ہم خالی پیٹ وہاں سوکتے رہتے۔

موہنی کے گھر کی دیر ان عقبی گلی کی نگرانی کے لیے سلطان شاہ کو غزالہ کے ساتھ رہنا تھا۔ دیرا میرے اور اول خان کے ساتھ مین گیٹ کی طرف موجود ہوتی۔ پیچھے والوں کو مکان کی چار دیواری سے باہر رہ کر اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ ادھر سے کوئی دیوار پھانڈ کر فرار نہ ہو سکے۔ ہم تینوں کو موقع کی مناسبت سے کارروائی کرنی تھی۔

کچھ ہتھیار گھر میں موجود تھے۔ باقی اول خان کی گاڑی میں رکھے ہوئے تھے۔ ہم فرائض کے لحاظ سے دو گاڑیوں میں بٹ کر ساڑھے نو بجے گھر سے روانہ ہوئے تو اول خان کے ذخیرے سے حاصل کی ہوئی تین زہریلی انگوٹھیاں ہماری انگلیوں میں موجود تھیں۔ دشمن پر قریب سے بے آواز اور مسلک دار کرنے کے لیے وہ انگوٹھیاں بے مثال تھیں۔

مین روڈ پر آنے تک ہماری گاڑیاں ایک دوسرے سے پچھڑ چکی تھیں مگر کسی کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ موہنی کا گھر میرا اور سلطان شاہ کا دیکھا ہوا تھا۔ راستے میں سست روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم ٹھیک دس بجے موہنی والی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ نکلے سے گزرتے ہوئے ہمیں عقبی گلی کے کونے پر سلطان شاہ کی گاڑی نظر آئی۔ اسی وقت یہ اندازہ ہوا کہ ان دونوں کو اپنی گاڑی کھڑی کرنے کے لیے موزوں جگہ مل گئی تھی مگر مین گلی میں ہم جس کے گھر کے سامنے گاڑی روکے، وہ ہماری طرف سے شلوک و شبہات میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ میرے ایما پر اول خان نے اپنی گاڑی موہنی اور اس کے پڑوس کے مکان کی دیواروں کے قریب یوں لگا دی کہ کسی کا راستہ رکا اور نہ گاڑی کسی ایک حد میں رہی۔ قرب و جوار کے مکانوں کے پھاٹک بند تھے۔ کسی کو حتیٰ کہ خوش حال گھرانوں کے ملازمین کو بھی باہر بیٹھنے یا آواز ہر گز کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے جوئے کے انداز میں گاڑی چھوڑ دی۔

میں بظاہر بے پروائی سے چلتا ہوا موہنی کے پھاٹک پر پہنچا۔ رک کر اندر کان لگائے تو وہاں گھرا سنا تھا۔ شاید وہ راہن کی ہدایت پر ملازمین کو ہٹا چکی تھی اور خود گھر کے تمام دروازے بند کیے کسی کمرے میں بیٹھی تھی۔ مجھے پھاٹک میں اپنے گزرنے کا راستہ پیدا کرنے کے لیے کسی میکانزم کی

”وہ گھر میرا دیکھا ہوا ہے۔“ میں نے کہا ”اس کے پھاٹک پر اتنی کم روشنی ہوگی کہ دور سے آنے والے کو پہچاننا ممکن نہیں ہوگا۔ راہن کے دھوکے میں ہم اس کے آدمی سے بھڑکنے کو وہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”میری دانست میں ہمارا نشانہ راہن نہیں اس کا مقصد ہے۔ اگر اس کا آدمی ناکامی سے دوچار ہو کر مارا جاتا ہے تو ہمارا ہدف پورا ہو جاتا ہے“ اول خان نے رائے دی۔

”راہن بھول کر بھی پنڈت کے گھر کا رخ نہیں کرے گا“ غزالہ نے اس کی تائید کی۔

”جو بھی آیا، وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ شہر کے راستوں سے واقف ایک مقامی ڈرائیور کی ضرورت ناگزیر ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک دو مسلح محافظ بھی ہو سکتے ہیں جو باہر رک کر گاڑی اور اندر جانے والے کی حفاظت کرتے رہیں۔ ہمیں چار پانچ حریفوں کو ذہن میں رکھ کر منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔“

”تم اس بات سے تو متفق ہونا کہ جو آئے، اسے مار دیا جائے، راہن کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”تمہارا اور غزالہ کا اتفاق رائے ہے، میں کیسے مخالفت کر سکتا ہوں۔“

”ایسی صورت میں دیرا کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی“ سلطان شاہ بول پڑا۔ ”وہ پانچ بھی ہوئے تو ہم تین کافی رہیں گے۔ دیرا کل گئے اخبار میں مقتول کی تصویر دیکھ کر بتا دے گی کہ ہمارے ہاتھوں مرنے والا راہن تھا یا اس کا کوئی اور سفید فام ساتھی؟“

”مردوں کی شناخت کا یہ کام تم ہی کو مبارک ہو۔ میں ساتھ جاؤں گی“ دیرا چڑ کر بولی۔

”میرا جانا بھی ضروری ہے کیونکہ میں نے ڈینی کے ساتھ وہ گھر دیکھا ہوا ہے۔“

”شاید آج رات ہم سب کو ہی جانا پڑے“ میں نے رسائیت سے انہیں سمجھایا ”آنے والے دروازے کی سمت سے ہی آئیں گے لیکن کسی گڑبڑ کی صورت میں پچھلی گلی سے بھی فرار ہو سکتے ہیں۔ ہمیں دونوں طرف ان کے استقبال کے لیے تیار رہنا ہوگا۔“

میں نے اول خان کو پنڈت کے مکان کا اندرونی نقشہ سمجھا کر منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا۔ وہ تینوں آنے والے وقت کی مناسب تیاری کے لیے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

موہنی اور رختی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ٹیپ سننے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ موہنی کو دس بجے تک گھر کے چوکیدار سمیت، ہر ملازم کو گھر سے روانہ کر دینا

تلاش تھی۔ آخر مجھے چوٹی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی پر انگریزی کے حرف پوجیسا ایک الٹا ٹپ لگا ہوا نظر آیا۔ اسے اٹھاتے ہی ذیلی کھڑکی کھل گئی اور میں بچوں کے بل اندر کچی روش میں داخل ہو گیا۔

مجھے دروازے میں غائب ہوتے دیکھ کر اول خان اور ویرانے سرعت سے کمر لیا۔ چند ثانیوں بعد وہ دونوں بھی میرے ساتھ آئے۔ وہ کچی روش اور پورچ پر مشتمل مختصر حصہ تھا جہاں ایک دیوار کے ساتھ چوکی دار کی خالی چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ اس حصے میں صرف ایک بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی کم ہونے کے باوجود ہم تینوں کے لیے خطرناک تھی۔ ہم تیزی کے ساتھ پام کے اونچے گملوں کی اوٹ میں چلے گئے۔

”تم دونوں یہیں کہیں کمین گاہ تلاش کرلو۔ میں اندر جا رہا ہوں“ میں نے سرگوشی کی۔
”کیا دروازہ استعمال کرو گے“ میرے فوری ارادے نے اول خان کو پریشان کر دیا۔
”اگزیسیٹ فین کا ایک چوکور خلا میری نظروں میں ہے“ یہ کہہ کر میں ان دونوں سے الگ ہو گیا۔

کسی ملازم سے سامان نہ ہونے کا یقین ہونے کے باوجود میں نے پوری احتیاط سے عمارت کے پہلو تک رسائی حاصل کی اور پھر تیزی سے پیچھے پر چڑھ گیا۔ وہاں چوکور خلا جوں کا توں موجود تھا۔ وہاں تھا ہی کون جو یہ سوچتا کہ دروازے بند ہونے کے باوجود کوئی پنڈت منوہر لال کی خواب گاہ تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوا۔

دو چھتی، اسٹور اور رابڈاری میں، میں نے ہر طرف کی سن گن لی۔ مکان میں پہلے کی طرح سناٹا تھا اور صرف ایک ائر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ موہنی شاید اپنے کمرے میں موجود تھی۔ میں اس دروازے پر رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ آنے والے کو ساری دلچسپی پنڈت کی خواب گاہ سے تھی۔

پچھلی بار وہ دونوں محو خواب تھے مگر ان کے کمروں کے دروازے اندر سے پلٹ نہیں تھے، اس روز پنڈت وہاں نہیں تھا۔ مجھے امید تھی کہ موہنی کو اپنے باپ کا کمرہ مقفل کرنے کا دھیان نہیں آیا ہو گا۔ میں نے دستے پر قسمت آزمائی کی اور دروازہ کھل گیا اور کمرے میں رچی ہوئی ہلکی سی بساند میرے ہتھوں میں گھسنے لگی۔

ائر کنڈیشنر ہونے کی وجہ سے اس کمرے میں تازہ ہوا کے گزر کا ہر راستہ بند تھا۔ پنڈت کے فرار کے بعد ائر کنڈیشنر نہیں چلایا گیا تھا اس وجہ سے وہاں بساند کا پھندا ہوتا

کاروباری راز

پہلا پھل فروش :- میرے کیلے اتنے کم اور تمہارے اتنے زیادہ کیوں کہتے ہیں۔۔۔ جب کہ دام دونوں کے برابر ہیں؟

دوسرا پھل فروش :- بات صرف اتنی ہے کہ تم دس روپے درجن بیچتے ہو جب کہ میں گاہک کو بتاتا ہوں کہ بیس روپے کے درجن ہیں اور درجن کے ساتھ ایک درجن کیلے مفت ملیں گے۔“

لازمی تھا۔ کچھ دیر کے لیے مجھے وہ سب سنا تھا۔ کمرے میں بیش قیمت چوٹی فریج اور الماریوں کی بہتات تھی۔ میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں سے چشم زدن میں باہر نکل سکوں۔ اس مہم میں محدود روشنی والی ٹارچ میری مدد کر رہی تھی۔

ایک الماری کے برابر میں اسی لسانی کا آئینہ نصب تھا۔ میں نے اس سے چھین چھاڑ کی ٹوٹ کی طرح وہ آئینہ باہر کھل گیا۔ وہ کسی کے چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اس میں کچھ استعمال شدہ مردانہ اور زنانہ کپڑے موجود تھے۔ میں فوراً اس خلا میں داخل ہوا اور شیشے کا پٹھ پھینچ کر بند کر دیا۔

کھڑے ہوئے تابوت جیسے اس خلا میں پوزیشن لینے کے بعد میں نے چہرے پر اپنا رومال بھی باندھ لیا۔ میں نے گھر میں داخل ہونے کا فیصلہ اچانک کیا تھا اس لیے نقاب کا بندوبست نہیں کیا جاسکا تھا۔ میرے لیے کسی نقاب وغیرہ کے بغیر موہنی کا سامنا کرنا مناسب نہیں تھا۔

گھٹن اور تاریکی میں وقت رینگ رینگ کر گزرتا رہا۔ جب میرے بدن پر نہیں کہیں پسینہ رینگنے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد میں اپنے تمام ساتھیوں سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ میرے باہر نکلنے سے پہلے وہ کوئی اندھا دھند کارروائی کر کے مجھے خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے۔

کانی دیر بعد مکان کے کسی حصے میں ڈور بیل کی آواز گونجی پھر ایک طویل سکوت چھا گیا۔ فرش پر ہر جگہ قالین موجود تھے اس لیے کسی کے قدموں کی چاپ تک نہیں سنائی دے رہی تھی۔

آخر سکوت کا وہ سلسلہ منقطع ہوا اور میرے کانوں میں موہنی کی سہمی ہوئی آواز آئی ”یہ ڈیڈی کی خواب گاہ ہے۔ نامعلوم چور نے ان کی دیوار گیر تجوری سے سب کچھ باہر نکال

نہیں میرے ڈیڈی کہاں ہیں؟“

”ارکنڈیشنرز چلا دو اور کمرے میں موجود تجوری اور درازوں کی چابیاں میرے حوالے کر دو“ امریکی لب و لہجے میں ایک بھاری اور تحکم آمیز آواز ابھری۔

”تجوری سمیت اب ہر چیز غیر مقفل ہے“ بے آواز سوپچوں کے ذریعے کمرے میں پہلے ہی روشنی کی جاچکی تھی۔ موہنی کے جواب کے ساتھ ارکنڈیشنرز بھی چل گیا۔

”تجوری کا پتہ ہوا سامان کہاں ہے؟“ موہنی کے ساتھ آنے والے مرد نے پوچھا۔

”وہ میں نے دوبارہ الماری میں بھردیا ہے۔ مسٹر رابن! تم یقین کرو کہ وہ کاغذ اب یہاں نہیں ہیں۔ میرے ڈیڈی ان ہی کے لیے ریشمان تھے۔“

”مجھے معلوم ہے“ اس کی آواز سرد اور سفاکانہ ہو گئی
 ”تمہارا باپ کا حق تھا جو ان کاغذوں کی حفاظت نہیں
 کر سکا۔ پتا نہیں اس نے اپنے کمرے میں بے پروائی سے اور
 کیا کیا چھوڑا ہوا ہوگا۔“

”وہ یہ وہ بظاہر ہے پروا تھے مگر احتیاط ان کی سرشت میں شامل تھی۔“

کی آوازیں آرہی تھیں۔ اتر کنگڈم بستر چل جانے کے بعد فضا میں رہتی ہوئی بسانہ ٹھنڈک میں ماند پڑتی جا رہی تھی۔

”اے تین کانڈوں کی طرف سے تشویش تھی جو موساد کے ایک اہلکار نے جھجکے مارے میں تھے۔ تجوری سے کانڈوں

”وہ کتنا ادا دلدار جھوٹا بھی ہے۔ اس نے رستم کے گھر

سے مجھے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ کانڈوں کے بارے میں اس نے کسی کو حتیٰ کہ تم کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ تم نے یہ کہانی کر کے، کو سنائی ہے؟“ رابرٹ، آواز غصیلہ اور کرخت

”کس کو نہیں۔ میں نے نہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ مجھے

”تمہارے باپ نے تم سے آخری یار کب بات کی معلوم ہے کہ موساد اس ملک میں شجر ممنوعہ ہے۔“

”کل صبح... اس کے بعد سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ پتا

بیٹھے نیچے ڈھیر ہو گیا۔

مجھے شبہ تھا کہ داخل دروازے کے باہر رابن کا کوئی نہ کوئی آدمی موجود ہو گا۔ اپنے چہرے سے رومال ہٹا کر میں تیزی سے راہداری میں دوڑ پڑا۔ پرانے راستے سے جھجے پر پہنچتے ہی میں زمین پر کود گیا۔

عمارت کے کونے پر آکر میں نے اوٹ سے جھانکا تو وہاں ایک جیسیم سفید فام ستون سے ٹیک لگاے کھڑا تھا۔ وہ گیٹ کی نگرانی کر رہا تھا اس لیے اس کی پشت میری جانب تھی۔ اس کے بائیں شانے پر اسٹپ سے لٹکی ہوئی سب مشین گن مجھے صاف نظر آرہی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس وقت ویرا اور اول خان کہاں تھے مگر یہ نظر آ رہا تھا کہ گہری سرمئی وردی میں ملبوس وہ گوراپام کے گملوں سے صرف چند گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میرے اعصاب پر شدید اضطرابی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان دونوں کو کس طرح اپنی واپسی سے آگاہ کروں۔

میری وہ مشکل قدرت نے خود ہی آسان کر دی۔ ان دونوں کو معلوم تھا کہ میں کدھر سے گیا تھا۔ شاید وہ بار بار اوھر کا جائزہ لے رہے تھے پھر ان میں سے کسی نے مجھے عمارت کی اوٹ سے جھانکتے دیکھ لیا۔ گملوں کی اوٹ سے ٹھک کی آواز کے ساتھ موت کا ایک شعلہ لپکا اور ستون کے سہارے کھڑے ہوئے سفید فام کی گردن میں معدوم ہو گیا۔ وہ دراز قد اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کے گرنے کی آواز خاصی پر شور تھی۔

یقینی طور پر وہاں صرف وہی تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا بندوبست ہونے سے پہلے ویرا نے اپنے بے آواز ریو اور سے فائر نہ کیا ہوتا۔ میں نے پوری قوت سے پھانک کی طرف دوڑ لگادی۔ ویرا گملوں کی اوٹ سے نکل رہی تھی۔ اول خان دیوار کے ساتھ آگے ہوئے گنجان پودوں میں سے باہر آ رہا تھا۔

یہ سارے واقعات بہت سرعت سے اور تقریباً ایک ساتھ ہوئے۔ اسی دوران میں پھانک والی کھڑکی کھلی اور سفید وردی میں ملبوس کوئی مقامی چہرہ بھڑکے ہوئے انداز میں اندر جھکا۔ پھر شاید زمین پر پڑے ہوئے سفید فام پر نظر پڑتے ہی غائب ہو گیا۔

میرے پھانک تک پہنچنے سے پہلے کسی گاڑی کا انجن بیدار ہوا اور پھر وہ آواز بڑھتی ہوئی غراہٹوں کے ساتھ دور ہوتی چلی گئی۔ ڈرائیور کو گمیر بدلنے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

”ان کا ڈر! ڈرائیور گاڑی لے کر بھاگا ہے“ قریب پہنچنے پر اول خان نے سرگوشی کی ”غیبت ہے کہ اس نے دہشت زدہ ہو کر جج نہیں ماری۔ اب فوراً باہر نکل چلو۔ اندر والا تو شاید کبھی چل کر ہر نہیں آ سکے گا۔“

میں نے اس بات میں سہرا کر کہا ”خوف کی شدت سے بعض لوگوں کی سٹھکھی بندھ جاتی ہے یا آواز ہی حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ وہ ایسے ہی کسی قبیلے کا آدمی رہا ہو گا۔“ ہم تینوں اطمینان سے موہنی کے گھر سے باہر نکلے گاڑی میں سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ غزالہ اور سلطان شاہ کو کھیل ختم ہونے کی اطلاع نہیں دی گئی۔ اول خان نے دانستہ گاڑی ان کی طرف سے گزاری اور ہارن بجا کر وہاں سے آگے نکل گیا۔ سیدھے راستے کے اختتام پر وہ اس وقت تک رکا رہا جب تک وہ دونوں روانہ نہیں ہوئے پھر اس نے واہنی طرف والا راستہ لے لیا۔

”موہنی نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا ہو گا“ واپسی کا آغاز ہونے پر ویرا نے خدشہ ظاہر کیا۔

”میں نے چہرے پر رومال باندھ لیا تھا لیکن اس کا سامنا ہونے کی نوبت تھیں آئی۔ رابن نے اسے گولی مار دی۔“ میں نے ساٹ لہجے میں جواب دیا ”وہ بہت زیادہ بھرا ہوا تھا۔“ ”باہر فائر کی آواز نہیں آئی۔ شاید اس نے بھی سائینسٹر استعمال کیا ہو گا۔ رخش اگلی بار موہنی کو فون کرے گی تو اسے مایوسی کا سامنا کرنا ہو گا۔ وہی پولیس کو خبر دے دی گی۔“

”ویرا کو خوشی تھی کہ ایک طویل تعطل کے بعد اسے کسی کارروائی میں حصہ لینے اور امریکی قوتوں سے ملنے کے ایک مسلح محافظ کو مارنے کا موقع ملا تھا۔ سلطان شاہ اور غزالہ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سبب صرف یہ تھا کہ رابن اپنی بالادستی کے زعم میں صرف ایک آدمی کے ساتھ چوہے دان میں آ پھنسا تھا۔

رابن مائرج امریکا کی سرزمین پر پیورو کسی کی صفوں میں گھس کر صیہونی مفادات کے لیے کام کر رہا تھا، پاکستان کی سرزمین پر ایسی دوسری رات بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

اگلی صبح کے اخبار سنسنی خیز خبروں اور تبصروں سے بھرے ہوئے تھے۔ موضوع خن رابن مائرج ذات تھی۔

امریکی حکومت اور اس کے مقامی سفارت خانے کی واضح ترین ہدایات کے باوجود اس کی لاش کا پینڈٹ منوہرلال کے گھر میں پایا جانا ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ وہ قوتوں سے ملنے کے خلاف کے ساتھ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟ دوسری سنگین بات یہ تھی کہ موہنی کی پیشانی میں موجود گولی رابن کے

سے کوئی بات کی گئی تو وہ فوراً ریکارڈ کا ایک حصہ بن جائے گی۔ میرا تجزیہ ہے کہ امریکی ریکارڈ تک کسی نہ کسی طرح رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔“

”جلال اور رحمان سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی معلومات۔“

میں نے اس کی بات درمیان سے ہی اچکی لی ”میں نے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ وہ ریکارڈ اپنی تجویزوں میں نہیں، دفتروں میں رکھتے ہوں گے، نہ جانے وہاں کس کس کا ہاتھ پہنچتا ہو۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پنڈت کے لیے تین تنخواہ دار کام کر رہے تھے۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو گا کہ ان کی فراہمی کی ہوئی معلومات موساد تک پہنچانی جاری ہیں۔“

”بس یہ اونچ نیچ سمجھ لو۔ مجھے ملاقات کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔“

”ان سے اس بارے میں پہلے ہی بات کر لیں گے، میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔“

فون بند ہو گیا۔ سلطان شاہ میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے فوراً ہی فکر ہو گئی کہ میں کس سے ملنے جا رہا تھا۔

اول خان کی آمد تک ہم دونوں اسی بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ وہ میرے خدشات سے سو فیصد متفق تھا کہ ایس ٹی ایف جیسی غیر دستاویزی تنظیم تک بات ٹھیک تھی۔ قوانین کی حدود میں رہ کر کام کرنے والے اداروں کی مجبوریاں ہمیں اس نہیں آسکیں گی۔ کبھی کبھی لوگوں کا اپنا لکھا ہوا کوئی نوٹ ہی ان کے گلے کی ہڈی بن جاتا ہے۔ برا وقت آنے پر سب ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

وہ بات غلط نہیں تھی۔ ہمارے بارے میں اسپیشل ٹاسک فورس کو بھی بسا اوقات ہماری کھلی حمایت سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ میری یادداشت کے مطابق کم از کم دو بار اول خان کی نوکری خطرے میں پڑ چکی تھی۔ یہ اسی کا حوصلہ اور اپنی مٹی سے پیار تھا کہ وہ مسلسل ہمارا ساتھ دینے جا رہا تھا۔

اول خان کے ساتھ سفر کے دوران میں بھی یہی باتیں ہوتی رہیں اور ہم صدف مینشن پہنچ گئے۔

جلال اور رحمان نے اسی مخصوص کمرے میں بہت تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ رکی کلمات کے تبادلے اور پنڈت سے میرے سوال جواب کی مکرر تعریف کے بعد وہ اصل مطلب کی طرف آ گئے۔

”کل کے واقعے کے بارے میں تم نے اخبارات دیکھ

رہو اور سے چلائی گئی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ کی پشت پر چلے ہوئے بارود کے ذرات برآمد ہوئے تھے۔ شرکی ایک بدنام اور متنازع ماڈل گرل کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟

سوالات کا ایک طویل اور شرمناک سلسلہ تھا جو اس واقعے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا اور امریکی سفارتی ملازمین کے پاس مکمل خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔

ایک اخباری اطلاع یہ بھی تھی کہ ڈرائیور کے ذریعے کسی ناخوش گوار حادثے کی اطلاع ملے ہی امریکی کمانڈوز کا ایک دستہ موہنی کے گھر سے سارے شواہد مٹانے کے لیے بہت تیزی سے وہاں پہنچا تھا لیکن ان کے پہنچنے سے بہت پہلے رخشی کی جبری پر پولیس فورس نے پورے علاقے کو گھیر لیا تھا۔ کمانڈوز کو کسی کارروائی کے بغیر بے نیل و حرام واپس لوٹنا پڑا تھا۔ ان کی دو گاڑیوں کی آمد کے بہت سے عینی شاہد موجود تھے۔

بظاہر وہ پاکستان کی سرزمین پر امریکیوں کی بد قسمتی کا تسلسل نظر آتا تھا لیکن اندر ہی اندر اسرائیلی اور اس کی خفیہ ایجنسی بھی اس لڑائی میں شامل ہو چکی تھی۔ ہم لوگ اپنے طور پر جو کچھ کر رہے تھے اس کی کوئی قانونی یا سرکاری حیثیت نہیں تھی لیکن پنڈت منوہر لال کی صورت میں ایک مضبوط اور زندہ ثبوت آگئی بی والوں کی تحویل میں موجود تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ سرکاری سطح پر اس بارے میں کیا ہونے والا تھا۔

بازہ بکے اول خان کا فون آ گیا۔ آئی بی والے نوری طور پر ہم سے ملاقات کے خواہاں تھے۔

”کیا پنڈت نے پھر کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا ہے؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔

”اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس کے گھر پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں جلال فکر مند تھا۔“

”یہ سمجھ لو کہ وہ اس واقعے کی تفصیل جاننا چاہیں گے۔ ابھی تک کسی کو کچھ پتا نہیں چل سکا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ انہیں ٹالنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔“

”تمہیں اندازہ ہے کہ امریکی ایسے واقعات پر کیسے شدید اور جنونی رد عمل کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔“

”جلال اور رحمان سے ایک ملاقات میں ہی اتنی بے تکلفی ہو گئی ہے کہ ہمیں تھوڑی سی ٹپک کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ ایسے رابطے بعض اوقات عمر بھر کام آتے رہتے ہیں۔“

”پھر تم کیا کہتے ہو؟“ اول خان نے پوچھا۔

”جو کچھ ہوا، ابھی تک ہم انچوں کے درمیان ہے۔ ان

وہ دونوں پورے اعتماد سے بہت روشن امکانات کی باتیں کر رہے تھے۔ میرا مدعا واضح ہو چکا تھا۔ ان کا جواب آگیا تھا، ”اول خان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ”اے بی بی ایف کے ساتھ کام کر کے ڈینی کی عادتیں خراب ہو گئی ہیں۔ یہ شخص ہمیشہ سامنے آنے سے گریز کرتا رہا ہے۔“

”اس لیے اب تک اپنے بلکہ ملک کے دشمنوں کے سینے پر مونگ ڈل رہا ہے“ جلال نے کہا۔

”یہ صرف میری نہیں، پوری ٹیم کی پالیسی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک بے نام ہے۔“

”اوہ! تمہاری کسی ٹیم کا ذکر میں آج پہلی بار سن رہا ہوں“ جلال نے حیرت سے اعتراف کیا۔

”یہ ڈینی کا انکسار ہے“ میرے کچھ کہنے سے پہلے اول خان جلدی سے بول پڑا۔

”تم یہ سمجھ لو کہ میں تمہارے سامنے ملک کے مقتدر طبقہ کی نمائندگی کر رہا ہوں“ جلال چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ اپنے موضوع کی طرف آگیا ”وہ جانا چاہتا ہے کہ رابن مار کا قصہ کتنا پرانا ہے؟“

”کل دوپہر میں ہم تمہارے ساتھ تھے تو ہمیں گمان بھی نہیں تھا کہ دنیا میں کسی شخص کا نام رابن مار ہوگا۔“

”نہیں ڈینی؟“ رحمان نے تڑپ کر مجروح لہجے میں احتجاج کیا ”ایسی ناقابل یقین باتیں مت کرو۔ کچھ چھپانا چاہتے ہو تو صاف کہہ دو۔ ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ چند گھنٹوں میں اتنا بڑا اور بے داغ شکار! یہ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”میں ڈینی کے اس دعوے کا گواہ ہوں۔ یہ رابن کے مقدر کی گردش تھی کہ وہ وقت کے گھومتے ہوئے بے رحم پیسے میں اپنی گردن دے بیٹھا۔“ اول خان نے میری حمایت کی ”ڈینی کی پوری کمائی سنو گے تو تمہیں اس کی ہر بات پر یقین آتا چلا جائے گا۔“

”پھر یہ عقل اور وجدان کا کوئی کرشمہ ہی ہو سکتا ہے“ رحمان نے ہتھیار ڈال دیے۔

”رابن مار پر سو راپی پچھا، کل کے اخبار میں اس کی آمد کی خبر تھی جو میرے لیے بالکل غیر اہم تھی“ میں نے اپنی بات شروع کر دی ”میں اس سے واپسی پر کسی نے مجھے بتایا کہ رابن مار اسرائیل اور موساد کا کتنا بڑا ہمدرد ہے۔ میرے کان کھڑے ہو گئے اور اس کی آمد کے مقاصد پر غور شروع ہو گیا۔“

لیے ہوں گے۔ اسلام آباد میں کھلبلی مچی ہے۔ سب کی نگاہیں آئی بی پر لگی ہوئی ہیں اور ہم گنگ ہیں۔ کسی کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں“ رحمان نے کہا۔

”یہ سب درست ہے۔ اس بارے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے بنجیدگی سے پوچھا۔

”پنڈت کو تم ہی لوگوں نے گھیر کر ہم تک پہنچایا ہے“ اس کے گھر سے کاغذات نکالے تھے۔ شاید تمہیں کچھ معلوم ہو۔ کوئی تفصیل، کوئی سراغ۔ رابن مار وہاں کیا لینے گیا تھا۔؟“

”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی کو دانستہ چشم پوشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ تمہاری بہت سی مجبوریاں ہیں۔ ان کے مد نظر تمہاری خاموشی اور معذرت ہی سب سے بہتر راہ ہو سکتی ہے۔“

”تم ڈر رہے ہو؟“ جلال نے کہا ”کہ کہیں تمہارا نام جھنڈے پر نہ بڑھ جائے؟“

”یہ ڈر نہیں“ ایک حقیقت ہے۔ بہتیری باتوں کا ریکارڈ سے الگ تھلگ رہتا ہی سب کی سلامتی کے لیے بہتر ہوتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں“ جلال نے ہی بات جاری رکھی ”کل تم نے بہت کچھ کیا اور کہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر بات کا من و عن ریکارڈ پر آثار درست نہیں ہوگا۔ میری رپورٹ میں دور دور تک تمہارا نام نہیں ہے۔ سب کچھ ملک ممتاز کے حوالے سے سامنے لایا گیا ہے۔“

”رستم زندہ ہو تا تو پتا دیتا کہ ملک ممتاز کس حلقے کا آدمی ہے“ میں نے ہنس کر کہا ”ہر واقعے کے ساتھ کسی نام یا شناخت کو ریکارڈ پر لانا تمہاری ناگزیر مجبوری ہے۔“

”رستم زندہ ہو تا تو حالات بھی بہت مختلف ہوتے۔ اس وقت ملک ممتاز صرف ایک نام ہے۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں اپنی جگہ رہوں یا نہ رہوں، میرا ترتیب دیا ہوا ریکارڈ تمہارے لیے کبھی خطرہ نہیں بنے گا۔ میں اس بات کی پوری ذمہ داری سے ضمانت دیتا ہوں۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ کل کا واقعہ کس قدر اہم اور سنگین تھا“ جلال کے خاموش ہوتے ہی رحمان نے بولنا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے کیلے سوال سامنے آئے ہیں۔ حکومت بین الاقوامی سطح پر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ شاید پنڈت منوہر لال کو امریکی سفیر سے ملوایا جائے۔ کچھ اور مواد ہو تو پاکستان میں اسرائیلی مداخلت کی شکایت بھی کی جاسکتی ہے۔“

”کلی کے اخبار میں اگر ایسی کوئی خبر موجود تھی تو میں نے اسے نظر انداز کر دیا ہوگا“ جلال بولا۔
 ”اس کے لیے پنڈت اور اس کی روپوشی سے آگاہ ہونے کے بعد موہنی اہم ہو سکتی تھی۔ اس نظریے کے تحت ہم نے سادہ سا رپ تیار کر لیا۔ رابن ہمارے فعال ہونے سے بہت پہلے، صبح کے وقت موہنی سے بات کر چکا تھا مگر ہماری کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔“

میں نے اپنی جیب سے فون کا نر کاٹھپ نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا ”اس کی سائڈ بی پر محفوظ رکھنی اور موہنی کی گفتگو سن لو۔ ہر بات واضح ہو جائے گی۔“
 وہ ثبوت، شہادتوں اور ریکارڈ کے رسیا تھے۔ میرا مشورہ قبول کر کے رحمان نے فائلوں والی الماری سے ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیئر نکالا اور ٹیپ کا سائڈ بی چلا دیا۔ دو تین کوششوں کے بعد ٹیپ کا مطلوبہ حصہ چل پڑا۔

وہ دونوں حیرت سے دانتوں میں انگلیاں دیے دونوں لڑکیوں کی گفتگو سنتے رہے۔ کال مکمل ہونے پر جلال نے ٹیپ بند کر دیا اور گرامر سائلس لے کر بولا ”اور سالا رابن ہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔“

”تم نے ان دونوں کو وہاں کیسے گھیرا تھا؟“ رحمان نے پوچھا۔

”اس گفتگو کی روشنی میں سب کچھ آسان ہو گیا۔ میں پنڈت کی خواب گاہ میں چھپا ہوا تھا۔ رابن کا ارادہ تھا کہ موہنی کو قتل کر کے وہاں آگ لگائے اور خاموشی سے نکل آئے۔ وہ میرا نشانہ بن گیا۔ حافظ کو کسی اور نے مار دیا۔ یہ بڑا اور بے داغ شکار ہماری توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔“
 ”رابن اور موہنی کے درمیان ہونے والی گفتگو تم کو یاد ہے؟“ جلال نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

”لفظ بہ لفظ نہیں، خلاصہ سن سکتا ہوں“ میں نے جواب دیا ”چاہو تو تم نوٹس بھی بنا سکتے ہو۔“
 ”یہ گفتگو ریکارڈ پر نہیں لائی جاسکتی کیونکہ یہ صرف قاتل نے سنی ہوگی۔ گفتگو دہرائی گئی تو سوال اٹھے گا کہ رابن کو مارنے اور ہم تک گفتگو پہنچانے والا کون تھا؟“ جلال نے صاف گوئی سے کہا۔

میں نے اپنے کانوں سے سنی ہوئی تقریباً ہر اہم بات ان کے سامنے دہرا دی۔

”اگر رابن نے رستم کے بارے میں ذرا بھی شناسائی کا اظہار کیا تھا تو پھر رستم بھی ان کا ایجنٹ تھا“ جلال نے فوراً وہ نکتہ پکڑ لیا ”وہ اسی وجہ سے کھل کر پنڈت کی پشت پناہی کر رہا

تھا۔ اس کی خود کشی کے بعد ہم نے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔“

”ایک کوشش کے طور پر رستم کے کمرے کی تفصیلی حلاشی لی جاسکتی ہے“ میں نے اپنی رائے دی ”ایک امکان یہ بھی ہے کہ اس نے خود کشی سے پہلے وہ کاغذ تلف کر دیے ہوں۔“

”اس کے بارے میں پنڈت بتا دے گا“ اول خان بولا ”دکھی چھان بین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“

”اپنی بیٹی کے قتل پر وہ بہت دل برداشتہ ہے“ رحمان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”تم اس کی رگوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ آئے ہو تو اس سے بھی مل لو۔ شاید اس سے کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔ کل صبح کی پرواز سے اسے اسلام آباد بھیج دیا جائے گا۔“

”تمہیں رابن کے بارے میں میری کمائی میں کوئی بھول تو نظر نہیں آیا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”بھول نہیں ہے لیکن تمہاری سوچ کی سمت بہت حیرت ناک ہے“ رحمان نے پھینکی ہنسی کے ساتھ کہا ”رابن مارے کے بارے میں وہ سب باتیں سن کر ہم میں سے کسی کو بھی موہنی کا خیال نہیں آ سکتا تھا۔“

”ذہنی کو سب سے پہلے اسی کا خیال آیا تھا“ اول خان نے بتایا ”اس کا کریڈٹ یہی ہے کہ اسے صحیح وقت پر صحیح باتیں سوچتی رہتی ہیں۔“

”میں ایک بات سمجھنے سے قاصر ہوں“ جلال نے کہا ”اسے پنڈت کے گھر جانے کا خطرہ مول لینے کی کیا مجبوری تھی؟ اس کام کے لیے وہ اپنے کسی آدمی کو بھی بھیج سکتا تھا۔“

”یہی ایک بات ان تین کاغذوں کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ وہ بیڑوں کاغذ اکٹھے ہوں تو تھوہری بن جاتے ہیں۔ الگ الگ ہر کاغذ بے وقعت ہے۔ وہ کمرے میں کاغذ تلاش کرنے آیا تھا۔ ساز و سامان کا انبار دیکھ کر اس نے تلاش میں وقت برباد کرنے کے بجائے وہاں آگ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔“

”تکنی عجیب بات ہے کہ کل شام پنڈت نے رابن مارے سے اپنے تعلق کا اعتراف کیا اور رات کو وہ مارا گیا“ جلال نے رحمان سے کہا ”سارے اتفاقات ایک ساتھ رونما ہونے لگے تھے۔“

”جس نامی تنظیم کا نام پہلی بار ہمارے سامنے آیا ہے“ رحمان بولا ”اس میں رابن کا یقیناً کوئی اہم کردار تھا۔ وہ اپنی تنظیم کا نام دوسرے لوگوں سے بچائے رکھنا چاہتا تھا۔“

بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ تم مجھے درغلانی کی کوشش مت کرو۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ کسی نیک دل نے میری بیٹی کے قاتل کو بھی مار ڈالا اور میرا کلیجہ اٹھوا کر دیا۔ میرے ساتھ اتنی مہربانی ضرور کرنا کہ اس کی چتا جلانے کے لیے مجھے پھونڈ دینا۔ اس کے بدن کی راکھ اپنی پیشانی پر مل کر میں خود اسی کمرے میں آ جاؤں گا۔“

”تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ تم زبان کھولو گے اور ہم ان کے چیتھڑے اڑائیں گے۔“

”ابھی میرا دل زخمی ہے۔ مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔“ وہ قضا میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

اس کی حالت واقعی اچھی نہیں تھی۔ میں نے اس کے دماغ میں انتقام کا بیج بویا تھا جو سوکھ جاتا تو ہمارا کچھ نہ بگڑتا، پھوٹ نکلتا تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

ہم چاروں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس کمرے سے نکل آئے۔

”رستم تو اس پنڈت کا باپ نکلا“ رمان نے راہ داری میں پہنچ کر کہا ”اب سمجھ میں آیا کہ ان دونوں میں اتنی گاڑھی کیوں چھپتی تھی۔“

”باتیں اتنی دور نکل گئی ہیں تو کیوں نہ اولیٰ کی بات بھی ہو جائے“ اول خان نے مجھ سے پوچھا۔

”رستم نے ہمارے لیے وہی ایک بہترین کام کیا تھا۔ دشمن کے عیبوں کے ساتھ اس کی خوبیوں کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔“ میں نے مسکرا کر کہا ”آف دی ریکارڈ بنانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔“

ہم کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ جلال نے پوچھا ”رستم کے ساتھ اولیٰ کا ذکر کہاں سے آگیا؟“

”تم اولیٰ سے واقف ہو؟“ اول خان کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھر آئے۔

”اوہرائن ڈی ہنٹ ہمارے محکمے میں سفید شیطان کے نام سے مشہور تھا۔“

”مگر وہ تو پچھلے ہفتے نئی دہلی میں ٹریفک کے ایک حادثے میں مارا جا چکا ہے“ رمان نے کہا۔

”میں یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ ٹریفک کے اس خونیں حادثے کا اہتمام رستم نے کیا تھا“ اول خان کے اس انکشاف پر وہ دونوں ششدر رہ گئے۔

”آج ہمارے لیے حیرتوں کا دن ہے“ جلال نے کہا ”رستم کو اس سے کیا پر خاش تھی؟“

”رستم کو کبھی پر خاش نہیں تھی۔ وہ تو صرف کرائے کا

رازداری برقرار رکھنے کی یہ سرتوڑ کوشش اسے لے ڈولی۔ رستم کے گھر سے پنڈت کا فون ملنے کے بعد وہ حالات سنہالنے کے ارادے سے یہاں کے لیے روانہ ہوا لیکن اس کے پہنچنے کے چند گھنٹوں بعد ہی رستم اور پنڈت کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میرا بھی یہی نظریہ ہے“ میں نے رمان کی تائید کی ”اسے اسلام آباد میں کوئی سرکاری کام نہیں تھا۔ وہ واشنگٹن سے صرف کراچی کے لیے آیا تھا۔“

ہم چاروں ایک مرتبہ پھر پنڈت منو ہر لال سے مشترکہ ملاقات کے لیے چل دیے۔

وہ آرام سے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ خوراک کی فراہمی کا سلسلہ شروع ہو جانے پر اس کی حالت بہت حد تک سنبھل چکی تھی۔ زخموں پر بھی صفائی اور ڈرنجنگ کی گئی تھی۔

اس نے سوچے ہوئے زخمی پوٹوں کے درمیان بچھنی ہوئی پتلیوں سے ہماری طرف دیکھا اور کمزور آواز میں بولا

”تم پھر آ گئے۔۔۔ کل تم نے مجھے بہت بے رحمی سے مارا تھا۔“

”اسی کے بعد تم نے خود کو بہت سی سہولتوں کا اہل ثابت کیا ہے“ میں نے کسی ندامت کے بغیر کہا پھر سوال کیا

”رستم کو تم نے موساد کی ذیلی تنظیم کی رکنیت دلائی تھی؟“

”الٹی بات کہہ رہے ہو“ اس نے لمحہ بھر میں وہ پیللی حل کردی ”وہ مجھ سے بڑا تھا اسی لیے سارے کام مجھ کو کرنے پڑتے تھے۔ وہ مر کے رسوا ہونے سے بچ گیا اور میں زندگی میں ذلیل و رسوا ہو گیا۔ کل رات رابن نے میری بیٹی کو مار ڈالا۔ وہ مجھے بچانے کا وعدہ کر کے آیا تھا اور میری بیٹی کا خون پی گیا۔“

”ایسے کام بگڑ جائیں تو یہی انجام ہوتا ہے“ میں نے تھوڑی سی ہمدردی بتائی۔

”ذرا سی دیر میں میرے اور رستم کے خاندان یرباد ہو گئے۔ اب مجھے زندہ رہنے کی کوئی آرزو نہیں رہی۔ میری ہر امنگ دم توڑ چکی ہے اور میں اپنے انجام کا انتظار کر رہا ہوں“ میری طرف سے ہمدردی کے اظہار پر اس کی آواز میں رچی ہوئی بایوسی کچھ اور گہری ہو گئی۔

”مرنے کی خواہش بڑی ہے۔ انہوں نے تمہارے دو گھر جاڑے، تم ان کی پوری تنظیم کو فنا کر دو۔ وہ تمہارا بال بھی بیکار نہیں کر سکیں گے کیونکہ اب تم اکیلے ہو“ میں نے اسے ٹولنے کی کوشش کی۔

”میں اپنے ناناؤں کدھوں پر اتنی بڑی ذمے داری کا

کی جانے والی ہر کال کا وقت، دورانیہ اور ملائے جانے والے فون کا نمبر بل کی تفصیلات میں شامل ہوتا ہے۔ میری نشان دہی پر ان دونوں کے چرے کھل اٹھے۔

”اب کام بہت آسان ہو جائے گا“ جلال نے پورے اعتماد سے کہا، ”وضاحتیں پیش کرنے کے بجائے ہم معلومات طلب کرنے کی پوزیشن میں آجائیں گے۔ واقفیت میں رابن کے دفتری اور گھریلو فون بل کی نقول مانگی جاسکتی ہیں۔ ان سے پتا چلے گا کہ وہ پاکستان بلکہ کراچی میں کس کس سے رابطے میں تھا۔“

اول خان کے بشرے پر بھی اطمینان کے تاثرات پھیل گئے۔

وہ لوگ پنڈت کو اسلام آباد میں پیش کرنے کے لیے ایک آخری فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے اور میرا ذہن اپنی ہی بھٹائی ہوئی تجویز میں الجھا ہوا تھا۔ فون بل شری یا مقامی حدود سے باہر کسی بھی شخص کے نجی اور کاروباری رابطوں کا ایک بھرپور خلاصہ ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ بل کی اس اہمیت پر کسی شخص یا ادارے نے غور نہیں کیا تھا ورنہ ایک بل میں بار بار نمودار ہونے والے نمبر کی بنا پر بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔

”پتلے میرا ارادہ تھا کہ پنڈت کو کسی پارٹی کی نگرانی میں صبح اسلام آباد بھیج دیا جائے مگر اب زبانی بریفنگ کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم دونوں کو اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔“ باہمی مشاورت کے بعد ان دونوں نے اعلان کیا۔

”یہ خیال رکھنا کہ اسے موہنی کی اڑتھی اٹھانے اور چٹا جلانے کا موقع ضرور دیا جائے“ اول خان نے یاد دلایا۔

”تم کہتے ہو تو اس کی یہ رسوم اسلام آباد میں ہی ادا کرانے کا بندوبست کرنا ہو گا۔ پنڈت کو ہم کراچی میں نہیں روک سکتے“ جلال نے پورے احترام سے جواب دیا۔

”وہ مجرم ہونے کے ساتھ ایک باپ بھی ہے ورنہ تم جانتے ہو کہ مجھے پنڈت سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے“ اول خان کو اس کا جواب سن کر فوراً ہی وضاحت کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

موہنی بے راہ رو اور رنگین مزاج لڑکی تھی۔ وہ شہر کے جرائم پیشہ لوگوں کی آگے کاربانی ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کا انجام اس کے گناہوں سے زیادہ اندوہناک تھا۔ اس کے ذکر پر میرے دل پر ایک بے نام سا بوجھ سوار ہو گیا۔

افسانہ نگار کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے

بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس معاملے میں تمہاری ذرا سی بھی پیشگی باخبری کے بعد رابن ماز کے قاتل کی نشان دہی بلکہ گرفتاری تمہارا فرض بن جائے گا۔ امر کی ہر قیمت پر یہ جاننا چاہیں گے کہ رابن کا قاتل کون تھا۔“

”وہ ایک مشتبہ شخص کے گھر پر مارا گیا۔ مجاز حکام کو خبر کیے بغیر اس نے ایک مقامی کے گھر جا کر سفارتی آداب پامال کیے۔ ان سب حقائق کے باوجود وہ رابن کے قتل پر احتجاج کریں گے اور اس کے قاتل کو عبرت ناک سزا دینے کا مطالبہ کریں گے۔“

”یہ رسی باتیں ضرور ہوں گی مگر ان میں کوئی وزن نہیں ہو گا کیونکہ ان کا کوئی جواز نہیں بنتا“ میں نے کہا ”میرا مشورہ ہے کہ اپنی رپورٹ پنڈت تک ہی محدود رکھو۔ اس کے بیان میں سب کچھ اچکا ہے۔ وہ رابن ماز سے رابطوں کا بھی انکشاف کر چکا ہے۔ رابن کی کہانی کو تاریکی میں ہی رہنے دو۔ فی الحال بریفنگ سے کام چلانے کی کوشش کرو۔ یہ احتیاط بعد میں تمہارے کام آسکتی ہے۔“

”مسئلہ وہی ہے کہ پنڈت مقامی شہری ہے۔ دباؤ کے تحت کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے کچھ مضبوط شہادتیں بھی درکار ہیں۔ وہ رابن کیس سے ملتی ہیں۔“ ”یہاں تم کو مدافعتیہ نہیں، ذرا جارحانہ رویہ اختیار کرنا ہو گا۔ اپنی کارکردگی دکھانے کے بجائے جواب دہی کا بوجھ ان پر ڈالا جائے۔ وہ رستم کے خلاف کارروائی سے پہلے کراچی کیوں پہنچا تھا؟ پنڈت کے گھر وہ کس نیت سے گیا تھا؟ اس نے موہنی کو کیوں قتل کیا؟ سب سے بڑا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ کراچی میں اس کے مزید کن لوگوں سے روابط تھے۔ ان ہی میں سے کوئی اس کا قاتل ہو سکتا ہے۔“

”رحمان! یہ لائن زیادہ بہتر رہے گی۔ ہم تو شروع سے آخر تک بے خبر تھے۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں آیا، من مانی کرتا رہا اور اپنے درپردہ معاملات کی بنا پر کسی حریف کے ہاتھوں مارا گیا۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کراچی میں وہ کن لوگوں سے مل چکا تھا، قاتل کا چہرہ سامنے نہیں آسکے گا۔“

فوراً ہی میرے ذہن میں ایک اہم ترین نکتہ آگیا ”تمہارے پاس بعض ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ پنڈت اپنی رپورٹیں باقاعدگی سے اسے فیکس کرتا رہا تھا۔ رستم کے گھر سے اسے فون کیا گیا ہو گا۔ ان دونوں کے گھروں پر لگے ہوئے ٹیلی فونوں کے سننے اور پرانے بل نکالے جائیں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

وہ بالکل سامنے کی بات تھی۔ فون بل کے سلسلے میں مقامی نمبر دستیاب نہیں ہوتے لیکن بدولت شہر اور ہر مل

دوسری ایجنسیوں سے وہ اپریش واپس لے لیے گئے تھے۔ اس وقت وہ فری کو کنسی صرف ہمارے اور ان کے درمیان رابطے کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔

”الٹا کالنگ!“ ریڈیا کی شور میں جلال کی بھرائی ہوئی آواز ابھری ”اسلام آباد والے شاید سخت دباؤ میں ہیں۔ ہمیں ایک گھنٹے بعد انرفورس کے ایک جہاز سے وہاں کے لیے روانہ ہونا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد ہمیں ابھی ابھی یہ پیغام ملا ہے۔“ اور! ”

”پنڈت کے گھر پر مارا جانے والا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ یہ سب غیر متوقع نہیں ہے۔“ اور! ”اول خان کی آواز فکر آمیز تھی۔

”رستم کے بارے میں بھی ریکارڈ طلب کیا گیا ہے“ جلال کی پُر تشویش آواز ابھری ”اس بارے میں ہمارے پاس سرے سے کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے۔ بس تمہاری فراہم کی ہوئی چند اطلاعات تھیں۔ تم سے ملنے والے مل ایب کے فون نمبر کفرم ہوتے ہی آپریشن کی داغ بیل ڈال دی گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم اپنے ساتھ کیا لے کر جائیں گے“ اور! ”

”رستم!“ اول خان نے چونک کر دہرایا ”اس کے بارے میں اچانک ریکارڈ کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ وہ واقعہ تو آپ پرانا ہونا چکا ہے“ اور! ”

”کسی بین الاقوامی ادارے نے کچھ انسانی حقوق کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے“ جلال اپریش پر بتا رہا تھا ”تمہیں معلوم ہے کہ رستم ایران سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کر پاکستان آیا تھا۔ وہ بھائی فرنے سے تعلق رکھتا تھا اور اُن دنوں ایران میں بھائیوں کے لیے کمپن پناہ نہیں تھی۔“ اور! ”

”مگر! اتنے پرانے، مٹے مڑے اکھاڑنے کی اب کیا ضرورت پیش آ رہی ہے؟ اور! ” اول خان کی بے اندازہ حیرت میرے لیے تعجب انگیز نہیں تھی۔

”ناگ گھما کر پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رستم کی خودکشی کو پاکستان میں اقلیتوں کے عدم تحفظ کا مسئلہ بنایا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس کے گھر پر لشکر کشی کر کے غریب کو اتنا دہشت زدہ کیا گیا کہ اس نے اپنے نواسے سمیت خودکشی کر لی“ اور! ”

”ڈم پر پاؤں پڑتا ہے تو یہ سوار کے بچے ایسی ہی موٹ گاٹیاں شروع کر دیتے ہیں“ اول خان چراغ بھونکنا ”اس کے خلاف پنڈت منوہر لال جیتا جاگتا ریکارڈ ہے۔ وہ خود

اسلام آباد ملک میں طاقت، اختیار، حکمت اور ریاستی شوکت و جبروت کا منظرِ شہر ہے۔ وہاں بیٹھے والوں نے پنڈت منوہر لال کو اپنے رویہ و مطلب کیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ پنڈت کو کراچی میں روکا جاتا یا اس کی روانگی میں غیر ضروری تاخیر کی جاتی۔

پنڈت منوہر لال جیسے خطرناک سازشی مہرے کے لیے وہ ایک اندھنی سرنگ کا ہولناک سفر تھا۔ ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سفر کے اختتام پر اس کا کیا انجام ہوگا۔ اسے ایک معزز سہمان اور اقبالی گواہ کے طور پر ہاتھوں ہاتھ لے کر امریکیوں کے سامنے پیش کیا جائے گا یا اسے بدترین تشدد کی آخری بھٹی میں جھونک کر کفرِ کدور کو پہنچا دیا جائے گا۔ اس صورت میں موہنی پنڈت کی لاش آئی بی والوں کے لیے ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ پنڈت نے اپنی بیٹی کی ارہمی کو کندھا دینے اور اس کی چٹا کی راگ اپنی پیشانی پر ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ پنڈت کی اس خواہش کا اعادہ کر کے اول خان نے جلال اور رحمان کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔

پنڈت کے غیر یقینی مستقبل کی وجہ سے وہ اس کی واپسی کے انتظار میں نہ موہنی کی لاش برف خانے میں رکھ سکتے تھے نہ پنڈت کی روانگی التوا میں ڈال کر جلد از جلد موہنی کی چٹا جلانے کا بندوبست کر سکتے تھے۔ ایسے میں موزوں ترین فیصلہ یہی تھا کہ موہنی کی لاش پنڈت کے ساتھ اسلام آباد روانہ کر دی جائے اور وہیں اس کے کیا کرم کا بندوبست ہو جائے۔ اس پورے قصے میں تحریری واقعات کے مقابلے میں زبانی بریفنگ زیادہ وسیع اور اہم تھی جس کی وجہ سے آئی بی کے ان دونوں افسروں کا اسلام آباد جانا ضروری تھا۔ وہ ساتھ ہوتے تو اپنے افسران بالا سے کہہ سن کر پنڈت کی آخری خواہش کی تکمیل کا بندوبست کر سکتے تھے۔

جلال اور رحمان کے ساتھ وہ نکات طے کر کے ہم واپس روانہ ہو گئے۔ موہنی پنڈت کے قتل کا واقعہ تازہ یا نیا نہیں تھا لیکن اس کی موت پر پنڈت منوہر لال کا ردِ عمل ہم دونوں کے لیے ہی غیر متوقع تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے کہ راستے میں اپریش بول پڑا۔

”چارلی اسپیننگ۔“ اور! ” اشارہ موصول ہوتے ہی اول خان نے ایک ہاتھ سے اسپیننگ سنبھالا اور دوسرے ہاتھ میں اپریش سنبھال لیا۔

صدف میٹن کی ملاقات میں آئی بی والے یہ بتا چکے تھے کہ رستم کے گھر کا کامیاب آپریشن گمے بعد پولیس اور

انہیں بتادے گا کہ رستم بھی یہودیوں کا آلہ کار تھا اور رابن مائز سے رابطہ رکھتا تھا۔ اور!"

"اوہ!" اول خان کے جواب نے شاید جلال کو چونکا دیا "بوکھلاہٹ میں" میں بھول ہی گیا تھا کہ پنڈت نے رستم کا بھی پردہ چاک کر دیا ہے۔ دونوں کے فون بلوں سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ واشنگٹن میں رابن مائز سے قریبی رابطہ رکھتے تھے۔ ہمارے پاس ریکارڈ سے زیادہ جرم کا ثبوت موجود ہے۔ اور!"

"ہو سکتا ہے کہ ابھی تمہیں اس بارے میں تفصیل کا علم نہ ہو لیکن اسلام آباد پیجنے کے بعد یہ ضرور بتانا کہ رستم کی خود کشی پر انسانی حقوق کا شو شاکس نے کھڑا کیا ہے۔ اور!"

"مقصود تقابوں میں جیسے ہوئے ایسے سازشی چروں میں ہم بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ شاید اس وقت ملک ممتاز بھی تمہارے ساتھ ہی ہوگا؟ اور!" اول خان کے مطالبے کا جواب دے کر جلال نے دریافت کیا اور اول خان نے اپریٹس مجھے تھماوا۔

"اگلے نام کے انتخاب تک مجھے صرف ملک ہی رہنے دو۔ ملک ممتاز کا نام تمہارے ریکارڈ پر آیا ہوا ہے۔ اور!"

میں نے اپریٹس لیتے ہی جلال کو یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے" میں احتیاط کروں گا مگر یہ سسٹم اتنا فول پروف ہے کہ اس پر ہماری کوئی بات کہیں نہیں سنی جاسکتی۔ تم ہمارے پروگرام سے متفق ہونا؟ اور!"

"اس وقت اٹھائے جانے والے ہر نازک سوال کا جواب پنڈت منو ہر لال کے پاس موجود ہے مگر اس بارے میں میرے کچھ تحفظات ہیں" اور۔

"میں وہی جانتا چاہتا ہوں" جلال کی مضطربانہ آواز ابھری "ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہمیں قیدی کو لے کر شارع فیصل ایر بیس بھی پہنچنا ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟ اور۔"

"پنڈت سے ملنے والی معلومات کو پوری طرح استعمال کرو مگر فی الحال اس کا نام سامنے نہ لاؤ۔ اس وقت وہی ہمارے قابو میں ہے۔ اس کا نام کھول دیا گیا تو ہم اپنا کام آگے نہیں بڑھا سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی امریکی یا یہودی ایجنٹ اسے ٹھکانے ہی لگا دے۔ اور۔"

"تم چاہتے ہو کہ اسے اسلام آباد میں امریکیوں کے سامنے پیش نہ کیا جائے؟ اور۔"

"نہ صرف یہ احتیاط ناگزیر ہے بلکہ اس کا نام بھی فی الحال سینڈ راز میں رہنا چاہیے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کئی

دن سے مفروار روپوش ہے" اور۔

"اس کے گھر سے رابن مائز کی لاش برآمد ہونے کے بعد وہ ایک بہ یک اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسلام آباد والوں پر اس وقت پنڈت ہی کی تلاش کا دباؤ ہو" اور۔

"اسے پیش کر کے ہم اپنے حریفوں کی خواہش پوری کریں گے" اور۔

"اس کا نام پردے میں رکھ کر" جس" کے بارے میں ملنے والے تینوں کانفڈوں کو منظر عام پر لانا ممکن نہیں رہے گا۔ ان کانفڈوں کی بنیاد پر ہی کارروائی آگے بڑھی تھی" اور۔

"جلال! تم ایک تجربے کار سروس آفیسر ہو۔ اپنے حریفوں بلکہ دشمنوں کے سامنے اتنی معصومانہ سچائیاں پیش کر کے ہم سراسر خسارے میں رہیں گے۔ سب کچھ بدل ڈالو" اور!"

"کیسے۔ کیسے؟" اپریٹس پر اس کی آواز مضطربانہ ہو گئی "وقت گزرا چلا جا رہا ہے۔ تم صحیح سمت کی نشان دہی کر رہے ہو لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اتنی کم مدت میں یہ تبدیلیاں کیسے لائی جاسکتی ہیں۔ تمہارے ذہن میں کوئی خاکہ ہو تو مجھے بتاؤ" اور۔

میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں فوری طور پر جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے مضطربانہ استفسار پر میرے ذہن کی چرخی چل پڑی اور خود بہ خود رستم کا پُر عزم چہرہ میری نگاہوں کے سامنے مجسم ہوتا چلا گیا۔

میرے اٹوٹھے کا دباؤ پیغام نشر کرنے والے بلن پر تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس دوران میں جلال اپنی آواز ہم تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری طویل ہوتی ہوئی خاموشی اس کے لیے اعصاب شکن ثابت ہو رہی ہوگی مگر میرے پاس کوئی فوری جواب موجود نہیں تھا۔

چند ثانیوں کے توقف کے بعد جوں ہی نکتہ میرے ذہن میں آیا، میں نے بولنا شروع کر دیا "پنڈت کو ابھی روپوش ہی رہنے دو۔ شہر میں عملی طور پر بھی اس کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔ تم آسانی سے دعویٰ کر سکتے ہو کہ "جس" والے کانفڈ رستم کے گھر سے برآمد ہوئے ہیں" اور۔

"ویری گڈ!" جلال کی آواز خوشی سے بھرپور تھی۔ "اب بات بن جائے گی" اور۔

"اس کہانی سے رستم کے چہرے سے نقاب ہٹ جائے گی اور اس کے حق میں آواز اٹھانے والے مناقق ہوش میں آجائیں گے۔ پنڈت نے خود اعتراف کیا ہے کہ رستم "جس"

”تو کیا پنڈت منوہر لال کی گرفتاری ریکا رڈ پر آگئی ہے؟“

ویرا نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی مجبوریاں درپیش ہیں۔ آئی بی والوں کے دو ریکا رڈ ہوتے ہیں۔ ایک افسران بالا کے لیے اور دوسرا باضابطہ۔ بڑے ہی یہ فیصلہ کر س گے کہ پنڈت کی گرفتاری صیغہ راز میں رکھی جائے یا ظاہر کر دی جائے۔ تم اس بارے میں کیوں فکر مند ہو؟“

”نی الحال اسے پردے میں رہنا چاہیے۔“ ویرا نے تارانسکی میں میری رائے کی توثیق کی ”ابھی اس سے بہت کچھ اگلوانا باقی ہے۔ وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔“

اول خان کی استفہامیہ نظریں میری طرف اٹھ گئیں جیسے وہ ویرا کے کیے ہوئے سوال کا جواب میری زبان سے سننا چاہ رہا ہو۔

”ویرا کے اور تمہارے معاملات میں، میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”یہ میرا نہیں، ہم سب کا مسئلہ ہے۔“ اس مرتبہ ویرا مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے“ سلطان شاہ نے پُر زور لہجے میں لقمہ دیا۔ ”پنڈت نے اسے اغوا تو نہیں کیا تھا جو صرف اسی کو اس کے انجام کی فکر ہو، دوسروں کو بھی۔“

”اپنی زہر افشانی بند کرو“ ویرا نے غرا کر اسے ڈانٹ دیا ”اب بولے تو میں ہاتھ مار دوں گی۔“

”کیسی بد قسمتی ہے کہ چوپائے بھی اپنے اگلے پیروں کو ہاتھ سمجھتے ہیں؟“ سلطان شاہ کراہا۔

دھیمی آواز میں کہا ہوا وہ فقرہ ویرا کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ اس سے پہلے کہ وہ سلطان شاہ پر دوبارہ پرستی میں بول پڑا ”راہن مائرے ہاتھوں اپنی اکلوتی بیٹی کے قتل کی خبر نے پنڈت منوہر لال کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔“

”راہن مائرے اپنے رابطے کا اعتراف اس نے کل ہماری کارروائی سے پہلے ہی کر لیا تھا۔“ ویرا نے میری بات کاٹ کر کہا ”اس سے پہلے شاید ہم موہنی اور رختی کی گفتگو کا کیسٹ حاصل کر چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ گفتگو پنڈت کے اعتراف کے بعد سن گئی تھی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اب پنڈت نے ایک بڑا انکشاف کیا ہے۔ رستم ایرانی بظاہر سیاسی جرائم اور دہشت گردیوں سے دور رہتا تھا مگر وہ خود ”جس“ کا پرانا رکن تھا۔ اسی نے بعد میں پنڈت منوہر لال کو ”جس“ کا رکن بنوایا تھا اور سارا کام اسی پر لا دیا تھا۔“

کا پرانا رکن تھا۔ اور!“

”تم نے زبردست راہ دکھائی ہے“ جلال کی آواز تشکر آمیز تھی ”میرے ذہن میں سارے نکتے آنے لگے ہیں۔ تم کو اب اسی اپریٹس پر میرا اگلا پیغام ملے گا“ اور!“

”تو کیا اس کی ریش اتنی زیادہ ہے کہ یہ کراچی اور اسلام آباد کے درمیان بھی کام کرتا رہے گا؟ اور!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ اتنا طاقتور نہیں ہے مگر میرا کوئی بھی آدمی تمہیں میرے رابطے سے آگاہ کرے گا۔ میں قیمتی مشورے کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔ فی الحال خدا حافظ۔ اور اینڈ آل۔“

اپریٹس خاموش ہو گیا۔ گاڑی ہمارے گھر کے لیے آخری موڑ لے چکی تھی۔ شاید سلطان شاہ کے کان اول خان کی گاڑی کے انجن کی آواز سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس نے فوراً ہی پچانک کھول دیا اور اول خان نے گاڑی پر چڑھ کر لے جا کر بند کر دی۔

”بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ کے بعد تم دونوں کی سرگرمیاں اچانک ہی کچھ پراسرار ہو گئی ہیں“ سلطان شاہ نے ہمارا استقبال کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”مار دھاڑ کے مقاصد بجز انہوں تو اس سے زیادہ آسان کام کوئی اور نہیں ہوتا۔ بامقصد کارروائی کے لیے جواز پیش کرنے میں دانتوں پیسنے آجاتا ہے“ میں نے کہا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی ہمارا ویرا سے سامنا ہوا۔ اس نے دانستہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے اول خان سے مخاطب ہو کر کہا ”سننا ہے کہ آئی بی والے تمہارے جوڑوں میں بیٹھتے جا رہے ہیں؟“

ویرا کے استہزائیہ لہجے پر اول خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور جواب دیا ”ہر ادارہ ایس بی ایف ہوتا ہے اور نہ ہر اہل کار اول خان۔ آئینی اور قانونی اداروں کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ انہیں دھیان میں نہ رکھا جائے تو انتہائی نیک نیتی سے کام کرنے والوں کو بھی لینے کے دیے پڑ جاتے ہیں۔“

”اب تو شاید راہن مائر کا معاملہ چل نکلا ہو گا۔ وہ ان کا بہت اہم آدمی تھا۔“ ویرا نے ڈرانگ روم میں نشست سنبھالتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی۔

”سب ہی کچھ ساتھ ساتھ چل رہا ہے“ اول خان نے بے پروائی سے جواب دیا ”راہن مائر، پنڈت منوہر لال اور سینئر رستم ایرانی۔ ان واقعات سے اڑنے والی دھول رفتہ رفتہ ہی پیٹھے گی۔“

تر سمجھتا تھا۔“

ویرا نے میری بات درمیان سے کاٹ دی ”اپنے اس اقدام پر اسے کسی باز پرس اور کیسا خوف؟“ میں نے ہنس کر

جواب دیا ”وہ نہ دردتہ بہرہوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور ارن کو مارنے کے لیے اسے بس ڈوریاں ہلائی پڑیں اور وہ ایک حادثے میں مارا گیا۔ حادثے کا ذمے دار فرار ہو گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اولی کی موت میں رستم کا ہاتھ تھا۔“

”اس نے تمہیں کام ہو جانے کی اطلاع دی تھی۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے رستم کو دس لاکھ روپے کی خطرہ رقم اس قتل کے معاوضے کے طور پر ادا کی تھی“ ویرا نے اضطراب سے کہا۔

”اس نے ڈینی سے کوئی لین دین نہیں کیا۔ پورا سودا رستم اور ملک ممتاز کے درمیان ہوا۔ ایسے سودوں میں کوئی فریق زبان نہیں کھولتا۔ ایک کی نشان دہی ہوتی ہے تو ساری گردنیں خود بہ خود گھٹنے میں آتی چلی جاتی ہیں۔“ اس بار اول خان نے میرا ساتھ دیا تھا۔

”پھر بھی میں یہ بات من و عن تسلیم نہیں کر سکتی۔ مجرمانہ سازشوں میں مالی مفاد کے ساتھ ساتھ جذباتی وابستگی بھی شامل ہوتی ہے“ ویرا مصر رہی ”اس نے ہر چیز کو بالائے طاق رکھ کر اور ارن کے قتل پر آمادگی کیوں ظاہر کر دی۔ اسے تو بھڑک کر تم پر ہاتھ ڈال دینا چاہیے تھا۔“

”یہ سب تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم رستم کے ساتھ معاملات طے کرنے میں شامل نہیں تھیں“ سلطان شاہ گفتگو میں پہلی مرتبہ دخل دیتے ہوئے بولا ”اس کے دماغ پر اپنے بنائے ہوئے اصولوں کا خط بھی سوار تھا۔ اس وجہ سے اسے آخری لمحات پر معلوم ہوا کہ ہم اس کے ذریعے کس شخص کو راستے سے ہٹانے کے خواہاں تھے۔ اور ارن کے نام پر وہ چونکا تھا لیکن انکار نہیں کر سکا۔“

”وہ آخر تک کتنا رہا کہ ملک سے باہر کسی کو ٹھکانے لگانا مشکل کام ہے“ ویرا کو اس بارے میں ہماری بتائی ہوئی ساری جزئیات یاد تھیں ”وہ اور ارن کو نہ مارنا چاہتا تو بعد میں کسی بھی مضبوط عذر کے ساتھ تمہیں سات لاکھ روپے لوٹا کر معاہدہ ختم کر سکتا تھا۔“

ویرا کے ان الفاظ نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کیا رستم خود بھی کسی وجہ سے اور ارن کو ناپسند کرتا تھا اور اسے مار دینا چاہتا تھا؟

اس وقت تک میں بس ایک ہی لائن پر سوچ رہا تھا کہ

وہ انکشاف سنتے ہی ویرا اپنی جگہ پر اچھل پڑی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے کہ پنڈت نے اپنی کھال بچانے یا تم سے کچھ رعایتیں حاصل کرنے کے لیے یہ کمائی گھڑی ہو۔“

”تم واقعات سے پوری طرح باخبر نہیں ہو اس لیے ایسا سوچ رہی ہو“ اول خان نے اس کی گھنج کی ”پنڈت نے یہ انکشاف انتہائی مایوسی اور بے بسی کے عالم میں کیا ہے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اسے ہماری طرف سے ذرا بھی رعایت نہیں مل سکے گی۔“

”وہ پرلے درجے کا مکار اور جھوٹا ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ رستم کا موساد یا ”جس“ سے کوئی تعلق تھا۔ پنڈت نے تم کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے“ ویرا نے پُر زور تجھے میں کہا۔

”اس نے ہمارے سامنے یہ اعتراف کیا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا“ اول خان نے بے بسی سے کہا ”پنڈت ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی برداشت کی حد تک سب کچھ خاموشی سے سہہ لیتے ہیں لیکن جب ڈوبنے لگتے ہیں تو اپنے ساتھ سب کچھ لے ڈوبتے ہیں۔“

”تمہارے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟“ میں نے ویرا سے سوال کیا۔

”بہت سیدھی اور قابل فہم بات ہے۔ اس خطے میں سی آئی اے، موساد اور راکے بیشتر مفادات یکساں بلکہ مشترک ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رستم کے موساد اور ”جس“ سے گہرے رابطے ہوں اور اسے یہ علم نہ ہو کہ اور ارن ڈی ہنٹ یہاں کس مشن پر کام کر رہا تھا“ ویرا نے اعتراض کیا۔

”تمہارا یہ نکتہ بہت ذہنی اور اہم ہے“ اول خان نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”اور ارن بہت اہم آدمی تھا۔ اگر ہم پنڈت کی بات کو درست مان لیں تو رستم کے ذریعے اور ارن کے قتل کا کیا جواز پاتی رہ جاتا ہے۔ وہ آخری لمحات پر بھی کوئی نہ کوئی حیلہ کر کے فرار کی راہ اختیار کر سکتا تھا۔“

”اس کا صرف اور صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے“ میں نے جواب دیا ”رستم دوسروں کی طرح موساد اور ”جس“ کا ایک عام کارندہ نہیں تھا“ اس کی اپنی ایک حیثیت اور شناخت تھی۔ اسے اپنی اس شناخت پر گھمڈ تھا۔ وہ ہر قیمت پر اپنی اس شناخت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔“

”کیا اور ارن ڈی ہنٹ جیسے نادر روزگار سازشی کی قیمت پر بھی؟“ میری وضاحت پر ویرا کی آنکھیں حیرت سے

اس کی پیشانی پر جا چڑھیں۔

”اپنے سامنے وہ اور ارن سمیت ہر شخص کو حقیر اور کم

ہو گا کہ اس کا بڑا وقت آ پہنچا ہے۔ وہ ایسی بڑی گھڑی تھی کہ شر کے مقدر خالقوں میں گہرا اثر و رسوخ رکھنے والے رستم کو کانوں کان جھٹک بھی نہیں مل سکی تھی کہ اس کے گھبراہٹ فکر کشی کی تیاہیاں ہو رہی تھیں۔

شاید رستم نے بھی بحران کے ان لمحوں میں یہی سوچا ہو گا کہ آنے والوں کی رسد کی ہر راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ بسیرا میں محصور ہے۔ مقابلہ کیا تو چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند روز تک مزاحمت کر سکے گا اور پھر لڑتے لڑتے بے خبری میں مارا جائے گا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کے بعد اس کے گھر کی عورتوں کا کیا حال ہوتا اور قانون ایک مردہ مجرم کے اکلوتے نواسے کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔

شاید اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کے بعد اس کا کلوتا اور لاڈلا نواسا سر جھکا کر ندامت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے اور ساری عمر اپنے نانا کو کوستا رہے جس نے اسے رسوائیوں کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ رستم کے لیے اس وقت دو میں سے کسی ایک راہ کا ارادی انتخاب ضروری تھا۔ یقین اور بے یقینی۔ امید اور ناامیدی۔ یقین اور امید کی ہر راہ اسی لمحے مسدود ہو گئی تھی جب اس نے اپنی دور بین سے پہلا منظر دیکھا تھا۔ اس کے سامنے ہر سوبے یقین اور ناامیدی کے گھور اندھیرے پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا اور پھر بہت سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کر لیا۔

رستم کو اپنی انفرادیت اور بالادستی عزیز تھی۔ اپنے ایک روپ میں وہ موسادیا جس کا بیجٹ تھا اور دوسرے روپ میں نقد معاوضہ لے کر بڑے جرائم کی منصوبہ بندی کرنے والا ایک سفید پوش مجرم تھا۔ جس کے جرائم کے بہت سے خاموش گواہ موجود تھے مگر اس پر یا اس کے کسی خاص آدمی پر کبھی کوئی جرم ثابت نہیں کیا جاسکا تھا۔

اور اس زندہ تھانہ رستم ایرانی کی جواب دہی کے لیے دنیا میں موجود تھا۔ ان دونوں کے جسم واصل ہونے کے بعد اس بارے میں بس قیاس آرائیاں ہی کی جاسکتی تھیں لیکن دیرانے ایک امکان کی نشان دہی کر کے مجھے نئی راہ بھادی تھی۔

پنڈت منوہر لال زندہ تھا۔ وہ رستم کا قریبی ساتھی تھا۔ اگر اسے یہ بتایا جاتا کہ نبی دہلی میں اور ابن ڈی ہنٹ کی موت کے لیے حادثے کا اسٹیج رستم نے سجایا تھا تو وہ دیراکے چمٹتے ہوئے سوال کا کوئی ٹھوس جواب دے سکتا تھا۔

ایسے مجرم خود کو دنیا کی ہر طاقت اور قانون سے ماورا سمجھتے ہیں اور اپنی کلمات میں آئے ہوئے افراد کے تحفظ کے بارے میں ہر وقت پریشان رہتے ہیں۔ انہیں یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ ان پر کوئی بڑا وقت آیا تو ان کے سارے پیارے اور دلارے ناقابل برداشت مصائب میں گھر جائیں گے۔

کے لیے کارروائی کی۔ ان کا ہدف رستم نہیں، پنڈت تھا۔ اسے پکڑ کر وہ لوٹ آئے۔

”رستم نے اپنے ملاقاتیوں کی وڈیو اور آڈیو فلمیں بنانے کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔“ سلطان شاہ نے سوچتے ہوئے کہا ”مجھے یقین ہے کہ وہ ان فلموں کو محفوظ رکھتا ہوگا۔ ان میں ہماری فلمیں بھی ہوں گی۔ وہ کسی غلط ہاتھ میں پہنچ گئیں تو مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔“

”اوہ!“ اول خان بے فکری سے ہنس پڑا ”تم بھی ویرا کی طرح گھما پھرا کر بات کرنے لگے ہو۔ یہ مسئلہ شروع سے میری نظروں میں تھا۔ مواصلاتی ماہرین کی ایک ٹیم نے بھرا کا وہ پورا سسٹم اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ کئی کیمروں اور سٹر سے زیادہ حساس ٹائیکروفونز پر مشتمل تھا۔ ان میں کوئی فلم نہیں تھی۔ سارے کیسٹ بنے اور کورے تھے۔“

”ہو سکتا ہے کہ ریکارڈ کیے ہوئے کیسٹ وہ کسی محفوظ مقام پر پوشیدہ رکھتا ہو۔“ سلطان شاہ نے قدرے بے تابانہ انداز میں اس کی بات کاٹ دی ”پرانی فلمیں کیمروں یا ریکارڈرز میں نہیں چھوڑی جاسکتیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے الیکٹرو میگنیٹک شیلڈ کا سراغ لگانے والے حساس آلات استعمال کیے ہوں۔ مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ وہاں کوئی مشتبہ کیسٹ نہیں تھا۔ رستم کی خواب گاہ کے پیچھے ایک جدید برقی بھٹی بھی پائی گئی تھی۔ اس کی تین بیسے جانے والے فضلے میں پلاسٹک کے بچے چھ اجڑا پائے گئے ہیں۔ شاید وہ اس معاملے میں اپنے اصول کا پابند تھا۔ معاہدہ پورا ہوتے ہی کیسٹ تلف کر دیتا تھا۔“

”طے شدہ معاوضہ ادا نہ کرنے والوں کے کیسٹ پھر بھی موجود ہونے چاہئیں تھے۔“

”اس کے گاہکوں میں وعدہ خلافی کرنے والوں کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہوگا۔“ میں نے سلطان شاہ کو سمجھایا ”طے شدہ معاوضہ ادا نہ کرنے والوں کے کیسٹ وہ ان کے حریفوں کے ہاتھ بیچ کر اپنا خسارہ پورا کرنے کی بات خود ہی بتا چکا تھا۔“

”یہ بات بہت شدت سے میرے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ میں نے تمہارے سامنے رکھ دی۔“ سلطان شاہ نے بے پروائی سے اپنے شانے اچھال کر کہا ”اگر تم دونوں مطمئن ہو تو ٹھیک ہے۔“

اول خان کچھ وقت گزار کر واپس چلا گیا۔ اس کا رخ اپنے گھر کی جانب تھا جو گلشن اقبال کے اس علاقے سے زیادہ دور نہیں تھا۔

میں یورج سے اسے رخصت کر کے واپس آیا تو ویرا

بیٹھا تھا مگر وہ اس کے ذہن میں کارفرما نفسیاتی پیچیدگیوں کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔ میں ویرا کی نشان دہی سے پہلے یہی سوچتا رہا کہ ایسے ہی کسی ذہنی پیچاک سے دوچار ہو کر رستم نے اور اسن ڈی ہنٹ کو مروانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”تمہارے سوال کو ٹالنا نہیں جاسکتا۔“ میں نے ویرا کے سامنے اعتراف کیا ”یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ اگر رستم واقعی ہوسلویا۔“ جس کا ایجنٹ تھا تو کوئی ناگزیر مجبوری درپیش نہ ہونے کے باوجود اور اسن ڈی ہنٹ کو مارنے پر کیوں آمادہ ہو گیا۔“

”تم نے بتایا تھا کہ بسرا میں رستم کی خودکشی اور وہاں سے پنڈت منوہر لال کی بازیابی کے بعد مزید کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ آپریشن میں حصہ لینے والے وہاں کے ملازمین وغیرہ کو ہدایات دے کر لوٹ آئے تھے۔“ سلطان شاہ نے اول خان سے سوال کیا۔

”رستم زندہ گرفتار ہوا ہوتا یا پنڈت منوہر لال ہمارے ہاتھ نہ آتا تو بھرا کا تنکا کا تنکا الٹ پلٹ کر رکھ دیا جاتا۔ ان دونوں قصوں کے منٹ جانے کے بعد وہاں کسی کارروائی کا کیا جواز رہ جاتا تھا؟“ اول خان نے جوابی سوال کیا اور پھر کہا ”اس وقت ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ”جس“ کا رکن ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ ڈائری لکھنے کا عادی رہا ہو۔ اس کے ذاتی ریکارڈ سے بہت کچھ ملنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ کچھ ہاتھ آتا یا نہ آتا، کوشش ضروری تھی۔“ سلطان شاہ نے اصرار کیا۔

اول خان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا ”تم بھول رہے ہو کہ اس آپریشن میں ہمارا کوئی رول نہیں تھا۔ ہم خاموش تماشا ہی تھے۔“

”آپریشن کی نگرانی تجربے کار افسران کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ امکانات کیوں نظر انداز کر دیے؟“

”میں ان کا دفاع نہیں کر رہا لیکن سچ پوچھو تو میں ان کی جگہ ہوتا تو میں بھی وہی کچھ کرتا جو انہوں نے کیا۔ پنڈت کو پکڑ کر بھرا سے لوٹ آتا۔“ اول خان نے جواب دیا۔

”مگر کیوں؟ کیا انہیں اس پورے کیس کی اہمیت کا علم نہیں تھا؟“ ویرا نے پوچھا۔

”ان کی معلومات بہت محدود تھیں۔ وہ ہمارے پیچھے ہوئے تین کانڈوں اور ان کے مالک کے نام سے آگے کچھ نہیں جانتے تھے۔ مل ایب کے نمبر کفرم کرنے کے بعد انہوں نے کسی لمبے چوڑے ہوم ورک کے بغیر محدود مقصد

اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ سلطان شاہ شاید ڈرائنگ روم میں ہی ٹیلی وژن کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

میں راہ داری میں ویرا کے سامنے رک گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں مگر اس نے زبان سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ بس خاموش اور سپاٹ نگاہوں سے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔

”دروازے پر کیوں کھڑی ہو؟“ آخر کار مجھے خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ وہ سکوت توڑنا پڑا۔

”کیوں.....؟ کیا یہاں کھڑا ہونا منع ہے؟“ اس نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

”دروازہ کسی بھی طرف گزر جانے کے لیے بنایا جاتا ہے۔“ میں نے اپنی غیر ارادی مسکراہٹ کو چھپائے بغیر ذومعنی لہجے میں کہا ”دروازے پر وہی لوگ رکتے ہیں جو اندر جانے یا لوٹنے کے بارے میں متذبذب ہیں جیٹا ہوں۔ یہ تمہارا اپنا کمرہ ہے۔ نہیں یہ متذبذب کیوں ہے؟“

”روم میں جب جی لائیو میرا تالیق تھا تو امرا کی محفلوں میں رسائی سے پہلے میں سرشام یوں ہی دروازے پر آکھڑی ہوتی تھی۔۔۔ ذرا سی بن سنور کر۔ آج نہ جانے کیوں وہی سنہرے دن یاد آ رہے ہیں۔ اندر جاتے جاتے قدم دروازے پر بے اختیار رک گئے۔“

”وہ شاید تمہاری زندگی کا تاریک ترین دور تھا۔ جب تمہیں یہ سکھایا جا رہا تھا کہ ایک خوب رو لڑکی اپنے کن حروں اور ہتھیاروں سے مردوں کو اپنا غلام بنا سکتی ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ اس کا جواب سن کر میری مسکراہٹ ایک بہ یک کادور ہو گئی تھی۔

”وہی تو زندگی کا اصل حسن تھا۔“ ویرا نے مسکراتے ہوئے کہا ”جی لائیو نے اذان مرسیاؤں کو سمجھنے کی سکھایا تھا کہ مردوں کی بھیڑ میں تم کسی کو نہ چاہو اور وہ سب ٹوٹ کر تمہاری قربت کو ترستے ہوں تو سمجھ لو کہ تم کامیاب لڑکی یا عورت ہو پھر۔“

میں نے غصے کے عالم میں اس کی بات کاٹ دی ”تم کیا بے ہودہ اور غلیظ موضوع لے بیٹھیں۔۔۔“

اس نے بھی مجھے اپنی بات پوری نہیں کرنے دی اور درمیان میں کہا ”وہ کہا کرتا تھا کہ پھر تم اس بھیڑ میں سے اپنی مرضی کا کوئی خوش نما کھوٹا چن لو“ اس سے کھیلو اور اگلے دن بہت بے رخی سے اپنی پسند تبدیل کر لو۔ چہرے اور کھلونے بدلتے رہیں تو زندگی بہت تیز ہوتی ہے۔“

”تم نے یہ بکواس جاری رکھی... تو میں بہت بڑی طرح پیش آؤں گا۔“ میں نے اپنے بڑھتے ہوئے غصے پر قابو پا کر سرد لہجے میں کہا۔

اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی ”ویسے تم کون سی اچھی طرح پیش آتے ہو جو اب یہ دھمکی دے رہے ہو۔ میرے ساتھ کسی اور کا ذکر سن کر جل بھن رہے ہونا؟“

دوسروں کی موجودگی میں میرے ساتھ اس کا رویہ خاصا بہتر تھا۔ دودن سے میں محسوس کر رہا تھا کہ تنہائی میرا آتے ہی وہ میرے ساتھ تلخی آمیز اور کاٹ دار باتیں شروع کر دیتی تھی۔ اسے کوئی سخت جواب دے کر فضا کو مزید خراب کرنے کے بجائے میں ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔

جاتے جاتے میں نے ڈرائنگ روم میں نگاہ ڈالی تو سلطان شاہ ٹیلی وژن پر وگرام دیکھنے میں مگھو تھا۔ اسے میری آمد کا علم ہی نہ ہو سکا اور میں قائلین پر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں غزالہ بستر پر دراز کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی غزالہ رسالہ ایک طرف پھینک کر بستر پر سیدھی ہو گئی۔ اس نے مسکرا کر کچھ کنا چاہا لیکن میرے چہرے کے بگڑے ہوئے تاثرات دیکھ کر وہ چونک پڑی اور سنجیدگی سے بولی ”کیا بات ہے؟ ابھی تو آپ بہت اچھے موڈ میں اول خان کو الوداع کہنے گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں موڈ کیوں آف ہو گیا؟“

”کبھی کبھی یہ عورت بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔“ میں نے ترشی سے کہا۔

”کیا کہہ دیا اس نے؟ ابھی وہ بھی اچھے بھلے موڈ میں تھی۔“ غزالہ میرے جواب پر حیران رہ گئی۔

”اسے اچانک اپنا ماضی یاد آنے لگا ہے۔۔۔ غلاظت کا کیزا گندگی کے ڈھیر میں خوش رہتا ہے۔ اسے صاف ستھری فضا میں لانے کی کوشش کرو تو وہ ٹھٹھن میں مبتلا ہو کر مرجاتا ہے۔“ میں نے زہر آلود لہجے میں جواب دیا ”میرا دماغ سنک گیا تو میں اس کا سر توڑ دوں گا۔“

غزالہ یوں ہنس پڑی جیسے میں نے کوئی مزاحیہ بات کہہ دی ہو ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے دعوے کو اتنی سرعت سے عملی جامہ پہنا بیٹھے گی۔ اس کے سامنے ظاہر بھی نہ ہونے دیں کہ اس کی کسی بات نے آپ کو مشتعل کر دیا ہے۔“

”میرا غزالہ کھل رہی ہے اور تمہیں یہ ہو گیا کہ کیا کہہ رہی

مجھے بھگتی پڑے گی۔ آپ کو بھڑکا کر وہ مزے سے کہیں پاؤں
پارے بیٹھی ہوگی۔“

”ٹھہرو میں دیکھتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔“ میں نے اس
کے شانے پر چھکی دیتے ہوئے بستر چھوڑ دیا ”میں اسے
احساس دلاؤں گا کہ کسی کا موڈ بگاڑنا کس قدر آسان ہوتا
ہے۔“

”پلیز!۔“ غزالہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ”وہ جو کرتی پھرتی ہے،
اسے کرنے دیں۔ آپ اسے تنگ نہ کریں۔ وہ آپ کے
بارے میں بہت حساس ہے۔ ہر بات اپنے دل پر لیے لیتی
ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ غزالہ کے ان فقروں پر میں نے
اپنے دل میں تقویت سی محسوس کرتے ہوئے کہا ”پھر بھی
اسے ہلکا سا سبق سکھانا ضروری ہو گیا ہے۔“

میں غزالہ کو خواب گاہ میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔
دروازہ کھلتے ہی میرے کانوں میں ویرا کی چلتی ہوئی آواز آئی
اور میں چونک پڑا کیونکہ اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں موجود
تھی۔

”... میں کسی دن ہاتھ پیر باندھ کر پوری بوتل تمہارے
حلق میں اندر دوں گی۔“ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے
ہوئے ویرا کا وہ آخری فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔

سلطان شاہ تپے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے کوئی
جواب دینے والا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ بُرا سا منہ
بناتے ہوئے اپنے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”خدا کے لیے! اسے کسی باڑے میں بند کر دو۔ یہ ہر
وقت تنگ کرنے لگی ہے۔“ سلطان شاہ نے دونوں ہاتھ جوڑ
کر مجھ سے التجا کی۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے کمرے کے وسط میں جگہ
سنبھال کر خوش دلی سے پوچھا۔

”یہ پٹھان ہے۔ میں اسے سمجھا رہی تھی کہ اس کا ج
ایک دو پیسگ لینے سے اتنا نشہ بھی نہیں ہوتا جتنا عمدہ چرس
سے بھری ہوئی ایک سگریٹ پینے سے ہوتا ہے۔“ ویرا اپنے
ہاتھ میں موجود گلاس کو فضا میں قدرے آگے لہراتے ہوئے
بولی۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ چرس صرف پٹھان پیتے
ہیں۔ پٹھانوں سے کہیں زیادہ سندھی، پنجابی اور بلوچ نشہ
گرتے ہیں بلکہ باہر نکل تو یورپ اور امریکا میں مسکن قدرتی
پیداوار کے طور پر یہ نشہ بہت زیادہ مقبول ہے۔ ہالینڈ میں اس
کی خرید و فروخت کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ ہر ڈچ پولیس کی

تھی وہ؟ کیا دعویٰ ہے اس کا؟“ غزالہ کے غیر معمولی رد عمل پر
میری کھوپڑی بھٹا کر رہ گئی۔

”وہ وہی کہہ رہی تھی جو آپ بتا رہے ہیں۔ بعض
اوقات وہ مذاق میں بھی حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ حیرت ہے
کہ آپ بھی اس کے دھوکے میں آ گئے۔“

”میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا دعوے
کر رہی تھی؟“

”کہہ رہی تھی کہ وہ آپ کے مزاج پر کامل اتھارٹی
ہے۔ جب چاہے، چنگی بجاتے ہیں آپ کا اچھا خاصا موڈ برباد
کر سکتی ہے۔“ میرے تئیر دیکھ کر بھی غزالہ پوری طرح سنجیدہ
نہیں ہو سکی تھی۔

”موڈ برباد کرنے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں
پڑتی۔ ایک ڈھکی چھپی گالی بھی کسی شریف آدمی کا ذہن
پر آئندہ کر سکتی ہے۔ وہ میرے خلاف تم سے ایسی باتیں کیوں
گرتی ہے؟“

میرے تنکھے سوال پر غزالہ سنبھلنے پر مجبور ہو گئی اور
جلدی سے بولی ”وہ کچھ نہیں کہتی“ آج میں نے ہی اس سے
پوچھ لیا تھا کہ وہ آپ سے کیوں لڑتی رہتی ہے۔“

”اور اس نابکار عورت کو میرے خلاف زہر اگلنے کا
موقع مل گیا؟“ میں نے آنکھیں نکالیں۔

”بب۔۔۔ بس۔۔۔ پھر باتیں چل نکلیں۔“ غزالہ نے
بھکاتے ہوئے بتایا ”اس کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا
تھا کہ آپ کی طرف سے اس کے دل میں غبار ہے۔ اس کے
برعکس وہ اب بھی آپ کو اپنا بہترین دوست سمجھتی ہے۔“

”اور اسی وجہ سے میرا موڈ تباہ کرنے کے دعوے کر رہی
تھی۔“ میں نے غزالہ کی بات کاٹ کر درمیان ہی میں لقمہ
دیا۔

”کسی بات پر میں نے ہی کہا تھا کہ آپ بہت خوش مزاج
ہیں۔ ہر وقت شگفتہ موڈ میں رہتے ہیں اور دوسروں کی
خوشیوں کا خیال رکھتے ہیں۔“ غزالہ نے معاملے کی سنگینی
بھانپتے ہوئے کہا ”اس پر وہ بولی تھی کہ وہ جب چاہے ڈرائی
بات پر آپ کو برہم کر سکتی ہے۔“

میں نے بے اختیار غزالہ کو اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا
اور مسکراتے ہوئے کہا ”وہ جو کچھ کہتی ہے، اسے کہتے دو۔
اس کی باتوں پر تم کیوں سہمی ہوئی ہو۔“

میرے رویے کی اچانک تبدیلی پر غزالہ کے ہونٹوں
سے ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا
غصہ ٹھنڈا ہوا۔ میں ڈر گئی تھی کہ آج ویرا کے مذاق کی سزا

گرفت کے کسی خوف کے بغیر اپنی جیب میں چرس کا ایک پلوا لے کر گھوم سکتا ہے۔“

دیرانے چکر میری طولانی تقریر درمیان ہی سے اچک لی ”ہم چرس کے کاروباری امکانات پر غور نہیں کر رہے تھے، بات صرف ایک گلاس اسکاچ پینے کی تھی۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ سلطان شاہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ وہ شراب کے گلاس کو پاک کیے بغیر اس میں پانی پینا بھی حرام سمجھتا ہے تو تم اسے کیوں چراتی ہو؟“ میں نے ویرا سے پوچھا۔

”جب تمہیں میرا جواب معلوم ہے تو بار بار اصرار کرنے سے فائدہ کیا ہے؟“ سلطان شاہ نے بھنا کر کہا۔

”چھر پر بوند بوند پانی گرتا ہے تو وہاں بھی خفیف سا گڑھا پیدا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دن تم اپنی ناک چٹکی سے دباکر پورا گلاس غماغٹ چڑھا جاؤ۔“ بات پوری کر کے ویرا نے اپنے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”یہ روم نہیں ہے۔“ میں نے ویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا ”سلطان شاہ کو اتنا نہ ستایا کرو کہ یہ بدک جائے۔ بعض کھلونے اتنے نازک ہوتے ہیں کہ ہاتھ میں آتے ہی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اسی قبیلے کا کوئی فرزند معلوم ہوتا ہے۔“

ویرا نیم بذیانی انداز میں ہنسی پھر بولی ”میں یہی بتانا چاہ رہی تھی۔ کھلونوں کا دور روم میں رہ گیا۔ یہاں رہ جانے کے بعد تو میں تمہارے لیے کھلونا بن کر رہ گئی ہوں۔“

”یا مظلما العجائب!“ سلطان شاہ چھت کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا ”یہ ہمک کر ہوش کی باتیں کرتی ہے۔ ہوش میں ہوتی ہے تو ہنسی ہنسی باتیں کرنے لگتی ہے۔“

”یہ تمہاری بھول ہے ویرا۔ تمہیں کسی نے کھلونا بنایا ہے نہ سمجھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کھلونے کھینے والے کے لیے بے جان ہوتے ہیں۔“ وہ مزید ایک گھونٹ لے کر بولنے لگی ”وہ ان سے کھیلے یا تو ذکر کوڑے دان میں پھینک دے۔ سب کچھ آہی کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر میں کھلونا نہیں ہوں تو یہاں میری مرضی کیوں نہیں چلتی؟ جو میں چاہتی ہوں، وہ کیوں نہیں ہوتا؟“

”تمہاری مرضی کی ہر جائز بات ہو کر رہتی ہے۔ اب تم خود ہی چاند کو پانے کی آرزو کرنے لگو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے تھیلے میں ادھوری رہ جانے والی بات سلطان شاہ کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم۔۔۔ اور سلطان شاہ۔۔۔ کیا تم دونوں خود کو چاند سمجھتے ہو؟“ اس کا سوال ایک تیز بذیانی سرگوشی کی صورت میں ڈرائنگ روم میں گونجا۔

”یہ سوال کر کے تم اعتراف جرم کر رہی ہو۔ کیا تم ہم دونوں کو حاصل کر لینا چاہتی ہو؟“ میں نے بھی اسی جارحانہ انداز میں ویرا سے سوال کیا۔

”ارے ذہنی! تم بڑے سبک دل ہو۔“ وہ گہرا سانس لے کر صوفے کی پشت گاہ سے ٹک گئی ”میں بے چاری، ایک بے نام و نشان لڑکی جسے اس کے باپ نے بھی اپنی بیٹی نہ کہا، تم دونوں سے کیا چاہ سکتی ہوں؟ میرا خلیقہ خدا تمہاری اور غزالہ کی جوڑی کو سدا شادو آباد رکھے، سلطان شاہ کا گھر آباد کرے۔ تم دونوں مجھے بہت عزیز ہو۔ یہ بات تمہارا دل بھی جانتا ہے۔ میری خواہش بس اتنی سی ہے کہ مجھے تھوڑی سی عزت کی نگاہ سے بھی دیکھ لیا کرو۔ میرے دل کے پار اتر جانے والے لڑوے کیسے سوالات مت کیا کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم غزالہ کی امانت ہو۔ میں تمہیں پانے کی آرزو کیسے کر سکتی ہوں۔ تمہارے مذہب میں چار شادیوں کی اجازت ہے مگر میں مسیحی ہوں۔ ہم ایک وقت میں ایک بیوی اور ایک شوہر کے فلسفے والے لوگ ہیں۔ یہ بھول جاؤ کہ میں خائن ہوں۔۔۔“

وہ جذباتی ہونے لگی تھی۔ سلطان شاہ نے بوکھلائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے ویرا کی بات وہیں سے اچک لی ”تم بلاوجہ بات کو بڑھا رہی ہو۔ ہم سب اپنے اپنے دلوں کی گمراہیوں سے تمہاری عزت کرتے ہیں۔ یہ پابندی ضرور ہے کہ یہاں روم والی آزادیاں نہیں ہیں۔“

”ان آزادیوں کو میں ٹھوکر مار چکی ہوں۔“ اس نے ہوا میں واہنی ٹھوکر چلا کر کہا ”غزالہ کو دیکھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آچکی ہے کہ بے مہار آزادی مرد کو طے یا عورت کو، نقصان سراسر عورت کا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے تم سے فاصلے کی بات کی تھی۔ وہ فاصلہ آج بھی جوں کا توں ہے۔ تم نے اس سمت میں ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔“

موسم خوشگوار ہونے کے باوجود میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ غلط میں ہونے والی گفتگو کو ویرا نے تحفل میں چھیڑ دیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا ”عملی طور پر تمہاری وہ شکایت بے بنیاد تھی مگر تم جلد ہی تبدیلی محسوس کرو گی۔ یوں ہر ایک سے لڑنے بھڑنے سے ایسی باتیں حل نہیں ہوا کرتیں۔“ میرے لیے ویرا کی شکایت بہت واضح اور کھلی کھلی تھی

بتا کے بولا ”اسی لیے میں نے اپنا فیصلہ سنایا ہے۔“
چند منٹ بعد ویرا اُٹرے لائی تو اس میں ڈمپل کی صراحی
نما خوب صورت بوتل اور آکس پاٹ کے ساتھ ایک خالی
گلاس بھی موجود تھا۔

”تمہارا گلاس تو پہلے سے یہاں موجود تھا، دوسرا گلاس
کس کے لیے لائی ہو؟“ غزالہ نے تجسس لہجے میں اس سے
پوچھا۔

وہ ہنس کر دھیرے سے بولی ”دو گلاس سامنے موجود ہوں
تو اکیلے پن کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ یہ خوش گمانی رہتی ہے
کہ کوئی ابھی ابھی گلاس خالی کر کے واش روم گیا ہے۔“
”تمہاری کا احساس اسی قدر ستاتا ہے تو تم شادی کیوں
نہیں کر لیتیں؟“ غزالہ نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

ویرا اپنے گلاس میں اسکاچ انڈیل رہی تھی۔ اس
طرف سے توجہ نہائے بغیر بولی ”اول خان شادی شدہ ہے،
ڈینی کو مکاؤ کے ڈون نے تمہارے پلے پاندھ دیا، سلطان شاہ
شادی کے قابل نہیں ہے۔ حالات سازگار ہوں اور اس
نکون سے نکل کر لوگوں سے میل جول کا موقع ملے تو کسی نہ
کسی کا انتخاب کر ہی لوں گی۔ میرے لیے یہ مسئلہ اتنا اہم
نہیں ہے۔“

اس کے سرسری انداز سے بھی ثابت ہو رہا تھا کہ اس
نے غزالہ کے سوال کو ذرا اہمیت نہیں دی تھی مگر اس کا
تھیکا جواب سلطان شاہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ مٹھیاں
بھیچ کر صوفے سے اٹھا اور پیر پٹتا ہوا، ڈرائنگ روم سے
نکلنا چاہا۔

”اسے بیٹھے بیٹھائے کیا ہو گیا۔“ قالین پر سلطان شاہ
کے جوتوں کی دھمک نے ویرا کو چونکا دیا۔ ویسے بھی وہ اپنے
گلاس میں مقررہ مقدار انڈیل چکی تھی۔
”تمہارا جواب اسے پسند نہیں آیا۔ وہ ناراض ہو کر گیا
ہے۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔

”جو آدمی عورت کے قرب سے بوکھلا کر بُری طرح بدکنے
لگتا ہو، اس کے بارے میں اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ شادی تو
دور کی بات ہے، میں اس سے دوستی کرنے میں بھی کامیاب
نہیں ہو سکی۔“

”مگر میں اسے رضامند کر لوں تو کیا تم واقعی اس سے
شادی کر لو گی؟“ غزالہ نے حیرت اور بے اعتباری کے لٹے
جلے تاثرات کے ساتھ ویرا سے سوال کیا۔

”کیا بات کرتی ہو؟“ ویرا کا منہ بن گیا ”پہلے اسے
عورتوں کے ساتھ ملنے جلنے کے آداب سکھاؤ۔ اگر وہ میرے

مگر اس نے الفاظ کا موزوں انتخاب کیا تھا۔ اس کی پوری
بات سلطان شاہ کے پلے پڑی نہ میری بات اس کی سمجھ میں
آئی اور اس نے احتجاج کر ڈالا ”اب تم دونوں نے ہی ہنسی
بھکی باتیں شروع کر دی ہیں۔ جو میرے سر پر سے گزر رہی
ہیں۔“

ویرا نے آخری بڑا گھونٹ لے کر اپنا گلاس خالی کر دیا۔
اسی وقت غزالہ ہنستی ہوئی وہاں آگئی ”میں اسے ہنسی
باتیں ہو رہی ہیں۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔“

”ڈینی سے سنو!“ ویرا نے اسے آنکھ مار کر آسودہ لہجے
میں کہا ”میں اپنا سہ خانہ بیٹیں اٹھلائی ہوں۔“

”اس وقت وہ چھوٹی موٹی بنی ہوئی ہے۔“ اس کے چلے
جانے کے بعد میں نے سرگوشیاں لہجے میں غزالہ کو ہدایت دی
”اس سے زیادہ چھیڑ چھاؤ نہ کرنا۔“

”وی نہیں، اس وقت تم بھی عجیب باتیں۔“ سلطان
شاہ نے اپنی جھوک میں بولنا شروع کیا مگر میری آنکھیں دیکھ
کر وہ یکایک خاموش ہو گیا۔

”وہ مجھ سے شکوہ کر رہی تھی کہ اب گھر میں پیتے ہوئے
وہ خود کو زیادہ ہی اکیلا محسوس کرنے لگتی ہے۔“ غزالہ کے
لہجے میں ویرا کے لیے وافر ہمدردی موجود تھی ”آپ نے بے
نوشتی بہت کم کر دی ہے مگر ترک نہیں کی۔ کبھی کبھار اس بے
چاری کا ساتھ بھی دے دیا کریں۔“

”یہ کیا کہہ دیا تم نے!“ سلطان شاہ نے اپنی پیشانی پر
ہاتھ مار کر کہا ”اب یہ دونوں باری باری ایک دوسرے کا
ساتھ دینے کے بہانے بوتل کے گرد بیٹھے نظر آئیں گے۔“

”جس طرح اڑیل سانڈ کو مقبوضی سے باندھ کر بوتل
سے کڑوا تیل پلایا جاتا ہے، وہ بالکل اسی طرح سلطان شاہ کو
شراب پلانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“ میں نے مسکرا کر غزالہ کو
آگاہ کیا ”میں اسے ذرا بھی شہ دے دوں تو یہ شان دار واقعہ
کل ہی رونما ہو سکتا ہے۔“

”اول تو وہ مجھے زیر ہی نہیں کر سکتی۔ مارشل آرٹس کے
کچھ کرتب دکھا بھی لیے تو ایسی بُری گھڑی آنے سے پہلے وہ
جہنم واصل ہو جائے گی۔“ سلطان شاہ بوکھلا کر بولا ”تم نے
اسے ذرا بھی اکسایا تو میں زندگی بھر تمہاری صورت نہیں
دیکھوں گا۔“

غزالہ ہنسنے لگی ”تم بلاوجہ ڈر گئے۔ یہ آج کل ویسے ہی
ویرا سے کچھ نہ کچھ رہتے ہیں۔“

”اپنی مصلحتیں یہ دونوں ہی جانتے ہیں۔ پتا نہیں ان
کے دماغ میں کب کیا سوار ہو جائے۔“ سلطان شاہ براسامہ

وہ دونوں گلاس دھیسے سے فضا میں ٹکرائے اور ہم دونوں نے اپنے لب ترک لیے۔

تلخ سیال کا چھوٹا سا پہلا گھونٹ بہت ہیجان انگیز تھا۔ میں نے گلاس رکھ کر سگریٹ سلگائی۔

میں نے لاٹری بھجایا ہی تھا کہ ویرا نے میرے ہونٹوں سے سگریٹ کھینچی، ”تم دوسری سلگالو! تمہارے لبوں سے نکلی ہوئی سگریٹ کے دوکش ہی مجھے آسودہ کر دیں گے۔“

وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی اور آرزو مند تھی کہ میں اسے منانے کے لیے پیش قدمی کروں، اس کی دل جوئی کروں۔ میں نے بس اس کے ساتھ شریک ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ میرے اس اقدام سے اتنی خوش ہو گئی تھی کہ سارے شکوے بھول کر دوبارہ اپنے اصلی رنگ میں آگئی تھی۔

”ذہنی! تمہیں پتا ہے کہ تم کیا ہو؟“ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”ہر شخص اپنے بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم ہی بتا دو۔“ میں نے سگریٹ کا دھواں اس کے چہرے کی طرف اگل دیا۔

”ایک سنگ دل اور محکم پسند مرد۔ تم میں کچھ مانگنے کی عادت نہیں ہے۔ اندر ہی اندر سلستے اور سلکتے رہتے ہو لیکن اپنی آرزو خود بخود پوری ہونے کا انتظار کرتے ہو۔“

میں ہنس دیا ”مجھے پتا نہیں کہ تم اسے میری خوبی سمجھتی ہو یا خامی قرار دیتی ہو۔“

”تم میرے تجربے کو نہیں جھٹلا سکتے۔ میں نے اب تک ہزاروں نکلی بھوکی نظروں کا سامنا کیا ہے۔ ہر مرد کی نگاہوں میں میرے لیے خوشامد کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا ہے۔“ ”اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔“ میں نے گلاس سے دوسرا گھونٹ لیا۔

”نہیں تم ان میں سے نہیں ہو۔ شاید تمہاری یہی انفرادیت مجھے نے ڈولی ہے۔“

”کیسی انفرادیت؟“ میں نے پوچھا ”میں بھی اکثر تمہاری خوشامدیوں کرتا رہا ہوں۔“

”وہ تمہاری مکاری یا شاید نیاز مندی ہوتی ہے۔ خوشامد کرتے ہوئے بھی تمہاری نگاہوں میں پروقار حکم اور مطالبہ ہوتا ہے کہ میں کچھ کہہ رہا ہوں، وہ مان لو۔“

”یہ اطلاع میرے لیے بہت نیک ہے۔ مرد کے لیے اس کا وقار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔“

”جی جی بتاؤ کہ میرے بارے میں تم کیا سوچتے ہو!“ اس

معیار پر پورا اترتا تو مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا۔“ غزالہ کا جوش اسی لمحے ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ ان دونوں کے بارے میں پہلے بھی سوچتی رہی تھی۔

ویرا نے جوں ہی گلاس اٹھایا، میں نے اسے ٹوک دیا ”ٹھہرو! پہلے دوسرا گلاس بھی بنا لو۔“

”کس کے۔۔۔ تمہارے لیے!“ ویرا کی نیلی آنکھوں میں یکایک دیے سے جل اٹھے۔

میں نے مسکراتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تو وہ غزالہ کی طرف متوجہ ہو گئی ”ذہنی کی اس فرمائش پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟“

”تم دونوں کے بارے میں، میں اکثر چشم پوشی سے کام لیتی ہوں۔“ غزالہ نے بردباری سے جواب دیا ”ان کی مرضی کے سامنے میں نے ہیش سر جھکا دیا ہے۔“

ویرا میرے لیے دوسرا گلاس تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ غزالہ اٹھ گئی۔

ویرا کو اس کی رواگلی کا اندازہ ہو گیا تھا مگر وہ غزالہ کی طرف سے انجان بنی رہی۔

”تمہیں اخلاقیاتی اس کو روکنا چاہیے تھا۔“ میں نے غزالہ کے جانے کے بعد ویرا کو ملامت کی۔

”اگر وہ پیشہ ہی جاتی تو کیا ہوتا۔ سچ بات یہ ہے کہ غزالہ بہت سمجھ دار عورت ہے۔ تمہارا موڈ دیکھ کر خود ہی میاں سے ٹل گئی۔ تم نے چند لمحوں کا فاصلہ طے کرنے میں کئی دن کا وقت لیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرا مان رکھ لیا۔ عورت بس اسی مان اور اعتبار کو ترستی ہے۔“

میں اسے کیا تاکہ شراب نوشی میں اس کا ساتھ دینے کی خواہش میری نہیں تھی۔ وہ غزالہ کی تجویز تھی جسے میں نے وقت ضائع کیے بغیر پوری خوشی سے قبول کیا تھا۔

”اب میرے رو بہ رو آجاؤ۔“ گلاس میں برف کے ڈلے ڈالنے کے بعد اس نے مجھے دعوت دی ”آج تم ایک مدت کے بعد مجھے اپنے پرانے روپ میں نظر آئے ہو۔“

”میں نے کبھی اپنا روپ نہیں بدلا۔“ میں نے اپنی جگہ تبدیل کرتے ہوئے کہا ”یہ سب تمہاری نگاہوں کا کمالی ہے۔ کبھی یہ نیاز مندی سے فرش راہ ہو چکی جاتی ہیں اور کبھی ناز سے پیشانی پر جا چڑھتی ہیں۔“

”اس میں سے کچھ بھی میرا نہیں ہوتا۔ میرے مزاج میں یہ ساری تبدیلیاں تم ہی لاتے ہو۔“

”تمہارا جام صحت!“ میں نے اپنا گلاس ٹرے سے اٹھا لیا۔ ویرا نے گلاس سنبھالا، مراسم کی تجدید کرتے ہوئے

کی آنکھوں کی چمک گہری ہو گئی۔
 ”سونے کے لیے رہا ہی کیا ہے؟ شادی شدہ مرد ایک کھونٹے کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ رسی دراز ہو تو یہ دائرہ ذرا پھیل جاتا ہے ورنہ وہی ایک دنیا ہوتی ہے جو اس دائرے میں آتی ہے۔“

”فرض کرو کہ غزالہ تم سے نہ ملی ہوتی تو میرے بارے میں تم کیا سوچتے؟“
 ”شاید تم سے شادی کر لیتا۔“ میں نے بے دھڑک کہہ دیا۔ ایک مفروضہ پیش کر کے اس نے مجھے کچھ بھی کہنے کا کھلا موقع فراہم کر دیا تھا۔

ویرا کا سرخ و سفید چہرہ تھما اٹھا ”میرے ماضی کے باوجود؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں!“ میں نے پورے دثوق سے کہا ”تمہارا ماضی تم پر تھوہا گیا تھا۔ کسی کا ماضی کھگانے کا حق اسے ہوتا ہے جس کا دامن خود بے داغ ہو۔ میرا خیال ہے کہ مجھے یہ حق نہیں ہے۔“

”تم بولتے ہو تو تمہاری روشن آنکھیں تمہارے ایک ایک لفظ کا ساتھ دیتی ہیں۔“ اس نے گہرا سانس لے کر دھیمی آواز میں کہا ”اے میں نے تمہارے الفاظ میرے دل کے زخموں کا مرہم بن جاتے ہیں۔“

”اسی لیے تم بار بار مجھ سے روٹھ جاتی ہو۔ لڑنے کے حیلے بہانے تراشتی رہتی ہو۔“
 ”یہ سب مایوسی کے عالم میں ہوتا ہے۔ تمہاری بے رخی مجھے مشتعل کر دیتی ہے۔ مجھے پوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں اندر سے بھرا ہوا کھوکھلا ہو گئی ہوں۔“

میں نے ہنس کر ہولے سے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی اور کہا ”اداسی کو ختم کرو۔ گزرنے والی یہ شام دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گی۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔“
 ”میرے لیے یہ سب اچھی باتیں ہیں۔ ایک تم ہی تو ہو جس کے سامنے میں کھل کر ہر اعتراف کر سکتی ہوں۔“

”اعترافات کے لیے تمہارے یہاں ہولی فادرز کو بہت اختیارات حاصل ہیں۔“

”خدا“ صبح اور مریم۔ میرے مسلک میں ان تینوں کے سوا کسی کا کوئی گزر نہیں ہے۔ میں سچ بتا رہی ہوں کہ مغرب میں مذہب اور مسلک کا کردار بہت محدود ہو گیا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا ہے کہ نام اور شناخت بدل کر ایک نازک وطن کی طرح امریکا چلی جاؤں مگر تم لوگوں کے ساتھ اتنا وقت گزارنے کے بعد میں اپنے وطن کے لیے بالکل ناموزوں

ہو چکی ہوں۔ میری سوچ اور ترجیحات بدل گئی ہیں۔“
 ”میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ سرور ہلکا سا ہو تب بھی آدمی کو مذہب پر بولنے سے گریز کرنا چاہیے۔ یہ دنیا کا نازک ترین موضوع گفتگو ہے۔“

”مذہب ہی نہیں“ میں ہر حوالے سے خود کو مغرب کے لیے ناموزوں سمجھنے لگی ہوں۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی شخصی آزادیوں کا بھیانک ثمر بھی آنے والے دنوں میں دل خوش کن نظر نہیں آتا۔“

”رخصتی اور موہنی کی گفتگو کا کیسٹ تم نے سنا ہی ہو گا۔ وہ مشرق میں مغرب کی نقالی کا شاہکار تھا۔“

”یہ چلن دولت مند گھرانوں میں سرایت کر رہا ہے۔“
 ویرا متاسفانہ لہجے میں بولی ”رخصتی بھی کسی بڑے گھری بیٹی ہو گئی۔ موہنی کے کیس میں اس کا نام سامنے آچکا ہے۔ پتا نہیں وہ اپنے خاندان کی ناموس کو کہاں تک تباہ کرے گی۔ لڑکیوں کی آزادی بڑے خطرناک گل کھلاتی ہے۔“

وہ رائے میری یا کسی ٹھیک مشرقی مرد کی نہیں بلکہ مغرب کے آزاد معاشرے میں ملی بڑھی ہوئی ایک سمجھ دار عورت کی تھی۔ اس کے ذاتی مشاہدات اور تجربوں کی روشنی میں اس رائے کو مسترد کرنا یا جھلانا آسان کام نہیں تھا۔

ویرا مسلسل اور تیزی سے بیتی رہی۔ میں رک رک کر اور دھیرے دھیرے اس کا ساتھ دیتا رہا۔ اس کی گفتگو دنیا بھر کے موضوعات سے ہوتی ہوئی آخر میں پھر اپنی ذات پر آ گئی۔ اس وقت تک اس کی آنکھوں میں ہمارے کمرے کے دورے تیرنے لگے تھے اور زبان کافی بھاری ہو چکی تھی۔ ڈپل کی صراحی نما بوتل کی تہ میں سنہرے سیال کی بس ایک پتلی سی لکیر باقی رہ گئی تھی۔

آخر کار بوتل سے گلاس کے راستے وہ آخری قطرے بھی آہستہ آہستہ ویرا کے معدے میں تحلیل ہو گئے۔ وہ خود بلا نوش تھی۔ بیتی تھی تو پھر بیکے بغیر بیتی ہی چلی جاتی تھی لیکن اس شام اس نے دوسری بوتل کو پھینچنے کا کوئی عندیہ نہیں دیا اور تھوڑی دیر بعد ہم کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔

☆○☆
 اگلی صبح ناشتے کے بعد مجھ اور اول خان کا فون نہیں آیا تو مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اس کے دفتر فون کیا تو وہ وہاں موجود تھا۔

”پریس پر کوئی پیغام ملا ہے نہ کوئی فون آیا ہے۔ میں اسلام آباد کے بارے میں فکر مند ہوں۔“ اس نے رسی مزاج پر سی کے بعد خود ہی وہ موضوع چھیڑ دیا۔

☆○☆

”پریس پر کوئی پیغام ملا ہے نہ کوئی فون آیا ہے۔ میں اسلام آباد کے بارے میں فکر مند ہوں۔“ اس نے رسی مزاج پر سی کے بعد خود ہی وہ موضوع چھیڑ دیا۔

☆○☆



”بلند ہمتی“

نخشا طالب علم کلاس روم میں تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ گلوگیر آوازیں وہ بڑی مشکل سے مس کو بتا رہا تھا ”مس! میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔۔۔ مجھے آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آرہا۔۔۔ اور۔۔۔ اور میری ٹانگوں کی جان نکل چکی ہے۔۔۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔۔۔“

کئی منٹ تک اس کی حالت دیکھنے اور فریاد سننے کے بعد مس آخر کار متاثر ہو گئیں اور کلاس روم سے باہر جاتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں بولیں ”اچھا۔۔۔ میں تمہارے ابو یا امی کو فون کرتی ہوں کہ وہ آکر تمہیں لے جائیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں مس۔۔۔! نخشا طالب علم جلدی سے چلایا ”میں بس سے چلا جاؤں گا۔۔۔“



میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اپنا کھیل ان کے ہاتھ میں دے کر ہم لے کر ہو گئے ہیں۔ سامنے کوئی ہدف ہے نہ دشمن۔ ہم بس انتظار کر سکتے ہیں۔“

”شاید تمہیں اس معاملے کی اہمیت اور نزاکت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔“

میں نے اول خان کی بات کاٹ دی ”یہ الفاظ میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ ان پڑتیج سرکاری اصطلاحات کو عام آدمی سرخ فیٹے کے نام سے جانتا ہے، ان کے نتیجے میں صرف اور صرف تاخیر رونما ہوتی ہے۔ نتائج عام طور پر وہی رہتے ہیں جو عام حالات میں ہونے چاہئیں۔“

”آج تم کچھ اچھے ہوئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیر سے تعلقات میں پیدا ہونے والی کشیدگی اب تمہارے اعصاب پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔“

اول خان کی زبان سے وہ الفاظ سن کر میں چونک پڑا۔ اپنے تمام تر خلوص اور بے تکلفی کے باوجود وہ ہم میں سے

”تمہارے پاس آئی بی والوں کے اسلام آباد کے فون نمبر موجود ہوں گے۔ ان میں سے کسی نمبر پر رابطہ کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرو۔“ میں نے رائے دی۔

”یہ پروٹوکول کے خلاف ہوگا۔“ اول خان نے کسی توقف کے بغیر جواب دیا ”اس نے خاص طور پر کہا تھا کہ اس کا کوئی آدمی ہمیں ٹراسسٹر پر اس کے رابطے سے آگاہ کرے گا۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں اپنے دفاتر میں یا معمول کے نمبروں پر موجود نہ ہوں۔“

”اگر وہ دونوں اسلام آباد جا کر ہمیں فراموش کر بیٹھے ہیں تو ہمیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی پنڈت اور رستم کا کیس ان کا ہے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”یہ حکمہ جاتی باتیں ہیں ورنہ ہم شروع سے آخر تک ہر معاملے میں شامل رہے ہیں۔ یہاں کی خبریں بتا رہی ہیں کہ اسلام آباد میں پچھلی رات خاصی سرگرمیاں رہی ہوں گی۔“

”یہاں کی کیا خبریں ہیں؟“ میں نے چونک کر سوال کیا

”کیا پھر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟“

”ان تینوں آدمیوں کو پکڑ لیا گیا، چونڈت منوہر لال سے باقاعدہ تنخواہیں لے کر اسے معلومات فراہم کرتے تھے۔ انہیں ابتدائی طور پر صدف مینشن میں رکھا گیا تھا۔ رات گئے وہ پی آئی اے کی نائٹ کوچ سے اسلام آباد لے جائے گئے ہیں۔ آئی بی کے دو اہل کار ان کے ساتھ گئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب صدف مینشن میں صرف دو گن مین رہ گئے ہوں گے۔“

اول خان فوراً ہی میری بات سمجھ گیا اور فون پر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا ”صدف مینشن ان کا خاص تفتیشی سیل ہے جہاں وہ زیر حراست ملزمان سے باز پرس کرتے ہیں۔ شہر کے مرکزی علاقے میں ان کا باقاعدہ اور مستقل دفتر ہے۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی اسی دفتر کے عملے کی ذمہ داری ہے۔“

”تو پھر اسی دفتر سے رابطہ کرنا چاہیے“ میں نے کہا ”ہم صدف مینشن بھی جاسکتے ہیں۔“

”کم از کم میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ خفیہ معاملات میں باہمی رابطوں پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ جلال نے خود اپنا نمبر دینے والی بات نہ کہی ہوتی تو تمہاری تجاویز پر سوچا جاسکتا تھا۔ فی الحال ہمیں صرف انتظار کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ساری رات ہی مصروف رہے ہوں۔“

”اگر تم ان سے رابطے کے سلسلے میں اتنے محتاط ہو تو

کسی کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی غیر محتاط تبصرہ نہیں کرتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے میرے اور ویرا کے بارے میں کس بنا پر وہ ریمارک دے ڈالا تھا۔

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ ویرا سے میرے تعلقات خراب چل رہے ہیں؟“

”دو تین دن پہلے میں دن میں تم سے ملنے آیا تھا تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تھی مگر میں اپنی رائے ذرا سوچ کر ہی دیتا ہوں۔ غزالہ نے مجھے تم دونوں کے درمیان کسی فساد کی خبر دی تھی۔“ بلکی سی ہنسی کے بعد اول خان کی آواز آئی۔

”اوہ! کھر کا بھیدی ہے لکا ڈھا رہا ہے“ میں نے جوابی خوش دلی کا مظاہرہ کیا ”غزالہ کو تم سے ایسی باتیں کرنے کا موقع کب مل جاتا ہے؟“

”یہ رازدارانہ سرگوشیاں ہرگز نہیں ہوتیں“ اس نے وضاحت کی ”میں تم لوگوں سے ملنے آتا ہوں تو خود کو کھر کا ایک فرد سمجھتا ہوں۔ مجھ سے ہر ایک اپنے دل کی بات کہہ سن لیتا ہے۔“

”پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ کل تمہارے جانے کے بعد ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے ہیں۔ تعلقات کا جمود اب ختم ہو چکا ہے۔“

”یہ خوشی کی بات ہے۔ تمہیں یہ بات ہر وقت یاد رکھنی چاہیے کہ اس نے تم لوگوں کی خاطر سب کچھ، حتیٰ کہ اپنا وطن تک چھوڑ دیا ہے اور یہاں کی دھیمی زندگی کو قبول کر لیا ہے۔“

”یہ نکتہ ہر وقت میرے ذہن میں رہتا ہے اسی لیے اب تک گزارا ہو رہا ہے۔“

”تم تجھ بھر میں بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہو“ ایک گہرے سانس کے بعد رلیو پر اس کی آواز ابھری ”میں بتا رہا تھا کہ رستم اور پنڈت کا معاملہ بہت نازک ہے۔ پاکستان میں صیہونی سازشوں اور خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں اخبارات میں اکثر غلط افہام پڑتا ہے۔ کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں۔ بعد میں کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ نتیجہ کیا نکلا۔ ملزم بے گناہ ثابت ہوتے ہیں یا ان کے خلاف مواد نہیں ملتا اور انہیں خاموشی سے رہا کر دیا جاتا ہے۔“

”تم اکثر سسٹم کی خرابیوں کا رونا روتے رہتے ہو۔ ایسے واقعات بھی ان کمزوریوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔“

”مگر اس بار ایسا نہیں ہے۔“ اول خان نے ایک ایک

لفظ پر زور دے کر کہا ”پنڈت کے گھر پر رابن ماڑ کے قتل نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس بار ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ صیہونی فتنہ موساد اور جس (JISS) کے ذریعے پاکستان میں سرگرم عمل ہے۔“

”شواہد موجود ہیں تو انہیں سامنے آنا چاہیے۔ خاموشی کیوں ہے؟“ میں نے کہا۔

”ایسے معاملات میں بہت سی مصلحتیں اور مجبوریاں مانع ہوتی ہیں۔ ان پر قابو پائے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی صرف ایک رات گزری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شام تک کوئی خبر مل جائے۔“

”مگر تم کو بھی صرف انتظار کرنا ہے تو یہیں آ جاؤ۔ مل جل کر وقت گزار لیں گے۔“

”میں صرف انتظار نہیں کر رہا۔ میں نے پنڈت اور رستم کے تین ماہ کے سارے فون بلز کی تفصیلات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوں ہی متعلقہ شعبے سے پیغام ملا، میں تفصیلات لیتا ہوا تمہاری طرف آ جاؤں گا۔ یہ بل ان دونوں کی سرگرمیوں کا مضبوط ترین ثبوت ثابت ہوں گے۔“

فون پر گفتگو سے فارغ ہو کر میں نے محسوس کیا کہ گھر میں سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

کچن کے ساتھ میرا کمرہ بھی خالی تھا۔ سلطان شاہ کی خواب گاہ کا دروازہ چوٹ کھلا ہوا تھا۔ وہیں میرے کانوں میں ویرا کی دہلی دہلی مترنم ہنسی کی آواز آئی اور میں بند دروازے پر دستک دے کر، جواب کا انتظار کیے بغیر ویرا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے کارڈز کھیل رہے تھے۔ ویرا کسی پیش رو رجواری کی طرح اپنے کارڈز دیکھ کر، دوسروں کے حوصلے پست کر دینے والے تبصرے کر رہی تھی۔

”یہ بند کمرے میں کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے پیچھے سے غزالہ کے کارڈز دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کٹ تھروٹ برج کھیل رہے ہیں“ ویرا نے سینہ زوری سے کہا ”بڈنگ ہو چکی ہے۔ چاہو تو تم ڈی کی جگہ لے سکتے ہو۔ سلطان شاہ تمہارا پارٹنر ہو گا۔“

میں نے غزالہ کے ہاتھ چھون کر میز پر ڈال دیے اور ویرا تلملا اٹھی ”تم نے ہمارا زبردست حکم برباد کر دیا۔ میں دیکھتی کہ سلطان شاہ اپنا کنٹریکٹ کیسے پورا کرتا ہے۔“

”برج پر لعنت بھیجو۔ ہم ٹرپ کارڈز کھیلیں گے۔“ میں نے کسل مندی سے کہا۔

سلطان شاہ شاید پھنسا ہوا تھا۔ اس نے میری بات سنتے

ہی اپنے اور غزالہ کے کارڈز تیزی سے گلدنڈ کر دیے۔ ڈی کے اٹلے پتے بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔
 ”کوٹ پیس ہی ھیلیں گے۔“ سلطان شاہ نے اعلان کیا
 ”مہرج کا کھیل اچھے خاصے، ہنر کیلئے انسان کو ذرا سی دیر میں فلسفی اور قوطی بنادیتا ہے۔“
 ”تم لوگ کراہند کیوں بیٹھے تھے؟“ میں نے ایک کر سی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”تم فون پر مصروف تھے۔ ہم تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے تھے۔“ سلطان شاہ بولا ”یہ دیر اکی تجویز تھی کہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ کر اس کے کمرے میں محفل جمالی جائے۔“

”دیکھ لو!“ ویرا نے اپنے پتے بھی میز پر پھینک دیے ”یہ مرکز بھی سکس ڈائمنڈز نہیں بنا سکتا تھا۔“

میں انہیں کمرے سے نکال کر ڈرائنگ روم میں لے جانا چاہتا تھا لیکن ویرا اپنے کمرے میں ہی بیٹھنے پر مصر رہی۔
 کھڑکیوں پر کھینچے ہوئے پردوں اور کم روشنی کی وجہ سے اسے اپنا کرا زیادہ پسند تھا۔

ہم جس ترتیب سے آئے سانسے بیٹھے تھے، اس کے مطابق عورتیں ایک طرف تھیں، سلطان شاہ میرے سانسے تھا۔ ویرا کو اس ترتیب میں کوئی تبدیلی منظور نہیں تھی۔
 کارڈز اٹھائے گئے اور بانٹنے کی ذمہ داری ویرا کے سر آگئی۔
 میرے لیے وہ آغاز ایک اچھا شگون تھا۔

وقت گزاری کے لیے وہ ایک اچھا مشغلہ تھا کیونکہ ویرا کبھی ایمان داری سے اپنی ہارتسلیم نہیں کرتی تھی۔ شاربنگ اور دوسری بے ایمانیوں کے ذریعے ہر فیت پر جیتنے کی کوشش کرتی تھی، بار بار پکڑی جاتی تھی مگر شور و غل اور احتجاج کے باوجود، موقع ملنے پر بے ایمانی کرنے سے باز نہیں آتی تھی۔

وہ سلسلہ دوپہر کے کھانے تک پورے زور و شور سے چلتا رہا۔ غزالہ میز لگانے کے لیے اچھی توری کا سلسلہ چل پڑا۔ ہم نے کھانے کا آغاز ہی کیا تھا کہ اول خان آپہنچا۔

ہم میں سے کسی کو اسے کھانے پر مدعو کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میز تیار دیکھ کر وہ خوش ہو گیا اور چکن میں ہاتھ دھو کر خود ہی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔

”دفتر سے سیدھے آ رہے ہو یا آئی بی والوں کے ساتھ کہیں مصروف تھے؟“ ویرا نے پوچھا۔

اول خان نے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھا پھر کہا ”وہ لوگ تو کل شام ہی پنڈت کو اپنے ساتھ لے کر اسلام

ایک جج صاحب جن کی دیانت داری اور دیانت پسندی، دونوں کی بڑی شہرت تھی، ایک ہوٹل میں اپنا بڑا بھول گئے جس میں خاصی بڑی رقم تھی۔ دوسرے روز ایک ویٹر ہوا واپس کرنے آیا تو وہ بہت خوش ہو کر اسے انعام سے نوازنے کا ارادہ کرتے ہوئے بولے ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ بڑا امیرا ہی ہے؟“

”صاحب! بڑا کس کا ہے۔ یہ تو آپ جانیں۔ اور آپ کا خدا جانے۔۔۔ مجھے تو اس میں آپ کا شاختی کارڈ رکھا ہوا ملا تھا۔“ ویٹر نے سادگی سے جواب دیا۔

آباد چلے گئے تھے۔ کارروائیوں کا مرکز یہاں سے اسلام آباد منتقل ہو چکا ہے۔

”تم نے اس بارے میں ہمیں ایک لفظ بھی نہیں بتایا“ ویرا نے مجھ سے شکایت کی۔

”موقع ملا اور نہ تم نے اس بارے میں کچھ پوچھا۔ اب ہماری نظریں اسلام آباد پر لگی ہوئی ہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ آج کسی وقت وہاں سے کوئی نہ کوئی اچھی خبر ضرور ملے گی۔“ اول خان نے میری بات پر گرہ لگائی ”بلوں کے بارے میں تمہارا اندازہ درست ثابت ہوا ہے۔“
 ”کیسے بل؟“ اس بار غزالہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس بار ہم میں سے ہر شخص، ہر بات سے باخبر نہیں تھا۔

”فون بل!“ اول خان نے اسے بتایا ”وہ میں نے ابھی نہیں دیکھے لیکن بل نکالنے والے نے بتایا ہے کہ دو نمبروں سے واشنگٹن کا باقاعدہ رابطہ رہا ہے۔“

”کھانے سے فارغ ہو کر ہم پانچوں، ایک ایک کر کے ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔

اول خان نے رستم کی خود کشی کے بعد پیش آنے والے واقعات کا ایک اجمالی خاکہ سب کے سامنے پیش کر دیا تاکہ کوئی اپنی بے خبری کا گلہ نہ کر سکے۔

”جب بہت کچھ سامنے آچکا ہے تو پنڈت منوہر لال کی گرفتاری کو صیغہ راز میں رکھنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟“ ویرا نے سب کچھ سن لینے کے بعد پہلا اعتراض

کریا۔
”یہ ذہنی کا مشورہ تھا۔ وہ لوگ اس پر کہاں تک عمل کرتے ہیں؟ ان کا فعل ہے۔“ اول خان نے کہا۔
دیر کی انتظار طلب نگاہیں میری طرف اٹھ گئیں۔
میرا جواب مختصر تھا ”اسے سامنے لانے سے کوئی فائدہ ہوتا ہے تو اسے منظر عام پر لانے میں کوئی ہرج نہیں۔“

”تم اسے سات پردوں میں چھالو تب بھی یہ بات رابن مارکو کو معلوم تھی کہ پنڈت منوہر لال اپنے گھر ہونے والی چوری کی پڑا سرا روادرات کے بعد رستم کے پاس پناہ گزین ہے۔۔۔“
”یہ ہم کہہ رہے ہیں، وہ سرکاری سطح پر اس کا اعتراف نہیں کر سکتے۔ وہ پنڈت اور رستم کے ساتھ رابن کے کسی بھی رابطے کا حوالہ نہیں دے سکتے۔“ میں نے دیر کی بات کاٹ دی
”رابن مارکیاں موسایا“ جس کے ایجنٹ کے روپ میں نہیں آیا تھا۔ امریکی سفارتی افسر کی حیثیت سے آیا تھا۔“

”پنڈت کو روپوش رکھ کر نہ صرف اسے محفوظ رکھا جاسکتا ہے بلکہ امریکی حکام سے پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ رابن ہر سفارتی اور حفاظتی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس کی بیٹی کو قتل کرنے اس کے گھر گیا تو یہ شبہ ہونا فطری امر ہے کہ پنڈت اسی کے خوف سے کہیں روپوش ہے۔“
”میں بحث کو طول نہیں دیتی مگر یہ ضرور بتا دوں کہ اس کی آڑ میں تم تل ایبب والوں پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکو گے۔“ دیر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں نے حیرت سے پلکیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھا
”ذرا اس کی وضاحت بھی کر دو۔“
”بہت سیدھی سی بات ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا ”تمہارے پاس موساد کے چیف اور سکرٹری کے فون یا فیکس نمبر ضرور موجود ہیں مگر پاکستان اور اسرائیل میں کوئی براہ راست مواصلاتی رابطہ نہیں ہے۔ پنڈت اپنے پیغامات رابن مارکو کو واشٹن بھیجتا تھا۔ رابن وہ پیغامات وہاں سے تل ایبب فیکس کر دیتا تھا۔ رابن مرچکا ہے۔ تم یہ رابطہ کیسے استعمال کرو گے؟“

”نظا ہر تمہارا یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا توڑ ہو سکتا ہے۔“
”وہ یقیناً کوئی طویل اور صبر آزما طریقہ ہو گا۔ میں اتنی دور تک کی منصوبہ بندی کی قائل نہیں ہوں۔“
اول خان نے اس دوران میں اپنی جیب سے فون بلوں کا ایک پلندہ نکال لیا۔
اس میں ایک موٹی گڈی بئیرا میں نصب سات نمبروں

کے بارے میں تھی۔ دوسری تلی گڈی میں پنڈت منوہر لال کے گھر کے دو نمبروں کے پچھلے تین ماہ کے بل تھے۔
”ان میں سے ہر بل ہزاروں میں ہے۔“ اول خان نے موٹی گڈی کی ورق گردانی کرتے ہوئے حیرت سے کہا ”بیرون ملک اور شہر سے باہر کی جانے والی کالز کی ہر نمبر بھر مار ہے۔“
”ایک ایسا آدمی جو شب و روز اپنے گھر میں محصور رہتا ہو، اپنی بیوی مصروفیات کے لیے فون پر ہی انحصار کر سکتا ہے۔ اس کے غلیظ کاروبار کا انحصار بھی فون پر تھا۔“ میں نے جواب دیا۔
”ان میں بیشتر کالز ایران کی معلوم ہوتی ہیں۔“ اول خان نے بزدل دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا ”امریکا کے کوڈ کے ساتھ دو نمبر بار بار آرہے ہیں۔ ان کا سنی کوڈ شاید واشٹن کا ہے۔“
”رستم کا ایران سے بہت گہرا اور پرانا تعلق تھا۔“ میں نے کہا ”اپنے رشتے داروں سے اس نے فون پر ہی اپنے رابطے برقرار رکھے ہوں گے۔“

فون بل میرے پاس آئے تو میں نے دیکھا کہ رستم کے بلوں میں ڈبل زیرو ٹائن ایٹ یعنی ایران کے انٹرنیشنل ڈائلنگ کوڈ والے نمبروں کی خاصی تعداد تھی۔ امریکا کے کئی نمبر تھے لیکن وہ کہیں کہیں نظر آئے، واشٹن کے دو نمبر ہر مینے بنی بار موجود تھے۔
اس کے مقابلے میں واشٹن سے پنڈت منوہر لال کے رابطوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اول خان نے اپنے ذرا رخ سے وہ تازہ ترین کوائف حاصل کیے تھے۔ ان سے پتا چل رہا تھا کہ منوہر لال کی روپوشی کے بعد رستم کے ایک نمبر سے تقریباً ہر روز واشٹن کے نمبروں پر طویل گفتگو ہوتی رہی تھی۔
نظا ہر وہ متعدد کاغذوں پر بکھرے ہوئے اعداد و شمار تھے لیکن ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آرہی تھی کہ رستم نے ”جس“ کے بارے میں بیشتر مقامی ذمے داریوں کا بوجھ پنڈت منوہر لال پر ڈالا ہوا تھا لیکن رابن مار سے وہ خود ہی رابطے میں رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ پنڈت کے ایک فون سے کبھی بکھار کی جانے والی کالز کو ناگزیر ضروریات کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا تھا۔
وہ بہت دلچسپ اور نیا کھیل تھا۔ ٹیلی فون بلز کی وہ اہمیت اور افادیت سب ہی کے لیے نئی تھی اس لیے ذرا سی دیر میں وہ گڈیاں کھل کر پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئیں اور ہر ایک قلم سنبھال کر نمبروں کے ساتھ ملک اور شہر کے نام درج

کرنے میں منہمک ہو گیا۔
تین بجے اول خان کے پاس موجود آئی بی کے اربٹس پر
اشارہ موصول ہونے لگا۔ اس نے ٹرانس مٹران کیا تو لائن پر
الفا کا پیغام چارلی کے نام آ رہا تھا مگر وہ آواز جلال کی نہیں
تھی۔

جلال کے کوڑے استعمال کا مقصد تھا کہ بولنے والا اسی
کا آدمی تھا۔ اول خان سے جواب ملنے پر اس نے اسلام آباد
کا ایک نمبر لکھوانے کے بعد کہا کہ وہ اس نمبر پر کسی وقت
بات کر لے۔ بات کرتے ہوئے ملک کو اپنے ساتھ رکھے۔
”بہت ناقص اور ادھورا پیغام ہے۔“ وہ مختصر سی بات
ختم ہو جانے پر ویرانے کہا ”اسلام آباد کے بارے میں کچھ پتا
نہیں چل سکا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”ہاں کے حالات کا علم فون پر ہو گا۔ یہ کال اپنی جگہ
مکمل تھی۔“

”اور یہ ملک صاحب کون ہیں؟“ ویرانے اول خان
سے سوال کیا۔
”یہ ذات شریف!“ اول خان نے مسکرا کر میری طرف
اشارہ کیا ”رستم سے یہ ملک ممتاز کے نام سے ملے تھے اب
عارضی طور پر صرف ملک صاحب ہیں۔“

پیغام میں وقت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ میرے ایما پر
اول خان نے اسی وقت جلال سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا
تاکہ ہمارا اعصاب شکن انتظار ختم ہو سکے۔

اول خان کے فقروں سے اندازہ ہوا کہ اس کا فون
جلال نے خود ہی ریسیو کیا تھا۔ اس کی گفتگو بس چند استفہامیہ
فقروں تک محدود رہی پھر اس نے ریسیور میری طرف بڑھا
دیا۔

”میں نے اول خان سے معذرت کر لی ہے کہ اس وقت
مجھے تم سے بات کرنی تھی۔“ میری آواز سن کر جلال نے کہا
”مجھے امید ہے کہ اس نے برا نہیں مانا ہو گا۔“

”اس سوال کا جواب اول خان ہی دے سکتا ہے۔
تمہیں میری کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”میرا اندازہ ہے کہ وہ عملی مسائل میں بھرپور ساتھ
دے سکتا ہے۔ اچھے ہوئے مسائل کے حل کے لیے وہ خود
بھی تم پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے۔“

”فکری مسئلہ درپیش ہے؟“ میں نے دزیدہ نظروں سے
اول خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کراچی سے اچانک روانگی کے پروگرام نے پنڈت کو
کنفیوژ کر دیا ہے۔“ وہ بولا۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

ایک کیسیاگر کی داستان شوق
جو مقصد کی تلاش میں دریدر پھرتا رہا

۴۰ سے زائد برتوں کا مجموعہ

مقصد

داؤی
صدر علی

مصنف
اقلم علیم

اپنے قریبی بھائی کے طلب فرمائیں یا براہ راست ہمیں خط لکھیں

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۳۳ کراچی ۱

”مجھے ہی نہیں، تمہیں بھی بلایا گیا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اپنے اوپر والوں کو خبر دیے بغیر یہاں سے کھٹک لو۔ جلال کا کام پورا ہونے پر کل واپس لوٹ آنا۔“

”جلال کا کام کیا ہے؟“ ویرا نے چپختے ہوئے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

”اپنے افسران کے سامنے پنڈت کو زبان کھولنے پر مجبور کرنا۔“ میں نے بتایا۔

”خوب!“ ویرا طنزیہ لہجے میں بولی ”اے اپنے افسروں کی خوشنودی کا اتنا خیال ہے اور اول خان کو اپنے افسروں سے مشورہ تک نہ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔“

”مصائب میں پھنس کر آدمی اس سے بھی زیادہ کور عقل ہو جاتا ہے۔“

”اس پر کون سی مشکلات آئی ہوئی ہیں؟ پنڈت کے اعتراف کے چار گواہ موجود ہیں۔ جلال اور رحمان کے علاوہ تم اور اول خان بھی وہاں موجود تھے۔ اس کا ریکارڈ سامنے ہے۔ اس کے فون بل ثبوت میں آخری کیل ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”تم نہیں سمجھ سکتیں۔“ اول خان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”ایسی صورت حال میں بڑے افسروں کے سامنے سخت ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملزم پر پوری طرح کام کیے بغیر اسے ان کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔“

”پنڈت کو وہ اپنی مرضی سے اسلام آباد نہیں لے گئے، اسے حکم دے کر وہاں طلب کیا گیا ہے۔ اگر کام ادھورا بھی رہ گیا ہے تو اس میں ان دونوں کا کیا تصور ہے؟“ سلطان شاہ بولا۔

”تم لوگ جو چاہو، کہتے رہو۔ میری رائے ہے کہ ہمیں اس کی مدد کے لیے اسلام آباد جانا چاہیے۔ مجھے اوپر سے اجازت لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ بس اپنی روانگی کی اطلاع دینی ہوگی۔ ایس بی ایف میں ہر ایک اس معاملے کی اہمیت سے واقف ہے۔“

”پھر میں اسے فون کر دوں؟“ میں نے اول خان سے پوچھا ”وہ ہمارے کسی پیغام کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوگا۔“

”پہلے میں اپنے کمانڈر سے بات کر لوں پھر تم فون کر لیتا۔“ اس نے کہا۔

اپنی فورس کے بارے میں اول خان کا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں تھا۔ اس نے

”طرح ممکن نہیں تھا۔“

”تم اسے موہنی پنڈت کے بے جان چہرے کا دیدار کروا سکتے تھے۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے، اب وہ کبھی اپنی بیٹی کی صورت نہیں دیکھ سکے گا۔“

”وہ بیٹی کے سوا کچھ بول ہی نہیں رہا۔ میں نے اصولی طور پر افسران بالا سے تمہاری تجویز کی منظوری لے لی ہے مگر وہ پنڈت کا اعترافی بیان سے بغیر کوئی قدم اٹھاتے ہوئے بیچھا رہے ہیں۔“

”مجھے اس کی زبان کھلوانے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ تم اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کرو۔ اپنی نگرانی میں اسے موقع دو کہ وہ اپنی بیٹی کی آخری رسوم میں شرکت کر سکے۔“

”مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اتنا گہیر ہو جائے گا تو میں اسے کراچی میں ہی آگ لگوا دیتا۔ میں کو شش کرتا ہوں کہ یہ کام پنڈی میں ہی ہو جائے پھر بھی تم دونوں کی یہاں موجودگی ضروری ہے۔“

”ہم دونوں وہاں آکر کیا کر سکیں گے؟ ایک بار پنڈت کو اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع مل جائے تو وہ تمہاری ہر بات کا جواب دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔“

”وہ صورت سے پاگل بلکہ نیم وحشی نظر آ رہا ہے۔ سوچی ہوئی آنکھیں، رنگے ہوئے سیاہ بالوں کی بوڑھی ہوئی سفید جڑیں اور پھر اس کی ہڈیاں بڑبڑا رہی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس پر زیادہ تشدد کیا گیا تو وہ مرجائے گا۔ مرنے سے پہلے اسے میرے بڑوں کے سامنے اپنا بیان ضرور ریکارڈ کر دینا چاہیے۔ تم اس کی رگ رگ سے واقف ہو۔ میں بہت شدت سے یہاں تمہاری ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔“

”میں اول خان سے مشورہ کر کے تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اس سے کہہ دینا کہ ہو سکے تو خاموشی سے یہاں چلا آئے۔ کل رات سے پہلے تم دونوں واپس چلے جاؤ گے۔ اس کے یونٹ میں کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ وہ اسلام آباد آیا تھا۔“

اس کا آخری مشورہ بالکل احمقانہ اور خود غرضی پر مبنی تھا مگر میں نے اس بارے میں کوئی تکرار کیے بغیر اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور فون بند کر دیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت کی زبان پر لگے ہوئے تالے کی چابی تمہارے ہی پاس ہے۔“ اول خان نے تسخّر سے کہا ”شاید اب تمہیں اسلام آباد طلب کیا جا رہا ہے۔“

”خواہش“

رمضان صاحب شہر کے ایک اعلیٰ آڈیٹوریم میں بیجک شو دیکھنے گئے تو شعبدے باز کا ایک خصوصی شعبدہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”خدا کی پناہ...!“ وہ بے اختیار تحسین آمیز انداز میں چلائے ”یہ کام آپ نے کیسے سکھا سکتا ہوں...“ شعبدے باز نے

مناست سے جواب دیا ”لیکن میرا اصول ہے کہ جسے سکھاتا ہوں اسے چند دن بعد قتل کر دیتا ہوں۔“

رمضان صاحب نے ایک لمحے سوچا پھر بولے ”اچھا... ٹھیک ہے... تو پھر میری بیوی کو سکھا دو۔“

ہے لیکن اس کے عوض پوری رات برباد ہو جاتی ہے۔“ سلطان شاہ نے تنقید کی ”ہم اتنے مفلس نہیں ہیں کہ اتنی چھوٹی بچتوں کے پیچھے بھاگتے پھریں۔“

”بچت نہیں، میں سہولت دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے روائگی میں غفلت سے کام لیا تو موہنی کے کریاکرم میں بھی شرکت کرنی پڑے گی۔ اسلام آباد میں نائٹ کوچ کی لینڈنگ سے پہلے وہ سارے ناخوشگوار مراحل طے ہو چکے ہوں گے۔“ اول خان نے کہا۔

اول خان کے اس فیصلے سے اختلاف رائے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اپنی دو روزہ غیر حاضری میں کام کاج کی تقسیم کے ارادے سے اول خان روانہ ہوا تو میں بھی گاڑی لے کر شہر کی سڑکیں ناپے نکل کھڑا ہوا۔ وہ میرا اپنا شہر تھا مگر مجھے اس کی سیر کے کالی دن ہو گئے تھے۔

گلشن سے ڈرائیو کرتا ہوا میں خالی الذہنی کے عالم میں قائد اعظم کے مزار کی طرف جا نکلا۔ پاکستان کے بانی کے مزار کے گرد بہت کم ترتیب تھی۔ عمارت اور اس تک جانے والے طویل زینوں کے سوا، سڑک سے، ہر طرف مٹی کے ٹیلے اور چٹانیں بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے درمیان

اپنے کمانڈر سے بہت مختصر بات کی، شاید وہ پہلے بھی اسے براؤننگ دیتا رہا تھا اس لیے ان کی گفتگو چند لمحوں میں ختم ہو گئی۔

”اب تم جلال کو بتا دو۔“ اول خان نے ریسیور کریدل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”روایتی کا بندوبست تم کو کرنا ہے۔ تم ہی اس سے بات کرلو۔“

جلال کا فون مصروف تھا۔ تیسری کوشش میں رابطہ ہوا۔ اول خان نے اپنا پیغام دیا کچھ دیر تک دوسری طرف کی بات سننا رہا پھر اختتامی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا۔

”جلال نے تمہاری بات مان لی ہے۔ شام کی پرواز سے موہنی کا تابوت اسلام آباد پہنچ جائے گا۔ وہاں سے اسے براہ راست پنڈی کے پرانے شمشان گھاٹ پہنچا دیا جائے گا۔“

”کیوں؟ کیا اسلام آباد میں کوئی شمشان نہیں ہے۔“

ویرانے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کہ نہ ہو۔“ میں نے جواب دیا ”پورا شہر گھومنے کے باوجود میں شہر میں مسلمانوں کا کوئی قبرستان دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہندوؤں کا شمشان کہاں ملے گا۔“

”کیا وہاں رہنے والے زندگی کی اس آخری ضرورت سے بے نیاز ہوتے ہیں؟“

ویرانے کے استہزاء سے لہجے پر میں ہنس پڑا ”ہو سکتا ہے کہ میں مضافات میں واقع قبرستان تک نہ پہنچ سکا ہوں۔ زندہ آبادیوں کی منصوبہ بندی میں آخری آرام گاہوں کا بندوبست ضرور کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے لیے الگ جگہ شاید نہ ہو کیونکہ وہ بہت صحت کش ماحول میں اپنے مردے جلاتے ہیں۔“

”ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام آباد سب شہروں کا شہر ہے۔ وہاں وفات پانے والوں کی تدفین ان کے اپنے شہروں اور قبرصوں میں کی جاتی ہوگی۔ غریب غریب کے لیے کہیں کوئی جگہ چھوڑ دی گئی ہوگی۔“ سلطان شاہ بھی اس بارے میں قیاس آرائی سے آگے نہ بڑھ سکا۔

”تم میں سے کسی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ میں نے جلال کو روائگی کا پروگرام دینے کے بجائے پرواز سے قبل اسے پورٹ سے فون کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہم نائٹ کوچ سے نکلیں گے۔“ اول خان نے تدفین کے موضوع کو دوہیں دفن کرتے ہوئے ہم سب کو آگاہ کیا۔

”نائٹ کوچ سے سفر میں تم کی کچھ بچت ضرور ہو جاتی

جا بجا سرسبز درخت استادہ تھے جو شجر کاری کی کسی پرانی مہم کے نتیجے میں بڑھتے چلے گئے تھے۔ مزار کا طواف کرتے ہوئے مجھے قلعن ہوا کہ پاکستانیوں نے اپنے قائد کا مزار تعمیر کر کے اس منصوبے کو یسر بھلا دیا تھا۔ اس کے گرد باغات، لاٹبریری، میوزیم اور دوسری عمارات کی تعمیر کے منصوبے دیکھ کر خوراک بننے کے لیے فائلوں میں چھوڑ دیے گئے تھے۔

وہاں سے نکلنے کے بعد میں تھوڑی دیر میں امریکی قونصل خانے کے سامنے جا پہنچا۔ اس روز آہنی جنگلوں کے پیچھے بنی ہوئی شان دار عمارت تاریک پڑی ہوئی تھی۔ باہر سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اندر کوئی موجود نہ ہو تاہم احاطے میں کچھ ہیولے متحرک نظر آرہے تھے۔ باہر فٹ پاتھ کے کنارے بنی ہوئی نیم پختہ چوکی میں مسلح پولیس والے عمارت کی حفاظت پر مامور تھے۔

اس عمارت میں کام کرنے اور آنے جانے والے بیشتر سفید فام بظاہر ہمارے دوست تھے لیکن روز اول سے ہمارے بدخواہ تھے۔ کسی خوش نما چہرے پر بڑھ آنے والے بد گوشت کی طرح ہمیں کاٹ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ ان کا آخری سرخیل اور برائے ذی ہنٹ تھا جو اسی قونصل خانے کے کسی کمرے میں بیٹھ کر عظیم ترایشیائی اتحاد کے منصوبوں میں رنگ بھر کر رہا تھا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ اپنے خواب کی کوئی تعبیر دیکھنے سے پہلے ہی وہ مجھ سے ٹکرا گیا اور پھر بنی دہلی میں بہت صفائی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

وہ قونصل خانہ آئے دن پاکستان کے کسی نہ کسی بدترین دشمن کی میزبانی کرتا رہتا تھا۔ ان میں رابن مار کا نام فہرست کے بالکل آخری سرے پر تھا۔ صیہونی مفادات کا وہ رکھوالا نفیس سفارتی نقاب اوڑھ کر اپنے ایجنٹوں کو کسی برے وقت سے بچانے کا عزم لے کر بہت معتدی سے کراچی پہنچا تھا۔ اس کی آمد کی پہلی رات رستم کباب کا ٹانگیا پھر اس درندے کو کراچی میں اپنی دوسری رات گزارنی نصیب نہ ہو سکی۔ اضطراب کے عالم میں وہ وہیں پہنچا جہاں ہم اس کے لیے جال بچھائے بیٹھے تھے۔ وہ موہنی پنڈت کو مارنے میں ضرور کامیاب ہو گیا لیکن پھر اسے وہاں سے زندہ لٹکانا نصیب نہ ہو سکا۔

قونصل خانے اور باغ جناح کی درمیانی سڑک سے گزرتے ہوئے وہ اشتعال انگیز خیالات میرے ذہن میں کسی فلم کی طرح چلتے رہے اور پھر میں پل عبور کر کے کلفٹن والی سڑک پر نکل گیا۔

اس راستے میں جہانگیر کا گھر واقع تھا۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے ادھر جانے کے بارے میں سوچا مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ اس دقت جہانگیر گھر پر موجود نہ ہوتا اور سہلی موقع غنیمت جان کر میرے لیے مسئلہ بن جاتی۔ میں اس سڑک سے ہوتا ہوا ساحل سمندر کے ایک دور افتادہ حصے پر جا نکلا۔ سمندر کی تھکی تھکی لہریں پتھریلی دیوار کو تقریباً چھوٹی ہوئی دم توڑ رہی تھیں۔ میں گاڑی کو کنارے سے لگا کر چوڑی دیوار پر بیٹھ گیا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہیلکی ہوئی اور خنک ہوا، لہروں کے شور میں بہت مزادے رہی تھی۔ میرے سامنے وسیع اور تاریک سمندر پھیلا ہوا تھا اور پشت پر اسٹریٹ لائٹس کی ہلکی روشنی بڑھتے ہوئے اندھیرے سے لڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

میں خاصی دیر تک وہاں بیٹھا، پڑ سکون ساحلی فضا سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میرے ذہن سے بیشتر تفکرات دور ہو چکے تھے۔

میں وہاں سے واپس روانہ ہوا تو میرے دل میں نیا عزم انگڑائیاں لے رہا تھا۔

گھر پر تینوں میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دیرابول پڑی ”کسی سے کچھ کہنے سے بغیر کہاں نکل گئے تھے۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے اب آنکھیں پھرانے لگی تھیں۔“

”گھومتا پھرتا ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ وہاں کی تھوڑی سی تازہ ہوا کھا کر لوٹ آیا مگر راستے میں، میں نے دو ایسی عمارتیں دیکھی ہیں جنہوں نے میرے وجود میں آگ سی بھڑکادی ہے۔“

”کیا اپنے چھوڑے ہوئے گھروں کی طرف جانکے تھے؟“ ویرانے قدرے تجب سے پوچھا۔

”میرے لیے ان کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے۔ آدمی زندگی بھر گھر کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے، اسے بناتا، سنوارتا اور سجاتا ہے، اس پر ناز کرتا ہے مگر دم نکلنے کے بعد اسے جوں کا توں چھوڑ جاتا ہے۔ چھوڑے ہوئے گھر اور اثاثے پر کڑھنا بزدلی اور بے وقوفی ہے۔“

”پھر تم کن عمارتوں کی بات کر رہے ہو؟“ سلطان شاہ نے میری بات کاٹ کر پوچھا ”مجھے تو اس شہر میں ایسی کوئی عمارت نظر نہیں آتی جو کسی کو اتنا متاثر کر سکے۔“

”بہت سی چیزوں کو دیکھنے کے لیے نگاہ اور سمجھنے کے لیے دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اہل دل ہو نہ اہل بصیرت۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔“ ویرانے اسے خاموش کر دیا۔

”مزار قائد اور امریکی قونصل خانہ“ میں نے قدرے

توقف کے بعد تلقی سے کہا۔

”ان دونوں میں آپ نے کیا تعلق دیکھ لیا؟“ غزالہ حیرت سے پوچھتے بغیر نہ رہ سکی۔

”ان دونوں کو دیکھ کر اپنی بے بسی کا احساس گہرا ہونے لگتا ہے۔ ہم کتنے بے بس ہیں کہ اپنے عظیم قائد کا مزار بھی آج تک مکمل نہیں کر سکے۔ اس کے ارد گرد بے ترتیب سبزے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔“

”اور تم جذباتی ہو رہے ہو“ دیرابولی ”کو تو میں تمہاری قوی بے حس کی ایسی دسیوں مثالیں گنوا دوں۔ ان کو تابیوں میں تم امریکیوں کو کیوں قصور وار ٹھہراتے ہو۔ انہوں نے تمہارے ہاتھ پکڑ کر تمہیں کام کرنے سے تو نہیں روکا۔ ان کے قوفصل خانے کا ذکر تم کیوں لے آئے؟“

”وہ ہماری بے بسی کا دوسرا روپ ہے“ میں نے پہلو بدل کر جواب دیا ”ان کے کر قوت ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے کمردہ چروں سے ہم اچھی طرح واقف ہیں مگر ہم کتنے بے بس ہیں کہ کان پکڑ کر انہیں اپنی سرزمین سے نہیں نکال سکتے۔ وہ یہاں دندناتے پھرتے ہیں اور ہمارے قوی خزانے سے تنخواہیں پانے والے دن رات ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ آخر ہم ہر طرف سے اتنے مجبور اور بے بس کیوں ہیں؟“

”اوہ! ویرا کے ہونٹوں سے بے اختیار ایک گہرا سانس خارج ہو گیا۔ ”تم اندر کی بہت سی کمائیوں اور سازشوں سے واقف ہو اس لیے ہر بات کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہو۔ تمہارے جذبات کو سمجھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ یہ سب سسٹم کی خرابی کی بات ہے۔ اول خان بھی اسی سسٹم کے سامنے بے بس ہے، وہ کسی مجرم کی طرح با بار یہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ بھی اس سسٹم کا کل پرزہ ہے۔“

”اس عمارت پر تاریکی اور نحوست کا راج تھا۔ شاید اوپر ان اور رابن مارٹی کے پے درپے اموات نے ان مردودوں کو دہشت زدہ کر دیا ہے اور وہ گوشہ نشین ہو گئے ہیں مگر ہمارے محافظ اس خالی عمارت کی بھی نگہبانی کرنے پر مجبور ہیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں اس نظام کا ایک حصہ نہیں ہوں۔ اس سے باہر کہ اس کی بہتری اور بحالی کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔“

”بلاوجہ اپنا خون نہ جلاؤ“ ویرا نے ہمدردی سے مجھے پککارا ”کھانے سے پہلے منہ ہاتھ دھو کر سمندری ہواؤں کا کھار اتار لو تاکہ ہم کھانا کھا سکیں۔ تمہیں گیارہ بجے اڑپورٹ بھی پہنچنا ہے۔“

”ہائٹ کوچ کی روانگی کا وقت کیا ہے“ میں نے اپنی رست واپس پر نگاہ ڈال کر پوچھا۔

”بارہ بج کر پانچ منٹ۔ اول خان وہیں تمہارا انتظار کرے گا“ ویرا نے کہا۔

ویرا کا مشورہ صائب تھا۔ میں نے سمندر کی تازہ ہوا کا لطف ضرور اٹھایا تھا مگر میں اپنی جلد کے کھلے ہوئے حصوں پر سمندری نمکیات کی چیچپا ہٹ محسوس کر رہا تھا۔ میں ڈرائنگ روم سے اٹھ کر سیدھا غسل خانے میں جا گھسا۔ اسلام آباد کے سفر سے پہلے میرا تازہ دم ہونا ضروری تھا۔

کھانے کی میز پر ویرا کی کوشش رہی کہ خوش گوار موضوعات پر بات ہوئی رہے۔ میں اپنے ساتھ اس کی نظر انداز ہمدردی کو سمجھتے ہوئے بھی اس کی دل جوئی کے لیے انجان بنا رہا۔ وہ اتنی بری ہرگز نہیں تھی جتنی کبھی بھی نظر آنے لگتی تھی۔

ڈنر کے بعد چائے کا دور شروع ہوا تو ویرا نے کارڈز نکال لیے مگر وہ دور زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ مجھے اپنی ضروریات کا مختصر سا سامان ایک بیگ میں سمیٹنا تھا۔

میں نے میز چھوڑی تو غزالہ بھی میرے ساتھ ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور ویرا کو فقرے چست کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ ”یوں کہو کہ بیگ تیار کرنے کے بہانے، تخیلے میں غزالہ کو الوداع کہنے جا رہے ہو۔“

”ہم لیلا مجنوں والے مرحلوں سے بہت آگے نکل چکے ہیں“ میں نے مڑ کر اسے جواب دیا ”چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ آسکتی ہو۔ ہمیں تخیلے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جاؤ، معاف کیا۔ اسلام آباد سے واپسی پر تم سے یہ حساب لیا جائے گا“ ویرا نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”تم بھی کیا یاد کرو گے کہ جس سے پالا پڑا ہے؟“

وہ تئیں ہی مجھے اڑپورٹ چھوڑنے کے لیے بے چین تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں تھے مگر گھر خالی چھوڑ کر ہم چاروں کا رات گئے گھر سے نکلنا مناسب نہیں تھا۔ سلطان شاہ مجھے چھوڑنے جاتا تو عورتیں گھر میں تنہا رہ جاتیں۔ ان میں سے کوئی میرے ساتھ اڑپورٹ جاتی تو رات گئے اسے واپسی کا طویل سفر تنہا طے کرنا پڑتا۔ میں نے سختی سے انہیں روک دیا۔

میں انہیں الوداع کہہ کر اپنے ہلکے ہلکے بیگ کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ سلطان شاہ نے قریبی سڑک سے مجھے ٹیکسی میں سوار کرایا پھر وہ بھی گھر لوٹ گیا۔

اڑپورٹ کے برآمدے میں داخل ہوتے ہوئے میری

رست وایچ پوسے گیارہ بجارہی تھی۔ میں نے قرب و جوار میں نظریں دوڑائیں مگر اول خان کہیں موجود نہیں تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں سکریت سگرا کر ایک طرف ہو گیا۔ اس وقت بین الاقوامی روانگی والے حصے میں زیادہ چل پل نظر آرہی تھی۔

وہ وقت مغرب سے کراچی ہو کر مشرق بعید کی طرف جانے والی پروازوں کے لیے ہی موزوں تھا اس لیے سامان سے لدے پھندے اور مضطرب مسافروں کی بھیڑ میں مقامیوں سے زیادہ زرد رو اور چھٹی ناکوں والے ایشیائیوں کی تعداد شامل تھی۔

وہاں ایسے ایسے چرے اور تماشے نظر آرہے تھے کہ وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔ میں وہاں سے واپس ہوا تو ملکی پروازوں کے ڈیپارچر لائونج سے اول خان برآمد ہوتا ہوا نظر آیا۔ شاید وہ میری غیر موجودگی میں وہاں پہنچ کر سیدھا اندر چلا گیا تھا اور میری تلاش میں دوبارہ باہر آ رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف آیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے، میری طرف جھک کر، سرگوشیانہ لہجے میں بولا ”تم اجتماعوں کی طرح کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو۔ ازپورٹ پر پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ مشتبہ افراد منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ میرے ساتھ سیدھے اندر چلے آؤ۔“

”یہ خبر تمہیں کب اور کیسے ملی؟“ میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”میرے دو آدمی موہنی پنڈت کے تابوت کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ اس وقت بھی وہ ازپورٹ پر موجود ہیں۔ تابوت کی روانگی کے ایک آدھ گھنٹے بعد ہی وہ مشتبہ چرے نظر آئے تھے۔ ان کی ساری توجہ مقامی پروازوں کی روانگی پر مرکوز ہے۔“

”کیا انہیں ہمارے پروگرام کی کوئی سن گن مل گئی ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ امکان ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ میرا خیال ہے کہ ساری گریڈ موہنی کے تابوت کی روانگی سے شروع ہوئی ہے۔ دشمنوں کو بتا چل گیا ہے کہ اس کی لاش یہاں سے اسلام آباد لے جانی گئی ہے اور اب وہ کسی سراغ کی تلاش میں یہاں ہاتھ پیرا رہے ہیں۔“

”وہ زندہ تھی تو راہن مارے کے لیے انتہائی اہم تھی۔ مرنے والی ہے تو ہمارے دشمنوں کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ سرکاری مرده خانے پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔“

”اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟“ اول خان نے بے بسی سے کہا ”وہ ایک بے ضرر سی لاش تھی۔ شاید آئی بی والوں سے اس کی منتقلی میں بے احتیاطی سرزد ہوئی ہے۔“

”جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔ دعا کرنی چاہیے کہ ہم یہاں سے خیریت سے نکل سکیں۔ تمہارے آدمیوں نے یہ خبر بہت دیر سے دی ہے۔ اب اس کا کوئی تذکرہ مشکل نظر آتا ہے۔“

”شاید تھوڑی بہت تاخیر ہوئی ہو مگر زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ انہوں نے الگ الگ ہو کر ان تینوں کو اپنے پیچھے لگالیا ہے۔ اس وقت وہ پانچوں ریسٹوران میں ہوں گے۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ دونوں ریسٹوران سے نکل کر شہر روانہ ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تینوں صبح تک یہیں جھک مارتے رہیں۔“

”یہ سب ہو چکا ہے تو پھر فکر کی کیا بات ہے۔ وہ چاہیں تو ان تینوں کو کسی دیران حصے میں لے جا کر گھیر بھی سکتے ہیں۔ یہ کام ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ہو سکتا ہے۔“

”بد قسمتی سے وہ تینوں مقامی ہیں۔ وہ مقامی نہ ہوتے تو میں کوئی سخت فیصلہ بھی کر سکتا تھا۔ میرے دونوں آدمی ساڑھے گیارہ بجے نکل جائیں گے۔ تین نئے آدمی ان کی جگہ لے لیں گے۔ وہ ان تینوں میں سے کسی ایک کو پکڑ کر اسٹیشن فور لے جانے کا ٹاسک رکھتے ہیں۔ ایک پکڑا گیا تو بقیہ دونوں بھی ہماری درست رس سے دور نہیں ہوں گے۔“

ہمارے ٹکٹ اظہر خان اور مظہر خان کے ناموں سے تھے۔ اول خان نے چیک ان کاؤنٹر پر ٹکٹ دے کر بورڈنگ کارڈ لیے اور ہم سیکورٹی کے مرحلے سے گزر کر آگے بڑھتے چلے گئے۔

پرواز کے لیے بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہم کہیں رک کر وقت پر یاد کیے بغیر طیارے میں سوار ہو گئے۔

”اگر وہ تینوں تمہارے آدمیوں کا تعاقب کر رہے ہیں تو سوچنے کے بعد طیارے میں اپنی زبان کھولی۔“

”مجھے اندازہ ہے کہ ہمارا جہاز اڑ جانے کے بعد بھی ان کے پاس بہت وقت ہوگا۔ ہمیں اسلام آباد ازپورٹ پر کوئی غیر متوقع صورت حال پیش آسکتی ہے۔ میں اسی لیے تم سے ملے بغیر لائونج میں چلا گیا تھا۔ میں نے جلال کو پرواز کا نمبر دینے کے ساتھ نئی چیویشن سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اول خان چاروں کھونٹ چوس کر تھا ”جلال کیا کہتا ہے؟“

”وہ فوری طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے

”میں ابھی آئی“ یہ کہہ کر وہ آگے گئی۔ ہاتھ کے سامان سے گلو خلاصی حاصل کر کے اور اپنے فرائض کسی اور کو سونپ کر لوٹ آئی۔

”آپ دونوں میں سے ایک صاحب میرے ساتھ آجائیں“ اس نے اخلاق سے کہا۔
میں نے اول خان کی طرف دیکھا، اس نے سہلادیا ”تم سرے پر ہو، تم ہی ہو آؤ۔“

میرے اٹھنے سے پہلے ہی ازہو سٹس طیارے کی ناک کی طرف چل دی۔ میں اس کے پیچھے ہوا۔

اکانومی کلاس میں زالیوں اور نشستوں کے درمیان جگہ بناتے ہوئے ہم دونوں اسی ترتیب سے فرسٹ کلاس کے کشادہ کیمین سے گزرے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ طیارہ تقریباً بھرا ہوا تھا۔ فضائی کرائے کی رعایت مسافروں کو اپنی رات سے زیادہ عزیز تھی۔

فرسٹ کلاس کیمین کے اختتام پر اس نے کاک پٹ کا دروازہ کھول کر پکٹان سے کچھ کما اور میرے لیے جگہ خالی کر دی۔ میں آگے بڑھا تو کاک پٹ کا مرغوب کن منظر میرے سامنے تھا۔

کاک پٹ کے اگلے حصے میں فرش سے دیوار تک ہندسوں اور سویوں والے بے شمار ڈائل روشن تھے۔ پکٹان اور اس کا معاون پوری وردیوں میں ملبوس، سروں پر بیڈفون چڑھائے اپنی نشستوں میں موجود تھے۔ وہ کراچی کی کوئی سڑک نہیں، بے کراں وسعتوں میں پھیلی ہوئی ایک فضائی شاہراہ تھی جس پر ایک وقت میں ایک بلندی پر دو طیاروں کا ایک دوسرے کے آس پاس موجود ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

”سرا! امید ہے کہ آپ کا سفر خوش گوار گزر رہا ہوگا“ پکٹان نے سرگھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے اخلاق سے کہا۔
”بہت زیادہ خوش گوار سفر ہے۔ سارا حسن کاک پٹ میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اس سے آگے تو گھور اندھیرا ہے“ میں نے اسی لمحے میں جواب دیا۔

”کراچی کنٹرول ٹاور سے آپ کے لیے پیغام ہے۔ اسلام آباد ازہو پورٹ پر آپ دن دے پر رکیں گے۔ وہاں سے ایک پروٹوکول کار آپ دونوں کو باہر لے جائے گی“ اس نے آگاہ کیا۔

”شکریہ!“ اس سے کچھ پوچھتے بغیر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پیغام جلال کا ہو سکتا تھا۔

”زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں یہ پیغام بیجنگ سسٹم پر نشر نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی

یہ جان کر اطمینان ہوا تھا کہ ہم کسی کی نظروں میں نہیں آئے۔ ہمیں لینے کے لیے وہ خود اسلام آباد ازہو پورٹ پہنچے گا۔“

بورڈنگ مکمل ہونے کے بعد مقررہ وقت پر جہاز کے دروازے وغیرہ بند ہوئے اور ضروری کارروائیوں کے بعد طیارہ حرکت میں آگیا۔

”مجھے یہ سوچ کر مایوسی ہوتی ہے کہ دشمنوں کو ہمارے ملک میں ہر سطح پر زر خرید مل جاتے ہیں“ جہاز فضا میں بلند ہونے کے بعد میں نے اول خان سے کہا۔

”پیسوں کے لیے ہر ملک میں لوگ بک جاتے ہیں“ اول خان نے میری تشویش کو زیادہ اہمیت نہیں دی ”ان کو یہ علم نہیں ہوا کہ وہ کس کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ کراچی ازہو پورٹ پر نظر آنے والے تینوں افراد کا یہی کیس ہوگا۔“

”پہلے پنڈت منوہر لال کے تین تنخواہ دار آئی بی والوں نے پکڑے اب یہ تین نئے چہرے سامنے آگئے۔ پتا نہیں اسلام آباد میں انہوں نے کتنے آدمی خریدے ہوئے ہیں۔“

”زیادہ مت سوچو۔ سوچ سوچ کر تھک جاؤ گے“ اس نے مجھے سمجھایا ”میں نے تمہارے نکل جانے کے بعد تمہارے گھروں کیا تھا تو دہرا نے مجھے بتایا کہ قائد اعظم کے مزار اور امریکی قونصل خانے کو دیکھ کر تم جذباتی ایال میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ اچھی علامتیں نہیں ہیں۔“

”تم جانتے ہو کہ سوچنا میری عادت ہے۔ جب تک کوئی نئی بات سامنے نہیں آتی، میرے ذہن میں یہی سب گند پھیل چائے رکھے گا۔“

”اسے بھول کر پنڈت کے بارے میں سوچو۔ ہو سکتا ہے کہ جلال ہمیں ازہو پورٹ سے سیدھا اسی کے پاس لے جائے۔ وہ بلاوجہ ازہو پورٹ پر نہیں آئے گا۔“

دوران پرواز فضائی میزبان مسافروں کو ہلکا ناشتا فراہم کر رہے تھے کہ طیارے کے بیجنگ سسٹم پر پکٹان کی آواز ابھری ”ظہر خان یا مظہر خان نامی مسافروں سے التماس ہے کہ وہ فوری طور پر کیمین کریوسے رجوع کریں شکریہ۔“

پکٹان نے اردو میں یہ وہ پیغام ایک بار پھر دہرایا۔ ازہو سٹس جوں ہی ٹرے لے کر ہمارے قریب سے گزری، میں نے اسے اشارے سے روک لیا۔

وہ مسکراتے ہوئے رکی مگر اس کے انداز سے جلالت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے کہا ”میرا نام مظہر خان ہے اور یہ اظہر خان ہیں۔“

کہ پیغام ذاتی طور پر آپ دونوں میں سے کسی تک پہنچا دوں۔

شاید وہ گفتگو طیارے کے بلیک بکس کے ریکارڈ کا حصہ بن رہی تھی اس لیے کپتان نے ان نقروں کی ادائیگی ضروری سمجھی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

مجھے وہاں تک پہنچانے والی اڑہوئس پتا نہیں کب واپس جا چکی تھی۔

”کراچی کنٹرول ٹاور کے ذریعے جلال کا پیغام تھا“ اپنی نشست پر واپس پہنچ کر میں نے اول خان کو بتایا ”وہ ہمیں رن وے سے ہی باہر لے جائے گا۔“

اول خان خوش ہو گیا ”مجھے توقع نہیں تھی کہ ہمیں جہاز پر پیغام مل سکے گا۔“

کراچی سے اسلام آباد تک کی مسافت باتوں ہی باتوں میں طے ہو گئی۔ پونے دو بجے لینڈنگ کے بعد ہم مسافروں کی کھیپ کے ساتھ رن وے پر موجود تھے۔

مسافر بی آئی اے کی بسوں کی طرف جا رہے تھے۔ جلال نے شاید ہمیں جہاز کی سیڑھیوں پر ہی دیکھ لیا تھا۔ اس نے معافتہ کر کے ہم دونوں کا استقبال کیا اور ہمیں ساتھ لے کر ایک لمبی سی سیاہ کار کی طرف بڑھ گیا جو رن وے پر سفید کیکر سے لگی کھڑی تھی۔ گاڑی پر سبز سرکاری نمبر پلیٹ آویزاں تھی۔ گاڑی کے دونوں پہلوؤں پر دو سادہ پوش گن مین کھڑے ہوئے تھے۔

ہمارے قریب پہنچنے پر ان دونوں نے اپنے ہاتھ پیشانیوں تک لے جا کر سلام کیا، ہمارے ہاتھوں سے مختصر سامان لیا اور ہمارے لیے دونوں عقبی دروازے کھول دیے۔ اول خان گھوم کر دوسرے دروازے سے بیٹھ گیا۔ مجھے جلال کو جگہ دینے کے لیے درمیان میں کھسکنا پڑ گیا۔ محافظوں نے پچھلے دروازے بند کر کے اگلی نشستیں سنبھالیں اور ہمارا قافلہ روانہ ہو گیا۔ آئی بی کی گاڑی رن وے کی نشان زدہ حد کے متوازی ٹرمل سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

پاکستان میں ہمیشہ آئی بی کا ایک پراسرار سادہ رہا ہے۔ بعض سیاست داں اور بڑے افسر اس کے معمولی کارندوں سے خوف زدہ پائے گئے ہیں۔ اس روز اڑپورٹ پر کہیں بھی گاڑی کو روکا گیا، نہ اس کی پیکنگ کی گئی۔ رن وے کا ایک سروس گیٹ کھلا اور گاڑی زن سے باہر نکل گئی۔

”کراچی میں دیکھے جانے والے مشتبہ آدمیوں کا کیا بنا؟“ ریکی مزاج پرسی اور معذرت کے بعد جلال نے خود ہی اصل

موضوع چھیڑ دیا۔

”میرے آدمی ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میری پرواز کے دوران میں کیا ہوا، مجھے معلوم نہیں۔ کراچی فون کروں گا تو رپورٹ مل جائے گی۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی پکڑا گیا ہوگا“ اول خان نے جواب دیا۔

”یہاں کی سناؤ اسلام آباد میں کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”میرے آدمی مگرانی کر رہے ہیں۔ ابھی تک اڑپورٹ پر کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا“ جلال نے بتایا ”اسلام آباد ویسے بھی وی وی آئی پی اڑپورٹ ہے۔ یہاں ہمارا سیل چوبیس گھنٹے کام کرتا ہے۔“

”تمہارے قیدی کا کیا حال ہے؟ کچھ بولتا ہے یا ابھی تک اڑا ہوا ہے؟“

”تمہارا اندازہ سو فیصد درست نکلا“ اس نے بلا جھجک کہا ”وہ مہربانی کی لاش سے لپٹ کر کسی یتیم بچے کی طرح ایسی دل دوز آوازوں میں پھوٹ پھوٹ کر رویا ہے کہ سب ہل کر رہ گئے۔ شام ڈھلے اس نے اپنی بیٹی کی چتا کو آگ دکھائی تھی۔ اس کے بعد سے وہ پر سکون مگر مگرم صم ہے۔“

”اس سے چھیڑ چھاڑ تو کی گئی ہوگی“ میں نے اسے کیریدنے کی کوشش کی۔

”واجبی سی“ اس کا جواب ذومعنی تھا ”تم لوگ آہی رہے تھے۔ ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وقفہ مل جانے کے بعد وہ شاید آسانی سے راہ پر آجائے گا۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کی واجبی سی کوششوں کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔

”اس وقت ہم اسی سے ملنے جا رہے ہیں“ تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے بتایا ”اسے ایک سرکاری ریٹ ہاؤس میں رکھا گیا ہے۔“

اڑپورٹ سے شاہراہ پر آنے کے بعد گاڑی تیزی سے شرکی طرف دوڑتی رہی مگر زید پوائنٹ پر جلتے بجھتے ہوئے سنگٹل سے اس کا رخ بائیں طرف ہو گیا۔ وہ راستہ اسلام آباد کوچی ٹی روڈ سے ملتا تھا۔

سڑک پر ہمارا سفر زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ایک نیم پختہ ذیلی سڑک پر اتر گئی جو سبزے اور درختوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی اندھیرے میں کہیں گم ہو رہی تھی۔ آخر کار وہ پُرتچ سڑک ایک قدیم طرز کے ریٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

”اسے اس کے انجام تک پہنچانا چاہتے ہو تو تمہیں ایک مرتبہ پھر سب کچھ بتانا ہو گا۔“

”نہیں، نہیں!“ اس نے میری بات کاٹ دی ”اب مجھ سے کچھ مت پوچھو۔ اسے میرے سامنے لے آؤ۔ میں اپنے دانتوں سے اس کا زخرا چاؤں گا۔“

”وہ مر گیا ہو تا تو اور بات تھی۔ اب وہ قانون کی تحویل میں ہے۔ اسے تمہارے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ تم ہماری مدد کرو۔ ہم بھائی گھاٹ پر اس کی گردن توڑ کر ایک فٹ لمبی کر دیں گے۔“

راہن مار کے خلاف وہ کراہت آمیز الفاظ پنڈت کے لیے آسودگی کا سبب بن گئے۔ اس نے مٹھیاں اور آنکھیں بھیجنے کر ایک جھرجھری سی لی پھر آنکھیں کھول کر بولا ”تم نے مجھے موہنی کی چتا جلانے کا موقع دیا۔ تم قول کے پکے ہو۔ تم ضرور اس کی گردن توڑ دو گے۔ پوچھو، کیا پوچھتے ہو۔“

جلال میرے قریب سرک آیا اور خیر ذرہ سرگوشیانہ آواز میں بولا ”کو تو میں سب کو بلالوں۔ ایسا نہ ہو کہ اس پر دوبارہ خاموشی کا دورہ پڑ جائے۔“

”ایسا نہیں ہو گا“ میں نے اسے یقین دلایا ”ذہنی جھکا کھا کر یہ صدمے سے نکل گیا ہے۔ اب بولتا رہے گا۔ اس وقت مجھے اس سے دو چار باتیں کر لینے دو۔“

”میں ایک مرتبہ پھر تمہاری یقین دہانی پر بھروسہ کر رہا ہوں“ اس نے بے بسی سے کہا۔

راہن مار کی بربادی اور سزا یابی کا تصور اس وقت پنڈت منو ہر لال کے لیے سب سے زیادہ مرغوب تھا۔ اصل سوالوں کی طرف آنے سے پہلے میں نے چند ثانیوں تک اسی موضوع کو جاری رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا ”راہن مار جیسے موذی شخص سے تمہاری دوستی کیسے ہوئی؟“

”رستم۔ رستم۔ رستم!“ اس نے تکرار کی ”اس نے اپنے گھر پر مجھے راہن سے ملوایا تھا۔ رستم ایران کا دشمن تھا کیونکہ وہاں بہائیوں کو قتل اور برباد کیا گیا تھا۔ پاکستان کا دشمن تھا کیونکہ اس کے نام پر لاکھوں ہندو بے گھر اور تاراج ہوئے تھے۔ میں نے راہن سے دوستی کر لی۔“

وہ ایک نیا سراغ تھا۔ رستم کراچی میں بیٹھ کر ایران کے خلاف اپنا عناد نکال رہا تھا۔ اس کے فون نمبروں سے ایران میں کیے جانے والے رابطے یقیناً مذموم مقاصد کے لیے تھے۔ اس کی اصل دشمنی ایران سے تھی۔ اس نے صیہونیوں کی مدد کے لیے وہاں بڑا منیہ ورک قائم کیا ہوا تھا۔ کراچی میں وہ کربا پاکستان کے خلاف براہ راست کام کرنا اس کی اپنی سلامتی

کے لیے خطرناک تھا جبکہ راہن کا ہدف پاکستان بھی تھا۔ رستم نے نہایت مکاری سے کام لیتے ہوئے راہن مار اور پنڈت منو ہر لال کو ملوایا۔

”ایران اور پاکستان کے خلاف کام کرنے کے عوض تمہیں راہن سے کیا ملتا تھا؟“

”وہ ملعون یہودی کسی کو کیا دے سکتا تھا۔ بس چند سہولتیں تھیں“ پنڈت نے رک رک کر کہا ”سارا خرچ ہم دونوں اٹھاتے تھے“ اپنے اپنے انتقام کے لیے۔

”کسی ملک سے انتقام لینے کے لیے دو تین آدمی کافی نہیں ہوتے۔“ میں نے رسائیت سے کہا ”تین تنخواہ داروں کے علاوہ اور کون کون تمہارا ساتھ دیتا تھا؟“

وہ ہڈیانی انداز میں ہنسا ”میں کس کس کا نام لوں؟ سب میرے دوست ہیں۔ کوئی میری دوستی میں اور کوئی اس ملک کی دشمنی میں، جانے یا ان جانے“ میری مدد کرتا رہتا تھا۔

”کیا ان میں اورائن ڈی ہنٹ بھی شامل تھا؟“ میں نے محتاط طبع سے پوچھا۔

”وہ خود کو نئے ایشیا کا افلاطون کہتا تھا۔ اونچے حلقوں میں بیٹھ کر دوسروں کی کامیابیوں کو اپنے سر منڈھ لیتا اس کی قابل نفرت عادت تھی۔ وہ مجھے اور رستم کو بھی اپنا تابع بنانا چاہتا تھا۔ رستم کسی سے دینے یا ڈرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ اورائن سے نفرت کرتا تھا۔“

”تمہیں اور برائن کے انجام کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور کہا ”اچھے لوگوں کو سب بھول جاتے ہیں مگر بروں پر ہر ایک نظر رکھتا ہے۔ وہ نئی دلی کے کسی حادثے میں کتے کی طرح مارا گیا تھا۔“

”تمہیں رستم کے اصل کاروبار کا بھی علم ہو گا۔ ایسا تو نہیں کہ رستم ہی نے اسے مروا دیا ہو؟“

”مجھے پتا نہیں مگر میں دو باتیں ضرور جانتا ہوں۔“

پنڈت اپنی بگڑی ہوئی حالت پر تیزی سے قابو پارہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”وہ اونٹ کی طرح پکا کینہ پرور تھا اور اورائن کی موت پر اس نے کھل کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ وہ کچھ جی کر سکتا تھا۔“

رستم اور پنڈت نفرتوں کے سوداگر تھے۔ وہ بھاری مالی خسارہ اٹھانے کے باوجود دو مملکتوں کے خلاف اپنا بعض نکال رہے تھے۔ راہن مار مفت میں ان سے فیض حاصل کر رہا تھا۔ اس پورے کھیل میں میرے لیے سب سے بڑی

”پابندی وقت“

دفتر کے کام سے طارق بذریعہ جہاز کراچی سے لاہور جانے کے لیے گرتے پڑتے ذرا تاخیر سے ایئرپورٹ پہنچے تو فلائٹ روانہ ہو رہی تھی۔ سرنگ نما راستے کا گلیٹ بند ہو رہا تھا۔ طارق کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون سے لڑنے لگے کہ انہیں بورڈنگ کارڈ دیا جائے اور جہاز روک لیا جائے۔

”فلائٹ کا ٹائم تین بج کر دس منٹ ہے اور میری گھڑی میں ابھی تین بج کر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔“ انہوں نے خاتون کو اپنی گھڑی دکھائی۔

ایئر لائن کی ملازم خاتون نہایت تھل اور شائستگی سے بولیں ”وہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن آپ چونکہ یہاں موجود نہیں تھے اس لیے مجبوراً ہمیں اپنی ہی گھڑی دیکھ کر فلائٹ کو روانہ کرنا پڑا۔“

○☆○

”تم رستم کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“ پنڈت جھٹا کر بولا ”سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود مجھ سے اسی کے بارے میں پوچھتے جارہے ہو۔ وہ مر گیا۔ اس کا قصہ اس کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مجھ سے رابن کی بات کرو۔ آستین کے اس موڑی سانپ کی جو ابھی تک زندہ ہے۔“

”جب تم رستم کو جواب دہ تھے تو رابن کو براہ راست فون کیوں کرتے تھے؟“

”وہ فون اور فیکس ذاتی کاموں کے لیے ہوتے تھے۔ میں نے تم کو بتایا کہ ہمیں اس سے صرف کچھ مراعات ملی ہوئی تھیں۔ اس کے ذریعے ہم کسی کو بھی امریکا کا کوئی ویزا دلوا سکتے تھے۔ وہاں کے تعلیمی اداروں میں داخلے آسانی سے مل جاتے تھے۔ ان احسانوں کے بدلے، میں اس کے لیے معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ مجھے اتنی بے رحمی سے استعمال کرنے کے بعد وہ یوں میرا سینہ پھٹتی کر دے گا۔“

البحسن یہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ جب رستم اور ابراہن کے مشن یکساں تھے تو رستم نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے، دس لاکھ روپے کے عوض اسے ٹھکانے کیوں لگا دیا تھا۔

پنڈت منوہر لال کی قوت گوہائی بحال ہوتے ہی مجھے اس سوال کا مسکت جواب مل گیا تھا۔ اسے ابراہن سے نفرت ضرور تھی۔ مگر وہ اس کے قتل کے بارے میں نہیں سوچ سکا تھا۔ ملک ممتاز نے اس کام کے لیے اسے اعتماد میں لیا تو اس نے اس سودے کو آم کے آم، گھنٹیوں کے دام سمجھ کر بے چون و چرا قبول کر لیا۔

قتل نئی دہلی میں ہوا اس لیے رستم کی ذات ہر شک و شبہ سے بالا رہی، اس کو ایک دشمن سے نجات مل گئی اور اس کام کے دس لاکھ روپے بھی ڈالروں کی صورت میں مل گئے۔

رستم کو اس سودے میں نفع ہی نفع نظر آیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملک ممتاز سے دس لاکھ لے کر وہ اس سے اپنی جان کا سودا کر رہا تھا۔

پنڈت سے جو نئی باتیں معلوم ہوئی تھیں وہ اپنے نواسے کے بارے میں رستم کی گہری فکر مندی کے اسباب بھی مہیا کرتی تھیں۔ رستم ایرانی نژاد تھا۔ وہ خود وہاں سے بھاگ آیا تھا لیکن اس کی موت کے بعد پاکستان میں حالات موافق نہ ہوتے تو اس کے خاندان کے باقی ماندہ افراد ایران کی طرف کوچ کر سکتے تھے۔

بے یار و مددگار عورتوں کو شاید ایران میں پناہ مل جاتی لیکن رستم کے اکلوتے وارث کے لیے وہاں کوئی جگہ نہ ہوتی۔ رستم کے دل میں چور تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بسیرا پر آپریشن کے بعد رفتہ رفتہ ساری حقیقتوں پر سے پردہ اٹھتا چلا جائے گا۔ دنیا کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایران کے خلاف تعصب پرست یسودی مفادات کی پاسبانی کرتا رہا تھا۔ اس کے نواسے کو وہاں جگہ مل بھی جاتی تو وہ ذلت، رسوائی اور غدار کی الزامات سے ہمیشہ سرنگوں رہتا۔ کبھی جاہ و خشم کی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔

کیونہ پرور رستم حساب کتاب اور جوڑو توڑ میں بہت طاق تھا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اس نے جو فیصلہ کیا، وہ شاید اس کی زندگی کا بہترین فیصلہ تھا۔

”رستم براہ راست ایران کے معاملات دیکھتا تھا۔ تم پاکستان کے گھراں تھے مگر تم رستم ہی کو جواب دہ تھے۔ وہ تمہاری اطلاعات اور رپورٹیں رابن مارٹر کے ذریعے مل ایب پھنچاتا تھا“ میں نے پوچھا۔

”روپوش ہونے کے بعد بھی تم نے اس سے بات نہیں کی؟“ میرے پاس رابن مار کے بارے میں سوالات کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ سلسلہ معلومات افزا تھا۔

”رستم کے گھر سے میں نے دوبار اس سے بات کی۔ وہ مجھے تسلیاں دیتا رہا کہ کوئی نقصان ہونے سے پہلے وہ مجھے اور موہنی کو پاکستان سے نکال لے جائے گا۔“

”تم نے پاکستان کے دفاعی راز بھی رابن مار کو فراہم کیے تھے؟“

اس نے دونوں ہاتھوں سے بے ساختہ اپنے کان پکڑ لیے ”بس اسی بات پر وہ ناراض رہتا تھا۔ میں ایسے معاملوں میں ہاتھ ڈالنے والوں کی کئی لرزہ خیز کہانیاں سن چکا تھا۔ میں نے ادھر کارخ نہیں کیا تھا۔ وقت مل جاتا تو شاید میں اس کے باؤ سے مجبور ہو کر ادھر بھی چل پڑتا۔ ابھی تک میرے ہاتھ صاف ہیں۔“

”مجھے ان لوگوں کے نام درکار ہیں جو بڑے سرکاری عہدوں پر ہیں اور دیرینوں یا داخلوں کے لیے تمہارے احسان مند ہیں۔ تم نے کچھ نہ بتایا تو ہمیں رستم کے گھر سے ریکارڈ مل جائے گا۔“

”رستم کے گھر سے بے اندازہ دولت کے سوا تم کو کوئی غیر قانونی چیز نہیں ملے گی۔ وہ ہر کاغذ جلا کر تلف کر رہا تھا۔ سارے کام اور حساب اس کی یادداشت میں محفوظ رہتے تھے۔“

”رستم کے قصیدے مت سناؤ۔ رابن کو پھانسی کے پھندے پر لٹکانے کے لیے مجھے چند اہم ناموں کی ضرورت ہے۔ ایسے نام جن کے لیے رابن نے کبھی کوئی سفارش کی ہو۔ کل تک یہ نام مل جائے چاہئیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں یاد کرنے کی کوشش کروں گا“ اس نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔

میں واپس کے لیے پلٹ گیا۔ میرے ساتھ وہ دونوں بھی دروازے کی طرف ہو لیے۔

بیٹھک نما کمرے میں پہنچتے ہی جلال جذبات سے مغلوب ہو کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا ”تم نے بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔ تمہارا چلایا ہوا تیرا صبح نشانے پر لگا ہے۔“

”اس سے آج نئی باتیں ہوئی ہیں۔ کاش کل اسے یہ سب اسی طرح یاد آ سکے!“ اول خان نے حسرت سے کہا۔

”اس نے از خود کچھ نہیں بتایا“ جلال نے کہا ”سب ڈینی کے سوالوں کے جواب تھے۔“

”ایسے ہندی بھرموں سے کچھ اگلوانے کے لیے خاص

ڈھب کے سوالات ضروری ہوتے ہیں۔ ڈینی نے آج یہ کام بہت خوبی سے انجام دیا ہے“ اول خان نے اقرار کیا۔

”مجھے اندازہ تھا کہ ریشٹ ہاؤس میں کسی وقت بھی کوئی کامیابی ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرے بڑے یہاں نہیں تھے لیکن غفلت کو کا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو چکا ہے۔ کل ہمیں یہ سوال دہرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”کل نہیں، آج کو۔ اس وقت صبح کے تین بج رہے ہیں“ میں نے انہیں توجہ دلائی اور دونوں ہی ہنس پڑے۔

”تمہیں ایک دم ہی رابن مار کے مردے کو زندہ کرنے کا خیال کیسے آ گیا؟“ گاڑی میں واپسی کا سفر شروع ہونے کے بعد جلال کو وہ سوال یاد آ گیا۔ اس کی آواز تعجب آمیز تھی۔

”کراچی میں بیٹھ کر میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا“ میں نے کہا ”یہ میرے مشاہدے کا نتیجہ تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ شدید صدماتی کیفیت کا شکار ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی لاش دیکھ چکا تھا۔ اسے رابن کے قتل کے بارے میں بھی معلوم تھا مگر لاش اس کی نظروں سے نہیں گزری تھی۔ اسے جھنجھوڑنے کی ایک ہی تریب ہو سکتی تھی کہ اسے بیٹی کے خون کے انتقام کی ضرورت کا احساس دلایا جائے“ یہ حربہ کام کر گیا۔

”میں آخر تک اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ تم اسے کون سی بُری خبر سنانے والے ہو“ جلال بولا ”اس کے بے ساختہ ردِ عمل پر میں پل بھر کے لیے ہل کر رہ گیا تھا۔“

”تم نے یہ بھی نوٹ کیا ہو گا کہ اس کے ہاتھوں موہنی کی آخری رسوم کی ادائیگی اس کے ذہن پر نقش تھی۔ اسے قابو میں رکھنے کے لیے یہ اقدام ناگزیر تھا۔“ اول خان نے کہا۔

”رحمان اس مشق سے متفق نہیں تھا“ جلال نے اپنے ساتھی کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ”مگر میں بند گلی میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کی افادیت کا یقین نہ ہونے کے باوجود میں نے محض اس لیے لاش کی فوری منتقلی کا فیصلہ کر لیا کہ یہ تم دونوں کا مشترکہ مشورہ تھا۔“

”بعض اوقات بہت چھوٹی چھوٹی باتیں دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہیں“ میں نے کہا۔

”پنڈت سے بات کرتے ہوئے تم نے اس کی تازہ ترین فون کالز کا ذکر بھی چھیڑا تھا۔ کیا تم نے مجھے سے اس بارے میں کچھ کوائف حاصل کر لیے ہیں؟“ جلال نے جاننا چاہا۔

”پنڈت اور رستم کی تین ماہ کی بلنگ کی عملی تفصیل موجود ہے“ میں نے اسے سچہ کیا ”کراچی سے واشنگٹن ڈی سی کا ڈائریکٹ کوڈ ذیل زبردون ٹویڈو ٹو ہے۔ دونوں کے بلوں

میں اس کوڈ کے ساتھ دو نمبر موجود ہیں۔ یقینی طور پر وہ راہن
مار کے ہی نمبر ہو سکتے ہیں۔“
”اور رستم کے نمبروں سے ایران کے لیے متعدد کالز کی

جاتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کا دورانیہ دس پندرہ منٹ
سے بھی زیادہ ہے۔“ اول خان نے میرے خاموش ہوتے ہی
لقمہ دیا۔

”وہ تفصیلات تم اپنے ساتھ لائے ہو؟“ اس نے تجسس
سے پوچھا۔

”کیوں؟“ میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے
چمچتا ہوا سوال کیا ”کیا تمہیں وہ ریکارڈ نہیں مل سکا؟“

”کل ہی تو بات ہوئی تھی۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی
خفت تھی ”بی آئی اے سے آنے والی ڈاک ارجنٹ ہونے
کے باوجود کبھی کبھی دیر سے ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کراچی

سے پیکٹ روانہ کر دیا گیا ہو اور وہ راستے میں ہو۔ وہ نقلیں مل
سکیں تو آج کئی مرحلے سر ہو جائیں گے۔“

”بلوں کا لٹافہ میرے بریف کیس میں موجود ہے“ اول
خان نے اسے دلا سا دیا ”اُترتے ہوئے میں وہ تمہیں دے

دوں گا۔“
”آج بہت سے چشم کشا حقائق سامنے آئے ہیں جو ٹیپ

کر لیے گئے ہیں۔ وہ بل ان کی تصدیق کریں گے۔ میں چاہتا
ہوں کہ ہمارے اوپر آیا ہوا سفارتی دباؤ جلد از جلد ختم

ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اتنا مواد سامنے آجانے کے بعد
ہمارے ڈی جی امریکیوں سے ملاقات کا فیصلہ کر لیں۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارے ڈائریکٹر جنرل سمیت کوئی
بھی حکومتی عہدے دار براہ راست غیر ملکی سفارتی افسروں

سے نہیں مل سکتا۔ کیا یہ بندوبست آج ہی ہو جائے گا؟“ میں
نے پوچھا۔

”ایسے معاملات میں دفتر خارجہ رابطے کا کام کرتا ہے۔
یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ وہ لوگ کسی تاخیر کے بغیر میٹنگ

طے کر لیں گے۔ امریکی بھی ہمارا منوقف جاننے کے لیے سخت
مضطرب ہیں۔“

”ان کا اضطراب قابل فہم ہے۔ راہن مار کی موت نے
انہیں بہت نازک امتحان میں ڈال دیا ہے۔ ظاہری شوہد اس

کے خلاف ہیں۔ وہ جانتا چاہیں گے کہ ہمارے پاس اور کیا
مواد ہے۔“

”پنڈت نے اپنی خاموشی ختم کر دی ہے۔ اگر بیان کا
دوسرا حصہ سننے سے پہلے اسے کسی بہتر مقام پر منتقل کر دیا

جائے تو وہ بالکل ہی رام ہو سکتا ہے۔“ چند ثانیوں کے توقف

کے بعد اول خان نے زبان کھولی ”جب تک اس کے بارے
میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کر لیا جاتا، وہ ہمارے کام آتا رہے

گا۔“
”یہ اندازہ ہو گیا ہے“ جلال نے سر ہلا کر اس کی تائید کی

”تمہیں بلانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ پرانی باتیں دہرانے
پر آمادہ ہو جائے مگر اس نے نئے عقدے کھولنے شروع

کر دیے۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں اب بھی کیا کیا محفوظ
ہو گا۔“

”وہ کھل کر پاکستان سے اپنی نفرت کا اظہار کر چکا ہے۔“
میں نے کہا ”اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ کسی اجرت کے بغیر

راہن مار کے لیے کام کر رہا تھا۔ ایسے خدا کا صرف ایک ہی
انجام ممکن ہے۔ اس کا کام پورا ہونے کے بعد اسے

جلد از جلد کیفر کر دیا کو پہنچ جانا چاہیے۔“
وہ صبح تر کے کا وقت تھا اور پورا اسلام آباد سویا ہوا

تھا۔ سیاہ کار دو روہی شاہراہ کشمیر پر تیزی سے دوڑتی رہی۔
اس سڑک پر دور دور تک کسی گاڑی یا شخص کا نام و نشان

نہیں تھا۔
ویسے پنڈی اور اسلام آباد کو ایک دوسرے کا جزواں

شہر کہا جاتا ہے مگر مزاج میں دونوں شہر ایک دوسرے سے یکسر
مختلف ہیں۔ پنڈی پر عسکری طرز معاشرت کا غلبہ ہے اس

لیے وہاں کے باسی تحریر ہیں۔ موسم کے سرد گرم کی پروا کیے
بغیر منہ اندھیرے روز کی تلاش میں ننگے کی تیا ریاں شروع

کر دیتے ہیں جب کہ اسلام آباد میں زندگی کی چمپل پیل ذرا
دیر سے ہوتی ہے۔

شاہراہ کشمیر سے ہماری گاڑی میونسپل روڈ پر مڑ گئی۔
مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ پوری رات کالی کرنے کے بعد جلال

ہم دونوں کو کہاں پھونٹے والا تھا۔
میونسپل روڈ کچھ دور سیدھی چل کر خود بہ خود داہنی

طرف مڑ جاتی ہے۔ وہاں ہم مندا سی روشنیوں میں لیٹے
ہوئے ویران جہزلیوسٹ آفس کے سامنے سے گزرتے

ہوئے مارکیٹ روڈ پر نکل آئے۔ تیز روشنی میں نہائی ہوئی وہ
خالی سڑکیں خواب ناگ منظر پیش کر رہی تھیں۔

مارکیٹ روڈ شایمار مرکز کے سامنے سہ راہے کی
صورت میں آغا خان روڈ پر ختم ہو گئی۔ وہاں سے ہماری گاڑی

داہنی طرف گھومی تو میں دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لے
کر رہ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق آغا خان روڈ پر واقع ہالڈے
ران پر ہمارے سفر کا خاتمہ ہو گیا۔ دنیا کے ہر بڑے ہوٹل کی